# گناہ آلود سانس

عصمت فروشی، جنسی امراض، نوجوانوں کی جنسی بے راہ روی
آزادانہ عشق و محبت اور شراب نوشی کے متعلق بے لاگ اور
خیال افروز حقائق

ڈائی سن کارٹر

# گناہ اور سائنس

ڈائی سن کارٹر

# گناہ اور سائنس

پیپلز پبلشنگ ہاؤس - لاہور

قیمت ۱۸ روپے
مطبع:- الفرید پرنٹرز۔ لاہور
پبلشر:- عبدالرؤف ملک

# فہرست


| | |
|---|---|
| تعارف | ۷ |
| آغاز بلامعذرت | ۱۲ |
| وکٹری گرل | ۱۶ |
| بدکاری کا پاسپورٹ سسٹم | ۳۲ |
| آزاد محبت | ۴۶ |
| سرمایہ داری نے محبت کو قابل احترام بنایا | ۵۸ |
| سوال نامہ | ۸۶ |
| عصمت کی تجارت کا خاتمہ | ۱۰۸ |
| عیسائیت اور ڈاکٹر | ۱۲۶ |

مہینے میں پانچ کروڑ مرتبہ ۱۴۲
گناہ کے خاتمے کا پانچ سالہ منصوبہ ۱۶۰
قتل ــــــــــــ صیغۂ راز ۱۷۸
شراب کی ممانعت سنگینوں کے بل پر ۲۱۶
دنیا بھر میں سستی شراب ۲۳۳
بچوں کے تحفظ کی عدالتیں ۲۵۲
دعوتِ فکر ۲۸۵
مصنّف ۳۰۲

# تعارف

جو شخص کسی جدید شہر کے ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ جرم، گناہ اور سائنس کے معنی کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ دنیا میں اکثر لوگ یا کم از کم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی اکثریت گناہ کی تعریف اپنے اپنے مذہب کے مطابق کرتی ہے۔ مسلمان کے لئے شراب پینا گناہ ہے اور ہندو کے لئے گائے کا گوشت کھانا۔ لیکن عیسائی شراب بھی پیتا ہے اور گائے کا گوشت بھی کھاتا ہے اور جھرجھری تک نہیں لیتا چونکہ گناہ کا یہ رنگا رنگ تصوّر سماج کو کسی منزل پر نہیں لا سکتا۔ اس لئے بعض افعال کو روکنے کے لئے قانون کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان افعال پر جرائم کا لیبل لگایا جاتا ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو پولیس اور عدالت سے سزا دلائی جاتی ہے۔ عدالت سے سزا دلانے کے لئے جرم کا ثبوت اور ملزم کو مروّجہ قانون کے مطابق مجرم قرار دینا لازمی ہے۔ لیکن گناہ کا ثبوت اور اسکی سزا کا تعیّن اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا گناہ کی سزا اگلے جہان یا اگلے جنم پر موقوف کر دی جاتی ہے۔ سائنس مذہبی اور عدلی قوانین سے آزاد ہے۔ اور سائنس میں محتاط تجربات یا مشاہدات کی

منطقی اور مادی تشریح کے بعد نتیجے نکالے جاتے ہیں مثلاً جو شخص زہر کی ایک خاص مقدار نگل جائے ... وہ یقیناً مر جائے گا۔ خواہ اس کا یہ فعل خلاف قانون ہو یا نہ ہو۔ ہم کسی بیماری کے جراثیم کو ایک خاص تعداد تک اپنے جسم میں پرورش پانے دیں تو ایک خاص مدت کے بعد ہمیں وہی بیماری ضرور لگ جائے گی خواہ خدا کی ایسی مرضی ہو یا نہ ہو۔

اگر یہ تینوں نظریئے ایک ہی طرف اشارہ کریں اگر گناہ کرنے سے بیماری لگنے کا امکان ہو اور ایسے فعل کا ارتکاب جرم بھی ہو تو سماج ایسی برائی کی جڑ کاٹنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے مرد و عورت کے باہمی تعلقات سے متعلق قوانین اور مخصوص جنسی تعلقات سے پیدا ہونے والے مسائل مثلاً طلاق، جنسی بیماریوں اور عصمت فروشی سے متعلق قوانین ہمارے دعوے کا واضح ثبوت ہیں اسی طرح شراب نوشی کے فرد خاندان اور بحیثیت مجموعی سماج پر برے اثرات کے پیش نظر جو مشین کے زمانے میں حادثات کی کثرت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کی ممانعت سے متعلق قوانین ہمارے دعوے کا ایک اور ثبوت ہے۔

ڈائی سن کارٹر نے ان طریقوں کو نہایت خوبصورتی اور غیر جانبداری سے بیان کیا ہے جو عہد حاضر کی دو بالکل مختلف اور اپنی قسم کی واحد اور نمونے کی دنیاؤں میں مذکورہ برائیوں کو ختم و نابود کرنے کے لئے حال ہی استعمال کئے گئے کسے انکار ہے کہ امریکہ نے سائنس میں عظیم الشان ترقی کی ہے اور اس کی پولیس اس سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور طاقت ور ہے۔ ان دو قوتوں کے علاوہ بوقت ضرورت امریکہ کے تمام مذہبی فرقے بھی اپنی کوششیں سماجی مسائل کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ تاہم وہاں طلاق کی شرح دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اور اسکی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اخلاق سدھار سیاسی مہموں، سپیشل پولیس کی بھاگ دوڑ اور منبروں سے وعظ کی یورش کے باوجود جنسی بیماریاں عصمت فروشی اور شراب نوشی ختم نہیں ہوتی۔ سوویٹ

یونین ایک نئے قسم کے سماج کا سب سے پہلا اور عظیم نمائندہ ہے۔ وہاں ایسی مہلک بیماریوں کے پھیلنے کا ہر ممکن سبب موجود تھا جو جدید سماج کا خاصہ ہیں۔ انقلاب سے مذہب کی منظم حیثیت ختم ہوگئی۔ بہت سی پرانی پابندیاں دور ہوگئیں بدکار کو مجرم گردان کر سزا دینا بند کر دیا گیا طلاق لینا بہت ہی سہل ہوگیا اور حکومت نے خود سستی شراب مہیا کرنا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ بیرونی سرمایہ دار ممالک کی مسلح مداخلت سے جو تباہی پھیلی اور اس کے باوجود وہاں پیداوار کی مسلسل بڑھتی ہوئی شرح کو دھیان میں رکھا جائے تو ان حالات میں سرمایہ دارانہ منطق کے مطابق یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہاں عیاشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ روس میں عصمت فروشی کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ طلاق کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے اور آج ایک ایسے ملک میں کوئی آدمی شراب کا نام تک نہیں لیتا جو کبھی اپنے ہاں کے کسانوں اور مزدوروں کی بلانوشی کے لئے بدنام تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں خلاف قیاس اور محض واہمہ معلوم ہوں لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے روس میں ہر سماجی مسئلے کی سائنسی تحقیقات کی گئی اس کی تہ تک پہنچا گیا اور جو حقیقت نکلی اس کی منطقی پیروی کی گئی اس کے بعد یہ خوشگوار نتیجے حاصل کئے گئے۔ سرمایہ دار ممالک میں ایک پولیس کا سپاہی جو سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا ایک مذہبی پیشوا پوچھ نہیں سکتا اور ایک سائنسدان پوچھتا ہی نہیں وہ سوال یہ ہے کہ آخر یہ خرابیاں سماج میں کیوں پائی جاتی ہیں اس کا اشتراکی جواب یہ ہے کہ یہ برائیاں اس لئے پائی جاتی ہیں کہ آبادی کے بعض طبقے ان برائیوں کے بل پر بھاری منافع کماتے ہیں۔ بدطینت لوگ حرام کاری کو بھی اپنی غرض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جرائم کاری لاتعداد عوام کی اس لوٹ کھسوٹ کا ایک عام نتیجہ ہے جو انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو برے کاموں پر مجبور کرتی ہے۔

عام لوٹ کھسوٹ ختم ہوئی تو بداخلاقی کا بنیادی سبب دور ہوگیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو سخت سزائیں دی گئیں جنہوں نے بدکاری سے منافع کمانے کی کوشش کی۔ لیکن یاد رہے سزائیں ان لوگوں کو نہیں دی گئیں جو بدکار تھے بلکہ منافع خوروں کو، رنڈیوں کو نہیں بلکہ چکلہ داروں کو اور شرابیوں کو نہیں بلکہ ناجائز طور پر شراب درآمد کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سب کے لئے باعزت روزگار کے مواقع پیدا کئے گئے۔ اور کام کا حق تہذیب و تمدن کا ایک لازمی جزو بن گیا اس اقدام کے بعد نئی آزادی کے اثرات کا مشاہدہ کرنا اور نئے قوانین، پارٹی پراپیگنڈے اور لوگوں کی سائنٹفک تعلیم کی طرف رجوع کرنا آسان ہوگیا۔ اس کے علاوہ سب کے لئے آرام اور تفریح کی مختلف سہولتیں پیدا کی گئیں مکمل تعلیم اور سستے اور اعلیٰ لٹریچر اور عمدہ موسیقی کا بندوبست کیا گیا۔ بہترین سینما اور ذہنی اور جسمانی تربیت کے مختلف ادارے قائم کئے گئے۔ چونکہ ان خرابیوں کے بنیادی سبب کو ختم کر دیا گیا اس لئے وہ ناپید ہوگئیں اور زندگی سب سے پہلی مرتبہ اس قدر خوشگوار بن گئی کہ آئندہ اس سے گریز کی ضرورت (ہی) باقی نہ رہی۔

ہمیں اپنے ملک میں ایسے ہی مسائل کا سامنا ہے اور ہم امریکی طریقۂ کار آزما رہے ہیں۔ اس میں شراب نوشی کی ممانعت بھی شامل ہے لیکن ہر منافع خور کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم کر کے انہیں غیر طبعی موت مارے۔ چونکہ وہ باعزت طبقے کا فرد ہے اس لئے اس کا یہ مذموم فعل قابل مواخذہ نہیں۔ پولیس الٹا مظلوموں کو دباتی ہے اور اس ظالم کی ذات اور اس کے منافع کی حفاظت کرتی ہے۔ جو لوگ منافع کے خالق ہیں۔ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ غلیظ جھونپڑوں میں رہتے ہیں اور علم کی روشنی سے محروم ہیں۔ لیکن ایک سائنسدان اس طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ وہ سرمایہ دار کو فنی مشورے دینے اور اسکی طبی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے حتیٰ کہ انعام کی غرض سے اسکی خوشامد

کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ سبب؟ یہی کہ امیر آدمی کے سوا اور کون جی کھول کر خرچ کر سکتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اس کے داعی یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مظلوموں کو اگلے جہان میں اجر ملے گا۔ یا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ غریب اور مظلوم لوگ اس دنیا میں اس لئے یوں بھگت رہے ہیں کہ انہوں نے اپنے پچھلے جنم میں بُرے کام کئے تھے حاصل کلام یہ کہ غریبوں کو یکسر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ یا انہیں پہلے سے بھی زیادہ سنگدلی سے کچلا جاسکتا ہے اپنی نیک نیتی کے باوجود، ایک مصلحِ قوم انقلاب کے بغیر انقلاب کا پھل چکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروفیسر ڈی۔ ڈی کوسامبی

پونا ۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء

# آغاز بلا معذرت

مجھے تنبیہہ کی گئی ہے کہ میں یہ کتاب نہ لکھوں اور بلاشبہ بہت سے لوگوں کو ہدائیت کی جائے گی کہ وہ اسے مت پڑھیں لیکن یہ کتاب نہ کسی کو گناہ پر اکساتی ہے نہ کسی کی دل شکنی کرتی ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقت کا سیدھا سادا اظہار ہے۔

اس کتاب میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور جو سوال اٹھائے گئے ہیں انہیں روائتاً بداخلاقی اور گناہ کے دو مبہم لفظوں سے تعبیر کر کے چپ سادھ لی جاتی ہے بداخلاقی، عصمت فروشی، نوجوان لڑکیوں کی تجارت، جنسی امراض، اسقاط حمل، حرام کی اولاد، طلاق، نوجوانی کی بدکاریوں کے نہایت ہی افسوسناک پہلو اور شراب کی تجارت اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔

حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ لیکن مجھے احساس ہے کہ ان صفحات میں بعض مواد جس بے تکلفی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس پر احساس قاری حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ میں ایسے قاریوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔

اہم یہ کتاب کوئی سنسنی خیز انکشاف نہیں کوتی اور اس میں گناہ کا ذکر بھی داخلی اور مقبول عام انداز سے نہیں کیا گیا۔ ایسی ہزاروں کتابیں پہلے سے موجود ہیں، لیکن یہ کتاب ان سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اظہار حقیقت اس قدر حملے اور خفگی کا موجب نہیں بنے گا جتنا کہ مندرجہ ذیل مقصد اور عملی نتیجے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بدکاری کو ایک اچھوتے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سائنس اور خارجہ طریقے سے بداخلاقی کے مسائل کا عملی عام فہم اور سو فیصدی کامیاب حل پیش کیا گیا ہے۔

آپ اس دعوے کا استقبال نفرت اور مذاق سے کریں تو آپ حق بجانب ہوں گے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ انسانی سماج اخلاقی بدی کے بوجھ تلے صدیوں سے بُری طرح کبیں رہا ہے۔ مطالعے پر چار تصنیف و تالیف، قانون سازی غرضیکہ ہر دیانت دارانہ طریقے سے گناہ پر قابو پانے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش ناکام ہے۔ جنگ کے دوران میں ہمارے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اخلاقی اقدار کی انتہائی گراوٹ اور جنگ کے بعد اخلاقی معیار کے پہلے سے بھی زیادہ پست ہو جانے سے ہر حقیقت شناس مبصر یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہم نے بڑ ماری ہے۔ پھر نہایت بے شرمی سے یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ جہاں باقی تمام چیزیں ناکام رہیں وہاں ایک کتاب ضرور کامیاب ہو جائیگی کم از کم راقم الحروف میں تو ایسی جرأت نہیں

اب ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کتاب سماجی اخلاقی سے متعلق ایک تجربے کی ہی رپورٹ ہے۔ جو وسیع پیمانے پر کیا گیا جس میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور جسے میں نے من و عن یہاں پیش کر دیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے عام پبلک کو اس تجربے سے آج تک آگاہ نہیں کیا گیا، جن با اختیار لوگوں کا اس پر تصرف تھا۔ انہوں نے ان حقائق کو اب تک چھپایا ہے اور ڈاکٹروں اور رضاکاروں سے مخفی رکھا ہے۔

مجھے یہ بات دہرانے کی اجازت دیجئے کہ اس کتاب میں حقائق کا ذکر ہے۔ اور اس میں ایسے مسلمہ عملی اقدام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جن کے ذریعے جدید سماج سے بد اخلاقی اسی طرح مٹائی جاسکتی ہے جس طرح قرون وسطیٰ کی پلیگ سی وبائیں ختم کی جاچکی ہیں۔

اس سیدھے سادھے دعوے پر وہ قاری یقیناً حیران رہ جائیں گے جو جنسی امراض پر قابو پانے کی غرض سے ایک سائنٹفک پروگرام قبول کرنے کے لئے تو تیار ہیں لیکن جنہیں یقین ہے کہ گناہ کی چند ایسی صورتوں کے لئے روحانی طریقہ ہی موزوں ہے جن کا تعلق خاندانی شرافت، طلاق اور دونوں صنفوں کے درمیان اخلاقی تعلقات، حرام کاری، یا شراب نوشی سے انسانی وقار کی تباہی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بد اخلاقی فرد کی اپنی روحانی زندگی تک محدود ہے لہٰذا اسے خارج از بحث سمجھنا چاہیئے۔ دوسری طرف ایسے لوگ ملتے ہیں جن کے نزدیک صرف طبی تحقیق ہی بد اخلاقی اور بدکاری کو دور کر سکتی ہے۔ گویا سماجی برائی ایک قسم کا فاسد مادہ ہے اور ماہر کیمیا گروں کو تجربے کی آزادی دیدی جائے تو وہ اسے ایسی سہولت سے دور کردیں گے جس طرح چیچک وٹائیفائیڈ کو ختم کردیتی ہے۔

آج کل ان دونوں خیالوں کے زبردست حامی ملتے ہیں۔ چونکہ ان طریقوں میں سے ہر ایک بڑی حد تک کامیاب طریق کار ہے اس لئے وہ بہت سے لوگوں کو موزوں نظر آتا ہے۔ تاہم سب سمجھدار اور دیانت دار لوگ ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک عملی صورت کا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں گناہ کے خلاف نہ نام نہاد

طبی طریقہ مؤثر ثابت ہوا ہے نہ خالص مذہبی طریق ہی، بدکاری گھٹنے کا نام ہی نہیں لیتی، اخلاقی گراوٹ اتنی شدید ہے کہ آج تک دیکھی نہ سنی۔

گزشتہ چند سالوں کے واقعات سماجی زندگی کی کوئی دلکش تصویر پیش نہیں کرتے۔

# وکٹری گرل

ایسے حضرات جن کا کام محض عیب جوئی ہے اس شاندار بہانے سے کہ گناہ تو آدم اور حوا سے چلا آتا ہے تمام اخلاقی مسائل کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں سے دور اٹھا پھینکتے ہیں۔ یہاں ہمیں گناہ کی ابتدا کے مذہبی تصور سے متعلق کچھ نہیں کہنا۔ جہاں تک موجودہ زمانے کی جمہوریت پسند قوموں کو بدکاری کے خلاف اقدام پر ابھارنے کا تعلق ہے۔ ایک سائنسدان سب سے زیادہ مبارک باد کا مستحق ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ صحت کے سابق سرجن جنرل ڈاکٹر ٹامس پیران نے ۱۹۳۶ء میں ایک رسالے میں ایک تاریخی مقالہ لکھا۔ اس مقالے کو پڑھ کر لاکھوں انسان دم بخود رہ گئے۔ ایک بین الاقوامی شہرت

---

نوٹ :- وکٹری گرل۔ نئے زمانے کی وہ نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی ہے جو لکھ پڑھ کر ملازمت اختیار کرتی اور مردوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ولیکائی (WABCI) اسی قسم کا کردار تھا۔ جو گذشتہ جنگ کے دوران میں ابھرا (مترجم)

کے مالک ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ جنسی امراض کے موضوع کو اس ریاکارانہ سنسر شپ سے آزاد کر دیا جس نے بزعم خویش اسے عام تعلیم یافتہ لوگوں سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے دو ایسی بیماریوں آتشک اور سوزاک کو ہر نوجوان و پیر کے آگے بسوائے اشاعت کر دیا جن کا ذکر اخباروں کے اداریوں میں کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ وہ حیران کن حقائق جو سر جن جنرل نے افشا کئے مختصراً درج ذیل ہیں۔

۱۹۳۶ء میں تیس لاکھ سے زیادہ امریکی لوگ آتشک میں مبتلا تھے اور تقریباً نوّے لاکھ سوزاک کے مریض تھے۔ مزید برآں ہر سال پانچ لاکھ افراد آتشک سے متاثر ہوتے تھے اور اس سے تگنے سوزاک سے۔ ہر سال لاکھوں افراد دل کی بیماریوں سے مرتے تھے جن کا سبب آتشک تھا۔ آتشک سے پاگل ہونے والے لوگوں کی حفاظت پر ہر سال کروڑوں ڈالر خرچ ہوتے تھے ان دونوں بیماریوں سے براہ راست جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ناکارہ ہونیوالے لوگوں کی تعداد اس قدر بھیانک تھی جس کا تصور بھی محال ہے کناڈا، برطانیہ اور اکثر دوسرے ملکوں میں بھی صورت حال اتنی ہی بری تھی یا اس سے بھی بدتر۔ ڈاکٹر پیران نے جنسی امراض کے بارے میں حق گوئی سے کام لیا انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ بیماریاں بعض لوگوں کے بخی گناہوں کی سزا ہیں۔ بلکہ انہوں نے بتایا کہ دونوں بیماریاں ایسے سماجی طاعون ہیں جو ہر قسم کے پیشہ ور مذہبی، نسلی اور معاشرتی لوگوں کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اس رفتار سے بڑھ رہے ہیں کہ ان سے قوم کی مجموعی صحت خطرے میں ہے ڈاکٹر پیران نے قوم سے کچھ کرنے کی اپیل کی۔ ان کی دعوت عمل کے خلاف شرمیلا سا احتجاج تو ہوا لیکن بدکاری پر طبی حملے کو شرک قرار دینے کے باوجود بہت سے پادریوں نے بھی جنسی بیماریوں کی روک تھام کے لئے ڈاکٹروں، رضاکاروں، مدیروں اور قانون سازوں کا ساتھ دیا۔ سرجن جنرل کے اس اعلان سے ان لوگوں کی کچھ ہمت بندھ گئی کہ سب سے زیادہ مہلک

مرض آتشک کو تیس سال کے عرصے میں ختم کیا جاسکتا ہے۔

یہ ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے۔ مہم کہیں دو سال بعد شروع ہوئی۔ قانون پاس کئے گئے۔ ان گنت روپیہ جمع کیا گیا۔ رہائشی شفاخانے اور تجربہ گاہیں کھولی گئیں لاکھوں اشتہار بانٹے گئے لاکھوں مریضوں کے خون کا معائنہ کیا گیا اور مہم کا آغاز بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

ڈاکٹر پیران نے ۱۹۴۰ء میں ایک اور مقالہ لکھا جس میں انہوں نے بتایا کہ آتشک کے بیس فیصد مریض شفایاب ہو چکے ہیں لیکن سوزاک کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جنسی بیماریوں کے خلاف جو جہاد شروع کیا گیا تھا۔ اس میں حسب توقع کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے فوراً بعد سرکاری اعداد و شمار شائع کئے گئے جن سے پتہ چلا کہ مہم کا نتیجہ تو بالکل الٹ نکلا ہے ان اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۲ء میں امریکی افواج میں جنسی بیماریوں کے مریضوں کی تعداد ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں بڑھ گئی تھی۔

یہ صورت حال دیکھی تو امریکی فوج کے منتظمین نے اپنے طور سے مہم چلائی انہوں نے پوری طاقت سے بدکاری کا صفایا کرنے کی ٹھان لی۔ ان حضرات نے ماضی کے تجربے سے آنکھیں بند کرلیں اور گشتی گاڑیوں میں گناہگاروں کا چھاپا کرنا شروع کر دیا انہوں نے جنم جنم کی مظلوم، قربانی کی بکری طوائف کی نگرانی اور بھی کڑی کر دی اس قسم کے اخلاق پرست لوگ جو موقع بے موقع، شرم، جرم اور سزا کی رٹ لگائے رکھتے تھے وہ بڑے جوش و خروش سے سزا کا مطالبہ کرنے لگے اللہ اللہ کہاں وہ موثر سنہری سکیم جہاں چند سال پیشتر جنسی بیماریوں کو سائنسی شائستگی کے ساتھ طے میٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تھا اور کہاں یہ سزا کا نعرہ۔

دیوالیہ پن کی انتہا اس وقت ہوئی جب کہ بہت سی مشہور و معروف ہستیوں خصوصاً جین ٹیٹے نے مردوں سے شریفانہ اپیلیں شروع کر دیں کہ گناہ کرنا چھوڑ دو، عورت کو بھول

جاؤ اور بیماری کا خاتمہ اس ابدی قدر سے کر دکھاؤ جسے نہ بدو تقویٰ کہتے ہیں لاکھوں فوجی سپاہی، کچھ عرصے کے لئے اپنے آپ کو نامرد تصور کرنے پر مجبور ہوئے اور انہیں یوگی بننا پڑا۔ اس اصول کی بنا یہ سچائی تھی کہ یوگی کو جنسی بیماری نہیں لگتی اس طرح زریفت میں لپٹا ہوا سائنسی جہاد وکٹوریائی موعظت پر ختم ہوا۔

۱۹۴۳ء کے شروع میں برعظیم امریکہ ایک بار پھر چونک گیا فوجی افسروں اور دفاع صحت اور بہبود کے محکموں کے منتظمین کے درمیان ایک اچھوتی جھڑپ جاری ہوگئی یہ محکمے امراض کے بڑھتے ہوئے طوفان پر بوکھلا گئے اور شور مچانے لگے کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں "بے حیائی کے اڈوں" سے عورتوں کو نکال دیا جائے انہوں نے مطالبہ کیا کہ خطرناک مقامات کو دوسری آبادی سے قطعاً الگ تھلگ کر دیا جائے پادریوں کو جو موقعہ ملا انہوں نے فوراً اس تجویز کی حمایت کا اعلان کیا اور وہ منظم بدکاری کے خلاف لوگوں کو ابھارنے لگے اور عصمت فروشی کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں آسانی سے کامیاب ہوگئے حالانکہ بہت سے لوگ یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ یہ علت ایک مدت سے ختم ہو چکی ہے لیکن افواج نے اس مہم کے خلاف بھی زبردست احتجاج کیا تو یہ لوگ اور بھی بھونچکے رہ گئے۔ بعض فوجی منتظمین نے اس مسئلے کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو اس قدر آزادی کے ساتھ پیش کیا کہ اخلاق پرست حضرات لاحول پکار اٹھے انہوں نے کہا کہ بدکاری کے اڈوں سے عورتوں کو نکال دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شہر بھر میں ان کا تعاقب جاری ہو جائے گا انہیں مخصوص اور محدود علاقوں میں اپنا کاروبار جاری رکھنے دیا جائے تو فوجی پولیس کم از کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ باوردی سپاہیوں کو ان علاقوں میں نہ گھسنے دے۔

ایڈیٹروں اور رضاکاروں کی تو گویا زبانیں کند ہوگئیں ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوگیا کہ وہ اس خطرناک جھگڑے میں کس کا ساتھ دیں لیکن دفاع صحت اور بہبود کے

محکموں کے ایک افسر مسٹر چارلس پی ٹافٹ کو اپنی تجویز کی کامیابی کا سو فیصدی یقین تھا۔ اعداد و شمار کا ایک نہایت ہی لذیذ لقمہ لے کر آگے بڑھے ان کی ایجنسی کے پاس یہ ثبوت تھا کہ ایک طوائف اپنے کوٹھے میں ایک رات میں کوئی پچاس سپاہیوں کو بیماری لگا سکتی ہے اس کے برعکس اس عورت سے اس کا اڈہ چھین لیا جائے اور اسے گلی محلے میں چوری چھپے کاروبار چلانا پڑے تو وہ ایک رات میں زیادہ سے زیادہ آدھی درجن گاہکوں کو بیماری لگا سکے گی۔

مسٹر ٹافٹ تقدس اور زہد و تقویٰ میں ہرگز یقین نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فوجی افسروں سے کہا کہ حرام کاری کو شہر کے ممنوعہ علاقے میں بند کر کے اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے سے صرف یہ ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ ہے کہ اس سے عام سپاہیوں میں عموماً اور نوجوان سپاہیوں میں خصوصاً گناہ کی رغبت پیدا ہو گی اور حرام کاری کا پرچار ہو گا۔

لیکن اس بحث کا مفید نتیجہ ضرور نکلا۔ لاکھوں شریف انسانوں نے شدت سے محسوس کیا کہ عصمت فروشی کا منظم کاروبار کتنی نفرت انگیز چیز ہے اور اس حقیقت کا احساس پیدا ہوا کہ گاہکوں کی بڑی تعداد ایسے شہریوں پر مشتمل ہو گی جو مضافات میں رہتے ہیں۔

مسٹر ٹافٹ اور ڈاکٹر پیران کی قائم کردہ کمیٹیوں نے تین سو سے زیادہ شہروں میں چکلے بند کرا دیئے۔ اس سے بہت سے مقامات پر جنسی بیماریوں کا پھیلاؤ عارضی طور پر رک گیا۔ اس کے بعد سیہ کاری کے خاص اڈوں مثلاً سستے ہوٹلوں، سیاحوں کی رہائش گاہوں، تفریح گاہوں وغیرہ کے خلاف مہم شروع ہو گئی۔ بری اور بحری فوج نے اپنی طبی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ رخصت پر جانے والے سپاہیوں اور جہازیوں کو مانع امراض دوائیں پہلے سے زیادہ استعمال کرائی گئیں۔ چند ماہ کے بعد یہاں وہاں سے جو اعداد و شمار جمع کئے گئے وہ کافی حوصلہ افزا تھے سپاہیوں میں بحیثیت مجموعی جنسی امراض میں کمی واقع ہوئی لیکن اس

کا ایک سبب یہ تھا کہ بہت سے سپاہیوں کو سمندر پار میدان جنگ میں بھیج دیا گیا تھا۔ البتہ شہری آبادی میں جنسی امراض میں کمی کی رفتار حوصلہ افزا نہ تھی۔

اس اثنا میں سیہ کاری کے مخالفین کی لغت میں ایک نئے لفظ ——— وکٹری گرل کا اضافہ ہوا امریکہ کی بحری فوج کے دو ڈاکٹروں نے اچانک اشاعتی تاریپڈ دانع دیئے لفٹیننٹ کمانڈر وشن گراؤنے نیویارک کے رہنے والوں کو اپنے بیان سے حیران کر دیا کہ دنیا کے سب سے بڑے شہر نیویارک میں طوائف اتنی خطرناک چیز نہیں رہی چار سے تین جہازیوں کو غیر پیشہ ور لڑکیوں سے بیماری لگتی ہے یہ جہازی خیال کرتے تھے کہ اتفاقاً ہاتھ لگی ہوئی چیز سے ضرر ہوتی ہے لفٹیننٹ کمانڈر بلکے نے فلاڈلفیا کے اعداد و شمار جمع کئے اور نتیجہ نکالا کہ نوجوان اوباش لڑکیوں کی تعداد بدکار عورتوں سے بڑھ گئی ہے۔ آخر یہ لڑکیاں کون تھیں۔ چودہ برس یا اس سے زیادہ عمر کی دوشیزائیں۔

اخبار ٹائم کے نامہ نگار مقیم نارفوک نے لکھا ہے کہ پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے سے پہلے نارفوک میں طوائفوں کی اکثریت پیشہ ور تھی۔ اور آج پچاسی سے نوے فیصدی طوائفیں عام فیشن پرست عورتوں پر مشتمل ہیں ان میں بہت سی نوجوان لڑکیاں بھی ہیں جو بڑی بڑی ملازمتوں کے لالچ سے نارفوک کی طرف کھنچ آتی ہیں۔ یہ لڑکیاں ہر ہفتے سینکڑوں کی تعداد میں آتی ہیں زرعی فارموں میں کام کرنے والی اور شہروں میں کلرکی کا کام کرنے والی لڑکیوں کے لئے اپنی پسند کا مرد تلاش کرنے کا یہ بڑا ہی آسان طریقہ ہے

امریکہ کی میڈیکل ایسوسی ایشن نے اپنے جرنل میں ان حقائق کی تصدیق کی اور لکھا کہ پرانی وضع کی طوائف کی حیثیت اب ثانوی ہوتی جا رہی ہے۔ طوائف کی نئی قسم انیس بیس سالہ نوجوان لڑکی ہے۔ درحقیقت جنسی بیماریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا اور پھیلانے

والا ہمیں میں سے ایک ہے۔

بحر اوقیانوس کے اس پار برطانوی میڈیکل ایسوسی ایشن نے بھی اپنے جرنل میں انگلستان سے متعلق اس قسم کے حقائق کا انکشاف کیا اور انگلستان میں جنسی بیماریوں سے متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد اتنی ہی بتائی جتنی مسٹر بلکے نے فلاڈلفیا کے بارے میں بتائی تھی۔ اس جرنل کی رپورٹ کے مطابق طوائف سے ایک مرد کو بیماری لگتی ہے تو شوقین پیشہ ور عورتوں سے چار کو آسٹریلیا کے ڈاکٹروں نے اپنے ملک کے نوجوانوں میں بدکاری اس سے بھی کہیں زیادہ بتائی۔ کناڈا کے صاحب اقتدار حضرات نے کھلے بندوں اندازہ لگانے سے گریز کیا۔ لیکن نوجوانوں کے خلاف مقدموں سے متعلق عدالتی کاغذات سے اندازہ لگایا گیا کہ تیرہ سے انیس برس کی لڑکیاں ملک بھر میں باقاعدہ گناہ کی طرف مائل ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ اخلاقی گراوٹ محض جنگ کی وجہ سے تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگ کے دوران میں کثیر آبادی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور عارضی صنعتی ترقی اور خوشحالی اخلاقی گراوٹ کا باعث بنتی ہیں لیکن سماج کے ایک نئے خطرناک عنصر نئی قسم کی بدکردار لڑکی سے نفرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ حقیقت تو اس نئے رجحان کی طرف جاتی ہے۔ جس کا اخلاق اور شرافت سے کوئی تعلق نہیں اس سلسلہ میں ہم دو مشہور کتابوں کا حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی کا نام تھا "نو سے گناہ زیادہ مجرم" جس کا مصنف ہک مین پاول تھا۔ دوسری کا نام "رنگین نقوش" جس کا مصنف کورا ٹنے ریلے کوپر تھا۔ یہ دونوں کتابیں بداخلاقی پر تھیں اور ان میں بتایا گیا تھا کہ نئی پود کی نوجوان لڑکیوں کو بداخلاق سمجھنے کا خیال ۱۹۲۵ء سے چلا آتا ہے۔ امریکی پارلیمان کے ایک ممبر کلاڈ پیپر کی سرکردگی میں ایک ذیلی کمیٹی جنگ کے زمانے کی صحت و تعلیم کا جائزہ

لینے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے ۱۹۴۳ء کے آخر میں اپنی رپورٹ تیار کی جس میں بتایا گیا کہ حال ہی میں نوجوانوں میں جرائم کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے اسے جنگ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا یہ اس قدرتی عمل کا نقطۂ عروج ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا جب کہ اچھے اور برے اشخاص کے درمیان سماجی حدود تیزی سے مٹ گئیں۔

مذکورہ بالا حقائق سے دو نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جنسی امراض پر طبی حملہ ناکام رہا۔ اور ڈاکٹر پیران کا یہ دعویٰ کہ آتشک کو رہائشی شفاخانوں اور تعلیم کے ذریعے تیس سال کے عرصے میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ناقابل قبول ہے بہت سے ترقی پسند مذہبی راہنماؤں نے بھی ڈاکٹر پیران کی طرح پیشگوئی کی تھی لیکن انہوں نے بھی منہ کی کھائی کیونکہ ہر اتوار کو گرجوں میں پند و نصائح کا جو چکر جاری ہے اس سے باہر نکل کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جنسی امراض کو بداخلاقی کے پورے مسئلے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح لوگوں کو نیک بننے کی تلقین کرنے سے جنسی بیماریاں ختم نہیں کی جا سکتیں اس طرح بڑے سے بڑے طبی منصوبے اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک لاکھوں انسانوں میں جنسی تعلقات کا نادان ادا کرنے کی مقدرت نہ ہو۔

دوسرا نتیجہ ذرا کم واضح ہے ایسا لگتا ہے کہ جنسی بیماریوں کے خلاف جہاد کرنے والے ایک خاص قسم کی بیماری میں مبتلا ہیں وہ ایک ہی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں ان کا اندازہ یہاں تک خطا سے مبرا ہے کہ وہ بعض عورتوں اور لڑکیوں کو جنسی بیماریوں کی ذمہ دار سمجھتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں کہ ایک وکٹری گرل ایک رات میں کتنی مرتبہ اپنے دامن کو داغدار بنا سکتی ہے۔ لیکن جونہی مردوں کے چلن کی پڑتال کا وقت آتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ یہ اندھے مصلح حضرات بیماریوں میں مبتلا غیر ذمہ دار

اور بدکردار لڑکی سے خفا ہو کر ان کے خلاف اقدام کے لئے میزوں پر گھونسے مار مار کر چلاتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ عورتوں کا سوال اٹھے تو فوراً اس کے سنانے کی مہمیں پیش کر دی جاتی ہیں لیکن مردوں کا سوال اٹھے تو یہ مہمیں اعداد و شمار سے آگے نہیں بڑھتیں لڑکیوں کی نگرانی، تعاقب، گرفتاری سزا اور ان کی اصلاح لازمی ہے۔ لیکن مردوں کے لئے محض علاج، معالجہ، تنبیہہ، مانع امراض چیزیں یا محض وعظ کافی ہے۔

سائنسی لٹریچر کو عموماً غیر جانبدار کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ غیر جانبداری بھی نام نہاد ہی ہے کیونکہ یہاں بھی حقیقت کو ایک آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر لوگ ہمیشہ یہی کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ عورتیں بیماری لگاتی ہیں اور مردوں کو بیماری لگتی ہے۔ اس کے الٹ کبھی نہیں سنا گیا۔ جہاں تک سماجی برائیوں کے حل کا تعلق ہے۔ اس کے لئے جو طریقہ پیش کیا جاتا ہے وہ بالکل غیر موثر اور سطحی ہے بدکاری کی ایک ہی مصیبت یعنی جنسی بیماریوں کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ایسا مسئلہ بن چکا ہے جس کے سماجی نتائج نہایت ہی تباہ کن ہیں اور ہمارے مذہبی اور سائنسی راہنماؤں نے اسے حل کرنے کی کوشش میں اور بھی الجھایا ہے۔

اخلاقیات کے اکثر ماہرین کو بلا تامل سہل انگار کہا جا سکتا ہے سہل انگاری کیا ہے یہ ایک لاعلاج روحانی درد ہے جسے نامعقولیت اور تعصب کے جڑواں، ذہنی کیڑے پیدا کرتے ہیں لغت میں عام طور سے سہل انگار کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے ندرت خیال چھو سکتی ہے نہ بلندئ نصب العین لیکن مشہور ناول نگار میکسیم گورکی سہل انگار حضرات کو انسانی مسرتوں کے جانی دشمن سمجھتا تھا اور ان کا ذکر کرتے وقت اس کے قلم سے چنگاریاں جھڑنے لگتی تھیں۔

ایک مرتبہ اس نے کہا کہ جس چیز کو ہم "قانون کی روح" یا "روایت" کہتے ہیں اس سے

سہل انگار کے ذہن میں ایک ایسے مشینی ڈھانچے کا تصور پیدا ہوتا ہے جو کسی کلاک سے مشابہ ہو جس کا بڑا سبب سہل انگار نکتہ چین کے خیالات کے چکر کو حرکت میں لانا ہے اس نے اپنے طنز کو ان الفاظ پر ختم کیا ہر سہل انگار کا مقولہ ہے کہ چیزیں جیسی ہیں ویسی ہی رہیں گی۔ سہل انگار نکتہ چین ایک مردہ مچھلی ہے جس کا سر سب سے پہلے سڑتا ہے۔

کتنے سخت الفاظ ہیں بظاہر ان کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن مقصد پوری طرح واضح ہے جمہور کی اخلاقی مصیبتوں کو دور نہ کر سکنے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم ایسے مفکروں میں گھرے ہوئے ہیں جو بظاہر گناہ کی مذمت کرتے ہیں لیکن تنہائی میں ہنستے ہیں۔ اور اپنے کندھے سکیڑتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں کہ عصمت فروشی جیسے ہے ویسے رہے گی۔ وہ بدکاری سے متعلق اپنے خیالات کو نئی طبی دریافتوں کا جامہ پہناتے ہیں لیکن ان کی اپیلیں اتنی فضول اور اکتا دینے والی ہیں جیسے کہ کلاک کی دو آوازیں ٹک اور ٹک وہ ہمیں اس سے آگے نہیں لے جا سکتے یہی خالص سہل انگاری ہے اور اسی کو گندے ماضی سے چمٹ کر دل کو جھوٹی تسلیاں دینے کی کوشش کہتے ہیں قصہ کوتاہ سہل انگاری کبھی کی مر چکی ہے، سڑ چکی ہے۔

لیکن ہم سڑاند کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے ہماری موجودہ نسل تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے ہم اپنے ماضی کی گندگیوں کو ختم کرنے کی وسیع پیمانے پر جدوجہد کر رہے ہیں ہم افلاس اور مکر کے ایک ایسے قید خانے کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں بنی نوع انسان کو صدیوں تک پابند سلاسل رکھا گیا ہے تمام انسان تیز رفتاری سے اپنے شاندار مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں

سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا عوامی دنیا کے سماج میں منظم بدکاری بھی شامل ہے کیا ہم چار دل آزادیوں کا اطلاق نوجوان لڑکیوں کی تجارت پر بھی کریں گے۔ کیا ہم لاکھوں نوجوانوں کی اخلاقی بحالی کے لئے کوئی پروگرام تیار کر سکتے ہیں۔

بدکاری سے متعلق عام بازاری خیال یہ ہے کہ سماجی برائیاں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ اس خیال کا ٹھوٹھا پن عہد غلامی کی برائیوں کے انجام ہی سے ثابت ہو جاتا ہے انسانوں کی خرید و فروخت، ہزاروں سال جاری رہی۔ اور مذہب پرست، سہل انگار لوگ نسلاً بعد نسلٍ غلاموں کی تجارت کو جائز قرار دیتے رہے اور اس نظام کے ابدی ہونے کا اعلان کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود مہذب قوموں نے کوئی سو سال کے اندر ہی غلام کے نظام کو تہس نہس کر دیا اس کے بعد ہم نے ایسے طاعون ختم کئے جو سخت ہلاکت خیز تھے اور ان کے متعلق بھی بزرگان دین کا فتویٰ تھا کہ یہ ابدی ہیں اور اب اقوام متحدہ کے ماہرین فن تمام دنیا سے فحظ کو باہر نکالنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ کروڑوں انسان صدیوں تک غلامی، بیماری اور کال کے ہاتھوں تباہ ہوتے رہے۔ لیکن کھاتے پیتے اور ہٹے کٹے علماء منہ بسور بسور کر کہتے رہے کہ شر ابدی ہے۔

میں یہاں ایک بار پھر گورکی کا حوالہ دیتا ہوں اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آؤ تھوڑے عرصہ کے لئے ہی دیانتداری برتیں اور حقیقت کو پہچانیں"

جن دنوں امریکہ میں جنسی بیماریوں کیخلاف جہاد اپنے عروج پر تھا۔ فیڈرل سیکورٹی ایجنسی کے ایک عہدیدار فلپ ایس بروڈن نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا عنوان تھا "عصمت فروشی اور جنگ" اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم کیا گیا تھا یہ کتاب امور عامہ کی کمیٹی نے شائع کی تھی اور اسکی اشاعت سے پہلے متعلقہ ایجنسیوں نے اور محکموں نے اس کے متن کی بڑی احتیاط سے جانچ پڑتال کی تھی۔ لہذا یہ کتاب مستند تھی مسٹر بروڈن ایک امریکی فوج میں بدکاری کے مثالی طوفان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس قسم کا کاروبار کرنے کے لئے کسی تردد کی ضرورت نہیں یہ کام خود بخود شروع

بوجھتا ہے اور یوں چلتا ہے جیسے شہد کے پیچھے مکھیاں اور جہاز کے پیچھے گرداب۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر فوج کو اس سے نباہ کرنا پڑا ہے۔ ہر بندرگاہ اور صنعتی ترقی اور خوشحالی کا ہر دور اس کی آماجگاہ ہے اور زنا اور جنسی امراض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

آگے چل کر فاضل مصنف یہ دردناک آواز بلند کرتا ہے کہ جنسی بیماریاں ابدی ہیں اور لوگوں کو شر سے بچنے کے طریقے وضاحت سے سمجھاتا ہے گویا ہزاروں لفظوں میں اپنی تردید آپ کرتا ہے۔ میں نے مسٹر برڈن کا بیان اس لئے درج کیا ہے کہ وہ نیم سرکاری ہے اور حرام کاری سے متعلق عام مسلمہ یاس انگیز اور سطحی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اس کا بیان سراسر غلط ہے۔

سب سے بڑی تاریخی فوج میں زنا کا نام تک نہیں تاریخ میں سب سے بڑا صنعتی ارتقاء، بدکاری کے عروج کی بجائے اس کے زوال کے بعد رونما ہوا۔ گذشتہ بیس سالوں میں بیسیوں صنعتی شہر اور بڑی بڑی بندرگاہیں غیر معمولی رفتار سے منصۂ شہود میں آئی ہیں۔ لیکن ان میں بدکرداری نے کبھی اتنے مسئلہ کی حیثیت سے بھی سر نہیں اٹھایا امر واقعی یہ ہے کہ روئے زمین پر ایک ایسا ملک موجود ہے جس کا سماج اٹھارہ کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے لیکن وہاں سے عصمت فروشی اور جنسی بیماریوں کو عملاً ختم کر دیا گیا ہے وہ ملک سوویت یونین ہے۔

لارڈ اور لیڈی پاس فیلڈ، بیٹرس اور سڈنی ویب اور فیوریناٹڈس جیسے محقق اور ہزاروں ماہرین طب جنہوں نے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے سائنس کے رسالوں کو اپنی رپورٹیں بھیجیں اور اسی قسم کے بے شمار غیر جانبدار مبصرین متفق الرائے ہیں کہ سوویٹ یونین میں بیس سال کے قلیل عرصہ میں بداخلاقی کے نازک سے نازک مسائل جن میں

جنس اور شراب سے متعلقہ مسائل بھی شامل ہیں۔ ایسی کامیابی سے حل کئے گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور یہ کامیابی اس حقیقت کے پیش نظر کتنی عظیم ہے کہ آج سے کوئی بیس برس پہلے جب کہ بداخلاقی کے خلاف روس میں مہم شروع کی گئی اور وہاں کی آبادی نمبر ۱ حیثیت سے جنسی بے رہروی اور شراب نوشی کی لعنت میں اس بری طرح گرفتار تھی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔

ہٹلر نے مشرقی محاذ پر جنگ کا آغاز کیا ہی تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بحری فوج کے کمان افسر مسٹر نارمن نے جو ان دنوں ماسکو جانیوالے مہری مشن کے ممبر تھے اور روس میں امریکی سفارت خانے سے ملحقہ آفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ روس کی سرخ فوج اور فضائیہ جنسی بیماریوں کی لعنت سے مبرا ہیں۔ اور یہ بات دنیا کی کسی فوج کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ بہت کم اخباروں نے اس بیان کو شائع کیا اور اتحادی قوموں کے ان رہنماؤں نے اس کا استقبال خاموشی سے کیا جو جنسی بیماریوں کے خلاف نہیں چلا رہے تھے اس واقعے کے کوئی تین سال بعد پروفیسر وی۔ ڈی ایبی وینکو روس کی ریڈ کراس سوسائٹی کے نمائندے کی حیثیت سے امریکہ پہنچے تو ایسوسی ایٹڈ پریس، امریکہ کے نمائندوں نے ان سے ملاقات کی یہ اخباری نمائندے پروفیسر صاحب کے اس جملے پر منہ میں قلم دبا کر رہ گئے کہ نوجوان روسیوں کی موجودہ پنسل کو کبھی عصمت فروشی کے معنی تک جاننے کی ضرورت پیش نہیں آئی اس بیان کو ایک طرف بیشمار لوگوں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا اور دوسری طرف اسے شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ لوگوں نے مزید تحقیقات کی ہر چند کوشش کی۔ لیکن اس موضوع کو فوراً ترک کرا دیا گیا۔

آج سے پانچ سال پہلے سوویٹ یونین کے چند ماہرین فن کیسا تھ زنا اور شراب نوشی

کے موضوع پر تبادلۂ خیالات کرنیکا مجھے بھی موقع ملا۔ مجھے ان کی باتوں کی سچائی کا یقین ہوگیا تو میں نے ان سے ایک خاص سوال کردیا کہ ٹھیک ٹھیک بتایئے کہ سوویٹ حکومت نے عصمت فروشی، بدکاری، جنسی بیماریوں، نوجوانوں میں جنسی بے راہروی اور شراب نوشی کی عادت کی روک تھام کے لئے کیا کچھ کیا۔

لیکن جواب میں سوائے خاموشی کے کچھ نہ پایا۔ یہ روسی سب کے سب نوجوان تھے انہوں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے پیشہ ور عورت کی شکل نیویارک اور ٹوکیو کے بازاروں میں دیکھی تھی البتہ انہوں نے برملا کہا کہ سوویٹ یونین کو ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کئے مدت گذر چکی۔ کم از کم دس سال کا عرصہ ہوچکا ہوگا۔ ہم اس وقت ابھی بچے ہی تھے ہمیں اتنا تو یاد پڑتا ہے کہ ہمارے والدین ان اقدامات پر بحث کیا کرتے تھے جو بدکاری کے خلاف عمل میں لائے جاتے تھے۔ لیکن ہمیں ان کی تفصیلات یاد نہیں ہمارے لئے یہ ایک قصہ پارینا ہے۔

اُن دنوں کناڈا اور روس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ میں نے بداخلاقی کیخلاف سوویٹ اجتہاد کی مکمل داستان ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انگریزی میں اس سے متعلق کوئی واضح اور مفصل رپورٹ شائع نہیں ہوئی لامحالہ میں نے ایسے پراپیگنڈا ذرائع سے تفصیلات اکٹھی کیں جن کا سوویٹ حکومت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا یہ سودات تکنیکی اور مستند تھے اور اس میں عصمت فروشی اور جنسی بیماریوں سے متعلق جو مواد تھا اسے پروفیسر وی۔ ایم برونر نے ترتیب دیا تھا جو جنسی بیماریوں کے ماہر تھے اور محکمۂ صحت کے افسر اعلیٰ کے مشیر بھی تھے اور انہیں یورپ بھر میں جنسی بیماریوں کے ایک چوٹی کے ماہر سائنسدان مانا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا رپورٹوں میں جو کہانی موجود ہے۔ یہ کہانی اسی پر مشتمل ہے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے۔ کہ سوویٹ یونین سے اکثر لوگوں کی ہمدردی ایک خاص حد سے آگے

نہیں جاتی۔ ہم جن موضوعات پر قلم اٹھا رہے ہیں ان میں وہی مسائل اور عندیئے شامل ہیں جو سوویٹ حکومت پر اکثریت کے عدم اعتماد بلکہ نفرت کی بنیاد ہیں مثلاً یہی چیز جسے پراپیگنڈہ کرنے والے حضرات "سرخ اخلاقیات"، اشتراکی آزادیٔ محبت "اسقاطِ حمل اور سہل طلاق کے ذریعے خاندان کی بلشویکانہ تباہی" وغیرہ کہتے ہیں اس کتاب کا موضوع ہے۔ ہمیں بار بار بتایا جا رہا ہے کہ اہل روس ایک ایسی قوم ہیں جن کی اخلاقی اور روحانی اقدار کو سختی سے تباہ کر دیا گیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اب روس میں طوائف کا نام و نمود تک نہیں بعض حضرات فوراً بول اٹھیں گے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے سرکاری قانون کے صدقے سے ہے جس کے رُو سے تمام عورتوں کو مشترکہ ملکیت قرار دیدیا گیا۔ لیکن ان تمام بچگانہ الزام تراشیوں کو جھٹلانے کیلئے موجودہ جنگ میں تمام روسی قوم کا مجموعی کردار اور روس کے بیشمار جوانوں، مردوں اور عورتوں کا متاثر کن بلند اخلاق ہی کافی ہے جنہوں نے حال ہی میں ہمارے ملک کا دورہ کیا ہے۔ روس کا مشہور جنگی ترانہ "میری منتظر رہ" ایک ایسے سپاہی شاعر کی تخلیق یقیناً نہیں ہو سکتی جسکی بیوی اس کے آبائی شہر کی مشترکہ ملکیت ہو۔ روس کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر فتح کی خوشیاں منائی گئیں اور ان موقعوں پر بہت سے روسی شہری مدہوش بھی دیکھے گئے لیکن روس کی پولیس کو کسی ایک شرابی پر پستول اٹھاتے نہیں دیکھا گیا۔

آج بین الاقوامی حالات کی رفتار کا تقاضا ہے کہ ہم روس کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ ایک مشیر در پراپیگنڈسٹ کی رسمی تعریف و تذلیل پر کفایت کرنے کے دن گذر گئے پھر بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے یہ خیال قابلِ قبول نہ ہو کہ ہم سوویٹ یونین سے گراں قدر اخلاقی سبق سیکھتے ہیں۔ کیونکہ انسانی تعلقات کا یہ ایک ایسا نازک حصہ ہے جو ہمیشہ سے ہدف تنقید بنا رہا ہے۔ بین الاقوامی تجارت اور دنیاوی امن کی خاطر باہمی اشتراک عمل تو

ممکن لیکن روسیوں سے سبق سیکھنے کی بات تو انتہا پسندی کی دلیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روس کے باشندوں نے نہ کبھی ماضی میں وعظ کیا ہے نہ آجکل کرتے ہیں۔ وہ اتنے مصروف ہیں کہ انہیں ہمارے لئے مشنری بننے کی فرصت ہی نہیں۔ لہٰذا جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے، وہ وعظ نہیں بلکہ روس کی اخلاقی پالیسی اور منصوبے کی خارجی اور حقیقی رپورٹ ہے اگر اس کے باوجود آپ اسے وعظ تصور کریں تو میں ایک بات ضرور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وعظ سنتے سنتے آپ کو نیند نہیں آئے گی۔

# بدکاری کا پاسپورٹ سسٹم

روس کی موجودہ حکومت نے سوویٹ یونین کی عنانِ انتظام ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے دوران میں سنبھالی۔ کمیونسٹوں کے پلّے ایک ایسی قوم پڑی جو نہ صرف معاشی اور جسمانی بلکہ اخلاقی اعتبار سے اتنی گر چکی تھی کہ یقین نہیں آتا۔ روس میں بداخلاقی کی بنیاد عصمت فروشی کا باضابطہ نظام تھا جس کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی زار کی ریاست کرتی تھی۔ یہ نظام ان دنوں داغِ بدنامی کی طرح دنیا بھر میں مشہور تھا۔ "اسے پیلا پٹہ" کہتے تھے۔

زار شاہی روس میں تمام شہریوں کے پاس اپنے نام اور حلیے کی سند ہوتی تھی۔ جسے پاسپورٹ کہتے تھے۔ اس پاسپورٹ کے ذریعے زار کی پولیس روس کے باشندوں کی نہایت ہی سخت نگرانی رکھتی تھی۔ پاسپورٹ کے بغیر سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا اور مسافر کو ہر وقت گرفتاری کا ڈر لگا رہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا کارڈ نہایت ہی اہم دستاویز تھی۔ گویا یہ جینے کا اجازت نامہ تھا۔ لیکن بے شمار افراد کو اپنی مرضی سے اپنا پاسپورٹ پولیس کے پاس جمع کرانے کی اجازت تھی اور اکثر افراد کو ایسا

کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ ایسی عورتیں ہوتی تھیں جو عمر بھر کے لئے عصمت فروشی کا پیشہ اختیار کرتی تھیں۔ زار کے عہد حکومت میں یہ کام مردوں کی صحت کے لئے لازمی سمجھا جاتا تھا۔ عورت کی سماجی حیثیت اور اس کی بدکرداری سرکاری قانون کے ماتحت تھی۔

ان قوانین کے مطابق جو عورت بازار میں بیٹھنا شروع کر دیتی تھی اسے حق شہریت سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے اور اسے پاسپورٹ کی جگہ سوائے عالم پیلا پٹہ لینا پڑتا تھا یہ پیٹہ پولیس کی جانب سے عام جاری کیا جاتا تھا۔ یہ پٹہ سرکاری اجازت نامہ تھا اور اسے رکھنے والی عورت کو پولیس کے قوانین کے مطابق کھلے بندوں عصمت فروشی کا حق مل جاتا تھا۔ اس سسٹم کا سب سے مذموم پہلو یہ تھا کہ جو لڑکی ایک مرتبہ یہ حیثیت قبول کر لیتی تھی، اسے اپنی تمام عمر بدکاری کے جہنم میں گذارنا پڑتی تھی۔ اس کے لئے کوئی راہ نجات نہ تھی۔ ہر عورت اپنا پاسپورٹ پیلے پٹے سے تبدیل کرا سکتی تھی۔ لیکن قانون اسے دوبارہ اپنا پاسپورٹ بدلنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ یہ پٹہ اس داغ کی طرح دائمی اور انمٹ تھا جو قرون وسطیٰ میں چوروں کے ماتھوں پر جلا کر کھود دیا جاتا۔

روس کی مقامی حکومتوں کا دستور تھا کہ وہ لائسنس یافتہ عورتوں کی زندگی اور پیشے کی تفصیلات اور قواعد مرتب کرتی تھیں۔ ہم ان عورتوں کے کاروبار کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ جو عورت ایک مرتبہ اپنے لئے یہ پیشہ منتخب کر لیتی تھی۔ اسے ہمیشہ کے لئے کوئی باعزت روزگار تلاش کرنے کی ممانعت تھی کیونکہ پاسپورٹ کے بغیر ملازمت کا ملنا ناممکن تھا اور وہ اپنا پاسپورٹ پولیس کے پاس جمع کرا چکی تھی۔

زار کے عہد میں بدکار عورتوں اور لڑکیوں کی اصلاح کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ جاتی تھی۔ اس کے برعکس قانون کی رو سے کسی پیشہ ور عورت کو دوبارہ باعزت روزگار تلاش کرنے کی ممانعت تھی اور وہ زندگی بھر اپنے پیشے کی حدود میں رہنے پر مجبور تھی۔ بصورت دیگر عدالتیں انہیں مجرم گردان کر سخت قسم کی سزائیں دیتی تھیں۔

شرافت کے تقاضے کے پیش نظر ہم زار شاہی قوانین کی تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ تاہم یہ بات قابل توجہ ہے کہ پیشہ ور عصمت فروش اور زناکار عورتوں کا وجود سماج کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اکثر مقامات پر پیلے پٹے والی عورتوں کو مخصوص مکانات میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جنہیں سرکاری طور پر "حرام کاری کے اڈے" کہا جاتا تھا۔ جہاں ایسا ممکن نہ ہوتا وہاں خاص علاقے مخصوص کرائے جاتے تھے۔ ایسا اوقات پیشہ ور عورت کے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ دوسرے کرایہ داروں کی طرح اس مخصوص علاقے میں داخلے کے مکان میں اپنا نام درج کرائے۔ لیکن اس صورت میں پولیس اس کے نام کے ساتھ اس کا پیشہ بھی ضرور درج کرتی تھی۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ اخلاقی پستی کا تصور بھی محال ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے روس بھر میں حرام کاری کا وجود مسلمہ تھا۔ دراصل پیشہ ور عورتوں کو اپنا اتا پتا بتانے پر اس لئے مجبور کیا جاتا تھا کہ جو عورت عارضی افلاس سے تنگ آکر ایک مرتبہ بھی عصمت فروشی کی ذلت کے گڑھے میں گر جائے وہ دوبارہ پولیس اور اس کے رائج کردہ پیلے پٹے کے سسٹم کے شیطانی چکر سے نہ نکل سکے۔

روس میں حرام کاری کا انتظام خاص اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد

بدکاری کی روک تھام تھا لیکن کوئی سمجھ دار آدمی اس سرکاری مکاری سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ دراصل بدکاری کے بندوبست کا مقصد پیشہ ور لڑکیوں کی تجارتی منڈی کے لئے مال کی فراوانی تھا۔ اس بندوبست کا خصوصی پہلو یہ تھا کہ پیشہ ور لڑکیوں اور عورتوں کو بہ لحاظ حسن و سن مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ کم سن اور حسین و جمیل لڑکیوں کو اعلیٰ درجے میں رکھا جاتا تھا اور وہ امیروں، وزیروں اور بڑے بڑے تاجروں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں۔ جو عورتیں خاص دل کشی کی مالک نہ ہوتی تھیں انہیں عمر بھر چکلوں میں رہ کر گھٹیا سے گھٹیا جرائم پیشہ لوگوں کے تیر ہوس کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ قانون کے مطابق پیلے پٹے والی عورت مسلسل پولیس کی نگرانی میں رہتی تھی۔ قانون میں پیشہ ور عورتوں کے لئے باقاعدہ ڈاکٹری معائنے اور چکلوں کی تلاشی کی شرط بھی تھی لیکن ادنیٰ طبقے کے لئے مخصوص چکلے اس قباحت سے بری تھے اور پولیس اکثر بدنام قسم کے چکلوں پر ہی چھاپہ مارتی تھی۔

اس نظام کی برکت سے ایسے گندے اور ہولناک افعال سرزد ہونے لگے کہ آدمی کو یقین نہیں آتا۔ بعض اوقات چکلوں میں عورتوں کی قلت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات فوجی افسر شکایت کرتے کہ سپاہیوں میں آتشک کی وبا پھیل رہی ہے۔ لہٰذا قانون پر سختی سے عمل درآمد کرانے کے بہانے پولیس کو پے در پے چھاپے مارنے کے موقعے مل جاتے۔ پولیس بلا روک ٹوک مزدور بستیوں میں جا گھستی اور تمام بازاروں، گھروں اور تفریح گاہوں کی تلاشیاں شروع ہو جاتیں۔ جہاں اصل پیشہ ور عورتوں کو گرفتار کیا جاتا وہاں نہایت چالاکی سے بہت سی ایسی لڑکیوں کو بھی دھر لیا جاتا جن کی پاک دامنی اور نیک چلنی پر شبہ تک نہیں کیا جا سکتا۔ ان معصوم لڑکیوں کو عدالت کے کٹہرے میں

کھڑا کیا جاتا اور ان پر پیلے پتے یعنی لائسنس کے بغیر پیشہ وری کا الزام لگایا جاتا۔ قانون کی اس خلاف ورزی کا جرمانہ پانچ ہزار روبل یعنی (تقریباً تین ہزار سات سو پچاس روپے تھا۔ ظاہر ہے غریب ملزمہ سے اتنی بڑی رقم وصول نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لئے قانون میں اس کا بدل موجود تھا۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں بے قصور اور مجبور ملزمہ سے پاسپورٹ چھین لیا جاتا اور پیلا پتہ دے دیا جاتا۔ پولیس اپنے چھاپوں کا منصوبہ بڑی ہوشیاری سے تیار کرتی تھی۔ پلان کے مطابق پولیس افسر اصل پیشہ ور عورتوں کے ہمراہ جہاں ان لڑکیوں کو پکڑ لاتے ہیں جنہیں بعد میں پیشے کی لعنت میں مبتلا کرنا مقصود ہوتا تھا وہاں بہت سی غریب اور شریف عورتوں کو بھی لے آتے جن میں اکثر حاملہ ہوتیں اور بچوں کو دودھ پلاتی مائیں بھی شامل ہوتیں جن کو خرم گردانا مقصود ہوتا تھا۔ جج صاحبان ان کے علاوہ سب کو باعزت طور پر رہا کر دیتے تھے۔ اس طرح پولیس چکلوں میں پیشہ ور عورتوں کی قلت کو دور کرنے کے لئے جو ذلیل اور انسانیت سوز طریقہ اختیار کرتی تھی وہ قانونی طور پر جائز ہوتا تھا۔

خیال رہے کہ زار شاہی کی عدالتوں کے روبرو تقریباً تمام عورتوں کی حیثیت نہایت ہی مظلومانہ اور پست تھی لیکن پیشہ ور عورتیں تو نہایت ہی مظلوم اور بے بس تھیں۔ ٹالسٹائی کے ناول "قیامت" میں ایک ایسی ہی لڑکی کی لرزہ خیز داستان بیان کی گئی ہے جسے حرام کاری کی زندگی پر مجبور ہونا پڑا۔ فاضل ناول نگار نے بتایا ہے کہ زار کے افسر عورتوں کے ساتھ اس قدر سنگدلانہ برتاؤ کرتے تھے کہ امیر طبقے کے لوگ بھی ان کے سامنے بے بس تھے۔ پیلے پتے کے معنی دراصل مکمل تباہی کے پاسپورٹ کے تھے۔ قانون کی رو سے عورتیں صرف دو صورتوں میں پولیس کی

نگرانی سے چھوٹ سکتی تھیں۔ پہلی یہ کہ عورت کی بیماری اتنی خطرناک ہو جائے کہ وہ مردوں کے قابل نہ رہے اور دوسری موت۔

ان حالات میں جنسی بیماریاں خوب پھلتی پھولتی تھیں۔ کبھی کبھار ایسے با اثر روسی لوگ جو ٹالسٹائی کی کتابوں جیسی تحریروں سے متاثر ہوتے یا بعض مشہور ڈاکٹر جو اونچے طبقے کے خاندانوں میں آتشک کے پھیلنے سے گھبراتے تھے وہ جنسی بیماری کی روک تھام سے متعلق دفعات قانون پر سختی سے عمل درآمد کراتے۔ لہٰذا احکامات جاری ہوتے اور دھوئی پھیلائی جاتیں۔ پولیس جن ڈاکٹروں کو معائنے کے لئے مامور کرتی تھی انہیں معائنوں کے حساب سے فیس دی جاتی تھی۔ بسا اوقات کمپونڈروں کو معائنہ کے کام پر لگا دیا جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ پولیس چند افسروں کو جمع کر لیتی اور ان کے سامنے فی گھنٹہ چار سو کے حساب سے معائنے کے لئے عورتیں پیش کی جاتیں۔ ہر ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ مریض بھگتانے کی کوشش کرتا اور معائنے کے وقت مریضوں کے لباس اتارنا ضروری نہ خیال کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں جو تشخیص کی جاتی ہوگی وہ نہایت ہی غیر تسلی بخش اور غلط ہوتی ہوگی۔ چونکہ مرض دریافت ہونے کی صورت میں علاج کرانا لازمی تھا اور علاج کے لئے بے شمار روپے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا بدنصیب عورتیں سستا طریقہ اختیار کرتی تھیں اور پولیس اور ڈاکٹروں کو نقدی کی صورت میں رشوت دے کر گلو خلاصی کرا لیتی تھیں۔

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ روس کے ماہر ڈاکٹر پیلے پٹے کے مذموم سسٹم سے نجات کا راستہ تلاش کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام حل جنہیں زمانہ جدید کے ماہرین دریافت کر رہے ہیں۔ انقلاب سے پہلے روس میں دریافت کئے گئے

آزمائے گئے ۔ اور "دیباکارانہ گریز" کہہ کر ترک کر دیئے گئے ۔ پورے تیس سال کا عرصہ گزرا کہ ڈاکٹر ابراہام فلیکسنر نے ایک مشہور کتاب لکھی تھی جس کا نام یورپ میں "عصمت فروشی" رکھا گیا تھا ۔ اس میں انہوں نے آخری اور فیصلہ کن دلیلوں کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ عصمت فروشی پر کنٹرول سرے سے نامعقولیت اور حماقت ہے ۔

جنسی امراض کے پھیلاؤ کو کسی خاص عرصے کے لئے نہ تو چکلوں کی نگرانی نہ دوسرے طریقے یعنی طوائفوں پر پولیس کا تشدد ہی کم کر سکتا ہے اور زنا کار عورتوں اور مردوں کا طبی معائنہ اس وقت تک قطعاً ناممکن ہے جب تک ہم ایک ایک ڈاکٹر کو گھیر کر ایک وسیع فوج میں منظم نہ کر لیں جن کا کام صرف جنسی امراض سے متاثر لوگوں کا معائنہ کرنا ہو خون کے معائنوں اور دواؤں کے ذریعے آتشک ، اور سوزاک ، پر قابو پانے کے لئے اس برعظیم (یورپ ) میں اتنے شفاخانے کھولنے کی ضرورت ہے جتنے آج گیس سٹیشن قائم ہیں ۔

زار شاہی روس کے حکمران اس سماجی برائی سے متعلق مندرجہ بالا تلخ حقیقت سے واقف تھے لیکن انہوں نے اس کے خلاف کچھ نہ کیا کیونکہ وہ معدود رہتے ۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بدکاری پر سرکاری کنٹرول کا نتیجہ لامحالہ یہ نکلے گا کہ قانون پر عملدرآمد کرانے والا محکمہ خود خراب اور رشوت خور بن جائے گا ۔ اس لئے انہوں نے اس خرابی کو تسلیم کیا اور اسے قانونی حیثیت دے دی ۔ ہر طوائف کو پیلے پتے کی بل پر کاروبار کرنے کا حق حاصل کرنے کے لئے فیس دینا پڑتی تھی اور اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ میٹرنیٹی یا دوسرے سرکاری افسر کو ادا کرنا پڑتا تھا ۔

ایسی صورت حال کو آج ہم ہرگز گوارا نہیں کر سکتے ۔ ۱۹۱۷ء کے پہلے کے روس میں جو بداخلاقی کا مسئلہ پایا جاتا تھا ۔ اس میں اور ہمارے ہاں کے آج کل کے مسئلے میں ایک

اعتبار سے حیران کن مشابہت ہے۔ ان دنوں روس میں زنا کاری دن بدن بڑھ رہی تھی۔ زار کی وزارت انصاف کے اعداد و شمار کے مطابق بدکاری اور جرائم میں پہلی جنگ عظیم کے پہلے کے بیس سالوں میں مسلسل زیادتی ہوئی۔ قتل اور تشدد آمیز جرائم میں پچاس فیصد اضافہ ہوا۔ حرام کاری پہلے کی نسبت تین گنا بڑھ گئی۔ پیلے پٹے کے سسٹم کے رائج ہونے سے بھی اس میں کمی واقع نہ ہوئی بلکہ حرام کاری نے اور بھی زور پکڑا۔ ۱۹۱۳ء میں سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) کے شہر میں ساٹھ ہزار رجسٹرڈ پیشہ ور عورتیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب کی کھپت میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوا۔ کیونکہ شراب اور زنا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں میں شراب نوشی کی عادت زور پکڑ گئی۔ اندازہ لگایا گیا کہ دس سال کے عرصہ میں نوجوانوں کی اخلاقی حالت پہلے کی بہ نسبت دوگنی پست ہو گئی۔ اگرچہ زار کی عدالتیں ایسے نوجوانوں کے خلاف مقدمات کی سماعت بھی کرتی تھیں جن پر شدید ترین جرائم کے ارتکاب کا الزام ہو۔ لیکن وہ نوجوان (جن میں بدکاری سے متعلق اعداد و شمار کو یکسر نظر انداز کر جاتی تھیں۔ روس میں انقلاب عظیم کی آمد کے وقت دس میں سے آٹھ طوائفیں ایسی تھیں جن کی عمر اکیس سال سے کم تھی۔ طوائفوں کی نصف تعداد نے یہ پیشہ اس وقت سے اختیار کیا تھا جبکہ وہ اٹھارہ سال کے سن کو بھی نہ پہنچی تھیں۔ دس میں سے چار طوائفوں نے حرام کاری کی زندگی کا آغاز سولہ سال کی عمر سے کیا تھا اور بہت سی چودہ سال کے سن کو پہنچنے سے پہلے ہی زینت بازار بن گئی تھیں۔

ہم ان حقائق کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ خرابیاں زار روس کے عہد ہی کا خاصہ تھیں۔ ان کا جواب ہمارے ہاں موجود ہے۔ ہمارے ہاں کی وکٹری گرلز بھی ہائی سکول کی طالبات کی عمر کی لڑکیاں تھیں۔ سماجی تاریخ شاہد ہے کہ بداخلاقی زور

پکڑتی ہے تو یہ کاروں کی اوسط عمر اسی تناسب سے کم ہو جاتی ہے۔ یعنی بدکاری کا آغاز نسبتاً کم سنی سے ہونے لگتا ہے۔

اس مسئلے سے متعلق ہم نے حال ہی میں غفلت ترک کی ہے۔ ڈاکٹروں نے اپنی مساعی دگنا کر دی ہیں۔ پادری نصیحت کرنے اور ڈرانے لگے ہیں اور سیاست دان حضرات ماہرین کی کمیٹیاں قائم کرنے لگے ہیں۔ اس سے ۱۹۱۰ء کے زار شاہی روس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جبکہ ایسے لوگوں نے زار کی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا تھا کہ بدکاری کی روک تھام کے لئے کچھ کیا جائے جو سلطنت زار کے اندر گناہ اور جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ روس میں دوسرے ملکوں کے سیاح جاتے تھے تو وہ بلا جھجک کہہ دیتے تھے کہ مہذب دنیا پیلے پیٹے کے سسٹم کو نہایت ہی نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس پر امیروں، وزیروں اور ڈاکٹروں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایماندار لوگ مارے ندامت کے عجیب الجھن میں پھنس جاتے تھے۔ انقلاب روس سے سات سال پہلے اخلاق سدھار تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ زار نے بدکاری کے خلاف منظم جہاد شروع کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے ایک کانگرس بلائی۔ اس کانگرس کے سامنے سب سے بڑا بحث طلب سوال تھا حرام کاری سے متعلقہ قوانین کی تنسیخ یعنی عصمت فروشی پر سے سرکاری کنٹرول اٹھانے کی تجویز۔ روس کے ٹریڈ یونین رہنماؤں نے اس کانگرس کو کافی اہمیت دی اور انہوں نے اس میں اپنے چند مندوب بھیجے۔ پولیس نے ہر چند دباؤ ڈالا کہ ان نمائندوں کو نہ سنا جائے لیکن اس کے باوجود انہیں اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ جب انہوں نے اس کہاوت کے مطابق کہ "سو سنار کی ایک لوہار کی" اعلان کیا کہ روس

میں بڑھتی ہوئی بدکاری کا موجب زار شاہی نظام ہے تو مجمع حیرت میں پڑ گیا۔ انہوں معاشی اور سیاسی زبوں حالی کو بدکاری کے اضافے کا سبب ٹھہرایا اور دعوے کیا کہ موجودہ مطلق العنان حکومت عصمت فروشی اور جنسی بیماریوں کو دور کرنے کی جو بھی کوشش کرے گی وہ انجام کار ناکام ثابت ہوگی۔

اس پیش گوئی کو اس لئے زیر بحث نہ لایا گیا کہ مبادا وہ کانگریس ہمیشہ کے لئے سائبیریا کی جیلوں میں منتقل کر دی جائے۔ لہٰذا پولیس شاہی نے فتح پائی۔ اس کے خیال میں پیلے پٹے کا نظام بہتر تھا اور دوسرے ملکوں میں حرام کاری پر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے جو صورت حال پائی جاتی تھی۔ یہ نظام اس پر قابل ترجیح تھا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ نچلے طبقے کی چند ہزار عورتوں کا عمر بھر کے لئے عصمت فروشی اختیار کر لینا اس سے بدرجہا اچھا ہے کہ شریف خاندانوں کی بیٹیاں بھی سیہ کاری کی لپیٹ میں آئیں۔ ان کی لمبی چوڑی تقریروں اور ریاکارانہ دلیلوں کے پیچھے جو تلخ حقیقت پوشیدہ تھی اسے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے کہ سلطنت روس میں بدکاری پر باقاعدہ سرکاری کنٹرول حکومت کے لئے نہایت ہی منفعت بخش تھا دراصل بدکاری پر کنٹرول کرنے کے بہانے روس کی عورتوں سے قانوناً کثیر رقم وصول کی جاتی تھی جو ساری کی ساری زار کے بددیانت اور رشوت خور افسروں کی جیبوں میں جاتی تھی۔ چونکہ زار شاہی صرف پولیس کی آمریت کی بدولت قائم تھی۔ اس لئے اعلیٰ حکمرانوں نے فیصلہ کر دیا کہ محکمہ پولیس کو جو آمدنی نوجوان لڑکیوں کی عصمت کی تجارت سے ہوتی ہے اس میں دخل نہ دیا جائے۔ لہٰذا جو کانگریس بدکاری سے متعلق قوانین کی تنسیخ کے لئے بلائی گئی تھی وہ اس عیارانہ نتیجے پر پہنچ کر ختم ہو گئی کہ "نچلے

طبقوں" کی عورتیں خطرناک حد تک بدکار ہیں۔ کیونکہ ان کی گذران ہی عصمت فروشی پر ہے۔ جرج نے اس فیصلے کو اپنی ازلی انداز میں سراہا اور اعلان کیا کہ انسان ازلی گناہ گار ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اس اجتماع نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا کہ بداخلاقی اور بنی نوع انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور عورتیں ہی اس کی ذمہ دار ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں اس دلچسپ بحث کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے جو امریکہ میں بھی جاری تھی اور جس کا موضوع یہ خیال تھا کہ جنسی بیماری کو سماجی مسئلہ تسلیم کر لیا جائے تو اسے یہ اعتبار نسل دو حصوں میں یعنی گورے اور کالے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کارنل یونیورسٹی میڈیکل کالج کے محکمہ صحت عامہ امتناعی ادویات کے ایک مشہور ممبر ڈاکٹر ڈبلیو۔ جی سمل نے امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے رسالے بابت جون ۱۹۴۳ء میں ایک مشہور و معروف بیان شائع کیا۔ انہوں نے امریکی فوج کے ان سپاہیوں کا معائنہ کیا تھا جو آتشک کے مریض تھے۔ ان کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

"یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ امریکہ میں آتشک پر قابو پانے کے لیے جو پراپیگنڈہ ہوا ہے اس کا اکثر حصہ گمراہ کن ہے۔ عام طور سے بتایا جاتا ہے کہ دس ہزار افراد میں سے ایک کو آتشک کی بیماری ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ بحیثیت مجموعی گوری نسل کے لوگوں میں آتشک کا عارضہ بہت کم پایا جاتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر گوری نسل کے سب سے نچلے طبقوں کے افراد تک محدود ہے۔ آتشک کی بیماری عموماً اس قسم کے گورے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو جاہل، بداحتیاط، جرائم پیشہ اور غیر مہذب ہیں آتشک دراصل ایک سماجی مرض ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر سملی نے حبشیوں میں آتشک کی شرح دریافت کرنے پر زور قلم صرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "چونکہ آتشک کی بیماری گوروں کی بہ نسبت حبشیوں میں دس گنا زیادہ پائی جاتی ہے اس لئے حکام کو چاہیئے کہ جہاں اس بیماری کا تناسب ۱۰ فی صد سے زیادہ ہے وہیں اپنے منصوبوں کو دس گنا زیادہ شد و مد سے عمل میں لائیں۔ اور قوم کے سیاہ فام لوگوں میں بیماری کو روکنے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سفید فام لوگوں میں بھی بیماری گھٹ جائے گی۔

یہ دلیل حبشیوں پر ایک کھلے حملے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اکثر جاہل، بد احتیاط جرائم پیشہ اور غیر مہذب گورے لوگوں کے تعلقات حبشی قوم سے بھی ہیں۔ لیکن ہم ایک منٹ کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ ڈاکٹر سملی کی مراد کچھ اور تھی وہ ڈاکٹروں کی توجہ ایک ناقابل انکار حقیقت کی طرف دلا رہے تھے مگر وہ آگے چل کر کہتے ہیں۔

"یہ رجحان اب تک عام پایا جاتا ہے کہ صحت عامہ سے متعلق سرکاری حلقے اس امر کو سرسری نگاہ سے دیکھتے ہیں یا یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ آتشک کی بیماری حبشیوں میں عام ہے۔ اس حقیقت کو جتنی جلدی مان لیا جائے اور موجودہ صورت حالات کی اصلاح کر لی جائے تو یہ نہ صرف حبشی نسل کے لئے اتنا ہی بہتر ہے بلکہ بحیثیت مجموعی قومی صحت کے لئے مفید ہوگا۔"

ڈاکٹر سملی کی نیت بری نہ بھی سہی لیکن وہ خود اور دوسرے بہت سے لوگ، جو ان کی حمایت کرتے ہیں۔ ان افسروں سے زیادہ مجرم ہیں جنہیں وہ ہدف تنقید بناتے ہیں اس دلیل میں ان حقائق پر جس طرح پردہ ڈالا گیا ہے وہ ایک سائنس دان کے شایان شان نہیں۔ اس میں حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔

جنسی بیماری گورے لوگوں کی نسبت حبشیوں میں کیوں زیادہ ہے۔؟ ڈاکٹر سملی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک نسلی خصوصیت ہے۔ کیا یہ سچ ہے اور پھر گوری نسل کے اکثر غیر مہذب لوگ جنسی امراض میں کیوں مبتلا ہیں۔؟

جسے خدمت خلق کا کچھ تجربہ ہے اس کے نزدیک اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ حبشی قوم میں جنسی بیماریوں پر پردہ ڈالنے کی بھی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حق بات کہنے سے وہ ہولناک صورت حال منظر عام پر آتی ہے جس میں حبشی لوگ زندگی گزار رہے ہیں۔ امریکہ کے حبشیوں کی بہت بڑی اکثریت اس قسم کی بے رحمانہ سیاسی اور سماجی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہے جو کبھی زار شاہی روس میں پائی جاتی تھی۔ حبشیوں کے آتشک میں مبتلا ہونے کا سبب بھی وہی ہے جس سے غیر مذہب گورے لوگوں کو بیماری لگتی ہے اور وہ سبب ہے غربت جسے نسل و نسل سے کوئی واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر سملی اس واضح اور ٹھوس حقیقت پر اعداد و شمار کا ایک نرم و نازک پردہ ڈال رہے ہیں۔ جسے ایسے لوگ، خاص طور سے پسند کرتے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ بدکاری کے بنیادی وجوہ کو چھپاتے ہیں۔ "آتشک دراصل ایک سماجی بیماری ہے"۔ آخر اس فقرے کا کیا مطلب ہے؟ جو مطلب بھی آپ چاہیں نکال لیں۔ معاشی بحران کے دوران میں اس قسم کے فقرے ان نام نہاد سائنس دانوں نے استعمال کئے تھے جنہوں نے امدادیاب اور بے روزگار لوگوں کے حالات کی تفتیش کرتے وقت اپنی غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ سماجی سائنس کے ان متوالوں نے اپنی منصفانہ آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر فیصلہ کیا کہ "بے روزگاری دراصل ایک سماجی مظہر ہے"۔ انہوں نے لاکھوں "ناقابل ملازمت" لوگوں کے بارے میں ہزاروں قسم کے نظریئے تراشے۔ وہ

ان رجعت پسندوں کے اشاروں پر ناچ کر ذلیل ہوئے جنہوں نے سائنس کو ہوویریت میں منتقل کر دیا۔ یعنی رجعت پسندوں نے یہ مقولہ گھڑ لیا کہ "قابل آدمی بے کار ہو ہی نہیں سکتا صرف ناکارہ، نکمے لوگ ہی امداد طلب کرتے ہیں"۔

آٹشک یقیناً سماجی بیماری ہے اور اسی طرح عصمت فروشی بھی سماجی علت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ بداخلاقی اور اس سے وابستہ باقی تمام مسائل ہمارے سماج کی بنیادی خرابیوں کی پیداوار ہیں۔ ڈاکٹر سملی حبشی نژاد امریکیوں کو جرائم پیشہ اور غیر مہذب گوروں کے ساتھ ملا کر سائنسی حقیقت کے دائرے سے باہر نکل گئے ہیں اور خواہ ان کی نیت ہو یا نہ ہو ایسا کرنے سے وہ نسلی تنافر برتنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں ایک نہایت ہی خطرناک ہتھیار دے رہے ہیں۔ آٹشک کا اس قسم کا تجزیہ اور بھی شیطانی فعل ہے کیونکہ یہ بیماری جنسی ہے۔ اور یہ سفید جھوٹ ہے کہ حبشی لوگ بہ اعتبار نسل سفید فام لوگوں کی نسبت گھٹیا اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں۔ حبشی قوم کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈے کی ایک بڑی بنیاد ہے اور یہی وہ زہر ہے جس سے متاثر ہو کر جنوبی ریاستوں کے فاشسٹ انتقام کے جذبے سے اندھے ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جنوبی ریاستوں کے حبشیوں اور گوروں میں جو اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہیں وہ حبشی نسل میں جنم نہیں لیتیں بلکہ ان کا سبب حبشی قوم کی اندھی لوٹ کھسوٹ ہے جو نہ صرف حبشیوں بلکہ اسی طرح سفید فام لوگوں میں بھی بداخلاقی کو جنم دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر سملی ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ حبشیوں کا علاج ہو جائے تو آٹشک ختم ہو جائے۔ اس کا تو صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ کالے

لوگ ہی گوروں میں بیماری پھیلاتے ہیں۔ ایسے خیالات براہ راست گوئیلز اینڈ کمپنی کی یکواسیات سے چرائے گئے ہیں

اب ہم یہ بتائیں گے کہ دوسرے ملکوں میں "سماجی بیماری" کی نوعیت کیا ہے؟ سب سے پہلے کناڈا کو لیجیے۔ وہاں حبشی آبادی بہت ہی تھوڑی ہے جو تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اور وہاں امریکہ کی بہ نسبت معاشی نااانصافی بہت کم ہے۔ وہاں آج تک کسی نے آتشک کے بیماروں کے متعلق گورے اور کالے لوگوں کے لئے الگ الگ اعداد و شمار پیش نہیں کئے۔

میں نے کناڈا کے ڈاکٹروں اور سوشل ورکروں سے تحقیقات کی ہے۔ کناڈا کے حبشی بھی اوسطاً غریب ہیں لیکن وہ اتنے افلاس زدہ نہیں ہیں جتنے امریکہ کے لاکھوں کالے خاندان اور جہاں تک جنسی بیماری کا تعلق ہے گورے اور کالے کناڈی میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔

تاہم امریکہ کے اصلی باشندے انڈین عموماً آتشک میں مبتلا ہیں جو ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سخت لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ متاثر کن وہ اعداد و شمار ہیں جو کناڈا میں تپ دق سے متعلق ہیں۔ جہاں تک اس مرض کا تعلق ہے کناڈا والوں نے کبھی سے گوروں اور انڈینوں میں خط امتیاز کھینچ لیا ہے کیونکہ بحیثیت مجموعی ملک کی تمام آبادی کے مقابلے میں انڈینوں میں دق کا مرض بہت زیادہ ہے لیکن کناڈا کے ڈاکٹر حقیقت کی پردہ پوشی کے مجرم نہیں۔ وہ اس نظریے کے ہرگز حامی نہیں کہ انڈین بہ لحاظ نسل سفید طاعون یعنی دق سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ تپ دق ان معنوں

میں سماجی بیماری ہے کہ یہ بیماری ان لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑتی جنہیں سماج ہمیشہ کے لئے افلاس کے جہنم میں دھکیل دیتا ہے اور گھٹیا غذا، گندی رہائش، جہالت اور طبی امداد سے محرومی ان کا مقدر ہو جاتا ہے۔ انڈینوں میں تپ دق سے مرنے والوں کی تعداد مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ ڈاکٹر ای۔ ایل۔ راس اور اے ایل پین نے حال ہی میں تخمینہ لگایا ہے کہ جو سفید فام لوگ مخصوص انڈین علاقے کے ساتھ آباد ہیں ان کے مقابلے میں انڈینوں میں تپ دق کا مقابلہ کرنے کی قوت بہت کم ہے۔ تاہم یہ دلچسپ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ علاج کے بعد ان کی ایک بڑی تعداد نے خاطر خواہ شفا پائی۔ اگر انہیں گورے لوگوں کی طرح سہولتیں اور مواقع میسر کئے جائیں تو مانع اور دافع مرض اقدامات سے وہ بھی اتنے ہی متاثر ہوں گے جتنا کہ گورے لوگ۔ ان محققین نے اس جاں گداز افلاس، غلاظت اور جہالت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ جس میں بے رحم حکومت وقت نے کناڈا کے اصلی باشندوں کو دھکیل رکھا ہے۔

اُلسٹنک کا مرض امریکہ کے کالے باشندوں میں دس گنا زیادہ ہے۔ تپ دق کناڈا کے گورے باشندوں کے مقابلہ میں انڈینوں میں دس سے لے کر بیس گنا تک زیادہ ہے۔ یقیناً دونوں امراض سماجی بیماریاں ہیں اور اس کے اصل معنی بالکل واضح ہیں۔

اور وہ معنی یہ ہیں کہ امریکہ کے حبشی اور کناڈا کے انڈین اپنے اپنے ملک میں سماجی زبوں حالی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ وہ سب سے نچلے طبقے ہیں۔ وہ

معاشی گڑھے کی تہ پر ہی رینگتے رہنے پر مجبور ہیں۔ کوئی جوشیلا اور دیانت دار منصوبہ ساز جنسی امراض کے رہائشی شفاخانے یا تپ دق کے خیراتی ہسپتال قائم کرنے کے خواہ کتنے بھی منصوبے بنائے وہ اس سماجی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایک پشت یعنی تیس سال سے زیادہ عرصہ گذرا کہ روس کے ٹریڈ یونین رہنماؤں نے اس کانگریس کے سامنے جو عصمت فروشی کے بارے میں غور کرنے بیٹھی تھی یہی حقیقت رکھنے کی کوشش کی تھی جس کا اطلاق ان دنوں ان کی قوم پر ہوتا تھا لیکن زار کی سلطنت میں حبشیوں جیسی قربانی کی بکریاں نہ تھیں۔ مفکرین نے سماجی بیماری کے اقتصادی وجوہ پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے بازو لہرا لہرا کر نچلے طبقے کی عورتوں کو بدکاری پر اور مردوں کو ابدی ہوس پرستی پر بھلا کہا اور بس۔

اور گورکی کے الفاظ میں زار شاہی اور اس کے ماہرین اخلاقیات ایک مردہ مچھلی کے مشابہ تھے جس کا سر سب سے پہلے سڑتا ہے۔

# آزاد محبت

نومبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے زار شاہی معاشرے کی جھوٹی چمک کو خاک میں ملا دیا۔ نیم جاگیرداری کا نظام پہلے سے ہی متزلزل تھا اور انقلاب کے ایک ہی ریلے سے تہس نہس ہو گیا۔ جو رسمیں اور حقوق صدیوں سے مقدس اور مسلم مانے جاتے تھے وہ فوراً ختم ہو گئے۔ روس کا معاشی، سیاسی اور سماجی بحران اور بھی شدید ہو گیا اور سوویت حکومت کافی مدت تک بدکاری اور بداخلاقی کے خلاف کوئی موثر اقدام نہ کر سکی۔

لیکن انقلاب کے پہلے دن ہی سے کمیونسٹ رہنماؤں کو احساس تھا کہ جو معاشرہ حقیقی معنوں میں آزاد ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایسے اخلاقی نظام کو برداشت نہیں کر سکتا جس کی بنیاد لاتعداد عورتوں کی غلامی پر ہو جہاں انقلابی حکومتوں کے ہاتھ میں طاقت آئی۔ وہاں پولیس کا انتظام بھی عوام کے

ہاتھ میں آجاتا اور سب سے پہلے جو اقدام کیا جاتا وہ پیلے پٹے کے سسٹم کا خاتمہ ہوتا ۱۹۱۷ء کے بعد اشتراکی حکومت نے پیشہ ور عورتوں سے ہر قسم کے ٹیکس کی وصولی بند کر دی۔ تاہم اس تبدیلی کا آنا لازمی امر تھا۔ کیونکہ انقلاب تھا ہی منظم مزدور طبقے کا اور لایا ہی محنت کش طبقے کے لئے گیا تھا۔ مزدور طبقے کی حمایت نہایت ہی مفلس کاشت کاروں نے کی تھی۔ چونکہ روس کی طوائفوں کی بھاری اکثریت شہر اور دیہات کے مفلس اور نادار طبقوں سے جبراً بھرتی کی گئی تھی۔ لہٰذا نئی حکومت ان بدقسمت اور معصوم عورتوں کا وحشیانہ استحصال کب دیکھ سکتی تھی۔

یوں پیلا پٹہ غائب ہوا اور تمام عورتوں کے شہری حقوق بحال کر دیئے گئے لیکن اسی سخاوت پر قناعت نہیں کی گئی۔ انقلابیوں میں بھی بعض سیاسی رہنما خیال پرست تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بدکار عورت کو مہذب عورت کے پہلو بہ پہلو استقبال رائے کا حق دے دینے سے اس کا انسانی وقار بحال ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے بہت جلد منہ کی کھائی۔ قدیم زار شاہی حکومت کے زوال کے بعد روسی معاشرہ طویل عرصہ تک ابتری کی حالت میں رہا۔ نومبر کے واقعات کے بعد ہر قسم کی بدکاری جس میں فیشنی عصمت فروشی بھی شامل ہے۔ حقیقتاً بہت زیادہ بڑھ گئی۔

بہت جلد ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ انقلاب سے جو نئی آزادیاں ملی ہیں انہیں عجیب و غریب قسم کے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ ایک اشتراکی نعرہ ہے کہ تمہیں اپنی زنجیروں کے سوا کھونا ہی کیا ہے۔ کارل مارکس کا یہ انقلابی نعرہ اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے متعلق تھا۔ بہت سے روسیوں (خاص طور سے نوجوانوں اور دانش وروں) نے اس نعرے کو یہ معنی پہنا کر عام کر دیئے کہ "تمہیں اپنی رکاوٹوں کے سوا کھونا ہی کیا ہے"۔ ان

لوگوں نے سوچا کہ زار شاہی کے ساتھ ہی اخلاق کے سرمایہ دارانہ معیار کو بھی ختم کر دینا چاہیئے۔

جس طرح ان لوگوں کو توقع تھی کہ لینن ایک ہی جھٹکے سے سوشلسٹ سماج پیدا کر دے گا، جس میں ہر چیز ان کی دسترس میں ہوگی اسی طرح ان باتونیوں نے روس کی لڑکیوں اور عورتوں کو یقین دلایا کہ محبت اب پیچیدہ شے نہیں رہی۔ بس جیسے کھانا کھالیا اور پانی پی لیا۔ ویسے ہی محبت کر لی۔

آزاد محبت کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ آج ہمارے ہاں اکثر نوجوان اس کے حامی ہیں لیکن اسے انقلابی لفاظی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا تو بعض روسی مردوں میں یہ خاصا ہر دلعزیز ہو گیا۔ بعض حضرات یہاں تک بڑھے کہ ایک نیا نظریہ لے کر میدان میں آئے اور کہنے لگے کہ زنا کاری کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جنسی تعلقات پر سے ہر قسم کی پابندی ختم کر دی جائے۔

بد اخلاقی سے متعلق یہ نیا نظریہ آگے چل کر نہایت ہی نفرت انگیز اور واضح الفاظ میں پیش کیا جانے لگا۔ بعض حضرات کھلم کھلا دلیلیں دینے لگے کہ جب آپ کو بھوک لگتی ہے آپ کھانا کھا لیتے ہیں اور جب پیاس لگتی ہے پانی پی لیتے ہیں اسی طرح جب آپ پر شہوت غالب آئے تو جو عورت بھی آپ کی دسترس میں ہو اس سے محبت کیجئے ایسا کہ تا کوئی بد اخلاقی نہیں۔

ان لوگوں کے مغز میں یہ بات نہ آئی کہ اخلاق کا یہ معیار قائم ہو گیا تو اخلاق کا جنازہ ہی نکل جائے گا۔ روس کے دانشوروں کی اکثریت نے تو اخلاقی فلسفے کو سرے سے بورژوائی فلسفہ ہی قرار دے دیا اور کہنے لگے کہ یہ زار شاہی دور

کی چیز ہے ۔ اسے نئے سماج میں جگہ نہ دینا ہی بہتر ہے ۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو زار شاہی سماج سے دلچسپی تھی نہ سوویٹ سماج سے ، وہ تو مزدور اور کسان طبقے کی عورتوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے ۔

ان کا قول ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ آزاد محبت کے نظریے کو فوراً تسلیم کر لیا جائے ۔ آزاد محبت کے نظریئے کو جذباتی شاعروں سے لے کر اخلاقی خوردبین کے نیچے رکھیئے تو آپ پر اس کی حقیقت فوراً عیاں ہو جائے گی کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ "آزادی" کے نام سے تمام عورتیں زنا کاری شروع کر دیں ۔

اشتراکی رہنماؤں کے نظریات اور پروگراموں میں آزاد محبت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی ۔ اس کے برعکس اشتراکی حکومت کے رہنما جانتے تھے کہ انفرادی آزادی کے پردے میں جس قسم کی آزاد محبت کی وکالت کی جاتی ہے وہ سوشلسٹ سماج کے راستے میں روڑے اٹکائے گی ۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ دنیا کی جو طاقتیں اشتراکی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی تیاریاں کر رہی ہیں ۔ وہ آزاد محبت کے نظریئے کو خوب استعمال کریں گی جسے وہ عورتوں کی "مشترکہ ملکیت" کا نام دیتی تھیں ۔ سوویت حکومت کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا ۔ اس میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا کہ بالشویک اخلاقیات کی بنیاد اس پر ہے کہ تمام عورتیں ہر مرد کی دسترس میں ہونی چاہئیں یعنی عورتوں کو مشترکہ ملکیت قرار دے دیا جائے ۔ شادی کا نظام ختم کر دیا جائے ۔ تمام بچوں کی پرورش اداروں میں پرورش کی جائے اور بچہ ماں باپ کی تمیز سے آزاد ہو وغیرہ وغیرہ ۔

میکسم گورکی عمر بھر زار شاہی روس کے پرفریب اور ظالم نظام کے خلاف جدوجہد کرتا رہا ۔ لیکن اس نے چند سال اشتراکی نظام کی مخالفت بھی کی ۔ نئے نظام پر اس کا

بڑا اعتراض یہ تھا کہ کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کی نجات کے دوران میں ناقابل تغیر انفرادی حقوق بھی پامال نہ ہو جائیں۔ گورکی ان مشہور تاریخی ہستیوں میں سے تھا۔ جنہوں نے شخصی آزادی کے لئے سخت جہاد کیا تھا۔ لیکن اس نے آج کل کے خطیبوں کی طرح چند چوٹی کے افراد کی شخصی آزادی کی خاطر تلوار نہیں اٹھائی۔ کیونکہ آزادی سے اس کا مطلب سب کی آزادی، لاکھوں انسانوں کی آزادی، عوام کی آزادی تھا۔

گورکی نہایت ہی مخلص مجاہد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خامی کہاں ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ نئے اخلاقی رجحان کے ذمہ دار اشتراکی رہنما ہیں بلکہ جو شخص اس رجحان کو ہوا دیتے تھے اس نے انہیں ہی ملزم ٹھہرایا اور سخت الفاظ میں اس رجحان کی مخالفت کی۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں جو کچھ کہا وہ آج ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ اس نے اپنے ایک مشہور ناول میں لکھا۔

"میں محبت کی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا۔ تاہم اتنا ضرور کہہ دینا ہوں کہ میرے خیال میں نوجوانوں کی موجودہ پود نے جنسی تعلقات کی حد سے زیادہ سادہ بنا لیا ہے میرے خیال میں یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا انہیں جلد یا بدیر لیکن ضرور ملے گی۔"

ان حالات کو دیکھتے ہوئے لینن نے آزاد محبت کے پرچاروں پر سرکاری طور سے حملہ کیا۔ وہ عرصہ سے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کلارا زیٹکین نامی ایک انقلابی عورت نے لینن سے اس مسئلے پر ملاقات کی تو اس نے اس سنہری موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ کلارا نے نئے انقلابی خیال کی طرف لینن کی توجہ مبذول کرائی کہ جنسی خواہش بھی پیاس کی طرح ایک فطری جسمانی حاجت ہے اور جب کبھی خواہش پیدا ہو پیاسے کی طرح پیاس بجھا لینی چاہیئے۔ اس نے نئے نظام کے رہنما سے سوال کیا کہ اس کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

لینن نے کہا۔ "ہاں"۔ پیاس بجھانا ضروری ہے "

اس کے بعد اس نے اخلاقی ظاہرداری اور تکلفات سے نفرت کا اظہار کیا اور نئے رجحان کی سخت مخالفت کی۔ اس نے کہا۔

"عام حالات میں ایک صاحب ہوش آدمی کو پیاس لگے تو کیا وہ نالی میں لیٹ کر گندے کیچڑ میں سے پانی پی لے گا یا ایک ایسے گلاس میں پانی پی لے گا جس کے کنارے بے شمار ہونٹوں کی نمی سے چکنے ہو رہے ہوں۔ لیکن اس امر کو سماجی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پانی پینا ایک ذاتی فعل ہے، لیکن محبت دو زندگیوں کے باہمی تعلقات کا نام ہے اور اس سے تیسری نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ لہٰذا سماجی اہمیت اور قومی فرض کے پیش نظر ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے مجھے پانی کے گلاس والے نظریئے سے کوئی دلچسپی نہیں حالانکہ اس پر "تسکین محبت" کا خوبصورت لیبل لگا ہوا ہے۔ بہرحال اس قسم کی محبت نہ کوئی نئی چیز ہے نہ اشتراکی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ گذشتہ صدی کے وسط میں رومانی ادب میں اس نظریئے کا پرچار "دل کی نجات" کے نام سے کیا جاتا تھا۔ لیکن عملاً یہ نظریہ نفس کی آزادی بن گیا۔ ان دنوں آج کے مقابلے میں نہایت ہی سلجھے ہوئے طریقے سے پرچار کیا جاتا تھا جہاں تک عمل کا سوال ہے میں کوئی فیصلہ نہیں دیتا۔"

جب لینن سے سوال کیا گیا کہ وہ کس حد تک جنسی آزادی کے مخالف ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

میری تنقید کا مقصد یوگ کا پرچار نہیں بلکہ ہرگز نہیں۔ اشتراکیت یوگ نہیں بلکہ زندگی کی مسرت اور قوت کا نام ہے اور مطمئن محبت کی زندگی اس کا موجب ہوگی۔ آج کل ہر کہیں جنسی معاملات پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ میری رائے

میں اس سے زندگی کو مسرت اور قوت حاصل نہیں ہوتی بلکہ چھنتی ہے۔ ایک عظیم انقلاب کے زمانے میں اس قسم کے رجحان کا پایا جانا بری بات ہے۔ بہت بری بات ہے۔ نوجوانوں کو خاص طور سے زندگی کی مسرت اور قوت کی ضرورت ہے۔ جنسی مسائل کے متعلق دائمی نظریوں، مباحثوں اور نام نہاد "جی بھر کے جینے" کے نظریئے کے مقابلے میں صحت بخش کھیل، مختلف قسم کی ذہنی دلچسپیاں تعلیم، مطالعہ، تحقیق وغیرہ نوجوانوں کے حق میں زیادہ مفید ہیں۔ جسم تندرست ہے تو ذہن بھی تندرست رہتا ہے۔"

جنسی تعلقات کے بارے میں اشتراکی ریاستوں کا سرکاری عندیہ کیا تھا۔ لینن کا مذکورہ جامع بیان اس کا آئینہ ہے۔ لہٰذا ان طویل بحثوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں جن کو لینن کے مختصر بیان نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ البتہ ہمیں ایک چیز ضرور ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اشتراکی پروگرام روس کے معاشرے کی اقتصادی اور سیاسی منصوبہ بندی تک محدود نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دور رس تھا۔

سوویٹ حکومتیں نہ صرف روزمرہ کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کا عزم کئے ہوئے تھیں بلکہ وہ خود انسان کی فطرت کو بدل دینا چاہتی تھیں۔ اس مقصد کو ماسکو سپورٹس کلب نے اپنے موٹو میں نہایت ہی ڈرامائی انداز میں پیش کر دیا تھا۔

"ہم اقتصادی بنیادوں پر محض انسانی معاشرے کی نئے سرے تشکیل نہیں کر رہے بلکہ ہم سائنسی اصولوں کے مطابق نئی نوع انسان کی اصلاح کر رہے ہیں"

ہم اس موٹو کے پہلے حصے کو ہرگز رد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آج ہم بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی اقتصادیات کو بدلنے کی ضرورت ہے لیکن سائنسی اصولوں کے مطابق بنی نوع انسان کی اصلاح ایک بالکل ہی مختلف مسئلہ ہے یہ چند الفاظ ان تمام فلسفیانہ اور اخلاقی خیالات کے آئینہ دار ہیں جن پر صدیوں سے بحث چلی آتی ہے۔

سب سے پہلے ——— اس موٹو میں یہ بتایا گیا ہے کہ نسل انسانی کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اس میں دعوے کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت بدلی جا سکتی ہے۔ آخر میں یہ عجیب و غریب خیال کہ سائنسی اصولوں کی مدد سے انسانی فطرت کو بدلا جا سکتا ہے یعنی انسانی فطرت کی اصلاح ایسے طریقوں سے کی جائے جنہیں پہلے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور درست ثابت ہوں تو بلا خوف ناکامی ان پر عمل کیا جائے۔

ہمیں محض فلسفے سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ہمارا تعلق حقائق سے ہے اور یہ امر واقعی ہے کہ انسانی تاریخ میں انسانی اخلاق کے بارے میں جو سب سے پہلا تجربہ کیا گیا اس کی بنیاد انہی تین اصولوں پر یقین محکم تھا جن کا ذکر ابھی ابھی اوپر کیا گیا ہے۔

ہمیں ان اصولوں کو فی الحال اسی حد تک تسلیم کرنا پڑے گا جہاں تک ہمارے ذاتی اعتقادات اجازت دیں۔ لیکن اگر ہم یہ جاننے کے لئے بے تاب ہیں کہ اشتراکی حکومتیں سماج سے جنسی بیماریوں، بدکاری، زنا اور شراب نوشی جیسی بدعتوں کو کس طرح ختم کرنے میں کامیاب ہوئیں تو ہمیں ذرا غیر جانبداری سے کام لینا پڑیگا۔

چلئے ! ہم دیانت داری سے غیر جانبدار ہیں لیکن اس خیال کو کیسے تسلیم کر لیں کہ سائنسی اصولوں کی مدد سے انسانی نسل کی اصلاح ہو سکتی ہے ؟

ہم نے وہ بڑی بڑی طبی مہمیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں جو ہمارے ملک میں بڑی شد و مد سے چلائی گئیں اور اگر یہ وہ جنسی بیماریوں پر قابو پانے تک محدود رہتیں لیکن فائدہ پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ اس کے بعد کسی ذمہ دار سائنس دان نے دوبارہ یہ جرأت نہیں کی کہ وہ بد اخلاقی کا واحد علاج محض تخیلات بتائے۔ پھر اشتراکیوں کی یہ خوش فہمی کہاں تک درست ہے کہ انجام کار بدی پر نیکی فتح پائے گی ؟

اشتراکی سائنس دانوں نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ بد اخلاقی دراصل ہے کیا چیز اور اس پر اسرار پردے کو چاک کیا جو گناہ کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

# سرمایہ داری نے محبت کو قابلِ احترام بنایا

شہوت ایک انسانی جبلت ہے۔ یہ بھوک اور پیاس سے اس لحاظ سے مشابہ ہے کہ یہ بھی اپنی تسکین چاہتی ہے لیکن علم حیات، فلسفے اور تاریخ کے روسی ماہرین نے اس گھٹیا مادی نظریئے کا تجزیہ کیا جسے لینن نے "پانی کے گلاس" والی تشبیہ سے یاد کیا تھا۔ تو وہ متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ شہوت اور پیاس میں ایک بنیادی فرق ہے۔ بچے میں جنسی خواہش پیدائش سے موجود نہیں ہوتی بلکہ رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے اور جوانی کے دنوں یعنی بارہ چودہ سال تک پوری ترقی کر جاتی ہے۔ جنسی خواہش کے جوان ہوتے ہی لڑکے اور لڑکی کے جسم اور ذہن میں نمایاں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ انسانی دماغ کی رنگ آفرینیوں، خیالات، تصورات اور سپنوں کے ذریعے جنسی تسکین کی لذت، مسرت اور آرزو بہت بڑھ جاتی ہے لیکن جسم کو زندہ رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ بھوک اور پیاس کی تسکین ہوتی رہے۔ جنسی

خواہش کی تکمیل کے جذبے کا یہ عالم نہیں۔ اس خواہش کی کبھی کبھار تسکین ہوتی رہے تو کافی ہے۔ لیکن نفسانی خواہش کا حیاتی مقصد بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ بوقت ضرورت اس خواہش کی تکمیل سے ہم والدین بنتے ہیں۔ انسان پیدا ہوتے ہیں اور انسانی نسل قائم رہتی ہے۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ اس طرح یہ حقیقت بھی سب پر آشکارا ہے کہ جنسی خواہش کی تکمیل سے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے اور انسان کا ذہن اس راحت کو اس قدر پرکیف اور گوناگوں بنا دیتا ہے کہ اسے بھوک اور پیاس سے تشبیہ دینا ناممکن اور غلط ہے۔

اشتراکی سائنس دان اس نکتے پر پہنچ کر اپنے پیش رو اخلاقی نظریہ بازوں سے الگ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جنسی مسئلے کو ابدی مسئلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دعوے کیا کہ جدید سماج کے افراد جنسی تعلقات کے اعتبار سے پرانے زمانے کے مردوں اور عورتوں سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنے آج ہم اپنے ہم عصر جانوروں سے۔

انہوں نے اس چیز کا ایک اچھوتا تصور پیش کیا جسے ہم "محبت" کہتے ہیں۔ انہوں نے محبت کی اس اور نئی تعریف کو کافی نہیں جانا کہ محبت محض ایک مسرت بخش خواہش کا نام ہے۔ ان کے خیال میں یہ تعریف تو محبت کی توہین کی مترادف تھی کیونکہ محبت اس سے کہیں افضل شے ہے۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں اشتراکی سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے کہ محبت کا جدید تصور انسانی سماج کی عظمت، ترقی پسندی اور انقلابی ارتقا کا مظہر ہے اور محبت کے مکمل شعور اور مسلسل عروج کی

بنیاد پر ہی اصل معنوں میں ایک، یا اخلاق سماج قائم کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بات کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ سائنس دان اٹھیں اور محبت کے متعلق نظریہ سازی شروع کر دیں۔ یہ تو ایک تضاد ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا ایک ماہر پروفیسر محبت کے متعلق وہ تخیل آرائیاں کر سکتا ہے کہ ہمارا ادراک وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ہم اشتراکی سائنس دانوں کے وسیع مطالعے اور تحقیق سے اہم نتیجے اخذ کریں تو ان کا خلاصہ کچھ اسی سے ملتا جلتا ہو گا۔

قدیم وحشی انسانوں میں جنسی تعلقات جانوروں کے سے تھے۔ قوت شہوی مرد کی امتیازی خصوصیت تھی اور عورت محض لذت کشی کا آلہ اور بچے جننے کی مشین تھی۔ قدیم مرد علم حیات کے حقائق سے بالکل بے بہرہ تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ عورت کیونکر حاملہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ والدینیت کی حقیقت سے بھی آشنا نہ تھا۔ یعنی وہ یہ نہ جانتا تھا کہ دو افراد مرد و عورت کے ملاپ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے اور دونوں کا اس پر برابر کا حق ہے۔ لہذا زمانہ وحشت کے ایک خاص سماجی گروہ کی عورتیں اس گروہ کے تمام یا اکثر مردوں سے وقتاً فوقتاً ملتی تھیں۔ یہ رواج وحشی سماج کی امتیازی خصوصیت تھا۔ لہذا تاریخ سے پہلے کی دنیا سے متعلق سب افسانے حماقت پر مبنی ہیں۔ قدیم مرد رومانی تصورات سے بالکل عاری تھا۔ اس کی عورت محض بچے جننے اور پالنے کی مشین تھی اور گھٹیا درجے کی محنت کش۔

اس ابتدائی قدیم سماج سے رفتہ رفتہ اس سماج نے جنم لیا جسے ہم عہد بربریت کہتے ہیں۔ اب صرف ایک ہی عورت سے شادی کرنے کا رواج پیدا ہوا اس رواج کی بنیاد علم حیات کے ابتدائی حقائق کے ادراک پر تھی۔ یعنی مرد اب

یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ ایک ہی عورت سے ملے تو بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اب بچہ نہ صرف عورت کا بلکہ مرد کا بھی تھا۔ لیکن عورت کی سماجی حیثیت ویسی ہی رہی پہلے وہ بہت سے مردوں کی ملکیت تھی۔ اب وہ ایک مرد کا مال بن گئی۔ وہ جسمانی اعتبار سے مرد کی مطلق غلام رہی۔ حتیٰ کہ اکثر بربر قبیلوں میں سخت محنت کا کام زیادہ تر عورت کو ہی کرنا پڑتا تھا۔

بربریت کے سماج کی کوکھ سے قدیم تہذیب نے جنم لیا۔ نہ صرف اشتراکی محققین بلکہ دوسرے ملکوں کے ماہرین بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کو بربریت سے آگے بڑھانے والی قوت محض ازدواجی رشتوں کا انقلاب نہ تھا بلکہ اس کے موجب اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ عوامل بھی تھے۔ یہاں ان سب پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قدیم مہذب سماج کے ارتقائی مظاہر بہت سادہ اور عام فہم تھے۔ یہ ابتدائی مہذب سماج پرانے قبائلی نظاموں کے مقابلے میں خوراک، رہائش، مکانات اور ملبوسات زیادہ پیدا کرتا تھا۔ اس کی اکثریت مفلس اور محنت کش تھی۔ چند لوگوں کو نسبتاً زیادہ فرصت اور امن چین کی زندگی نصیب تھی۔ ایسے لوگوں کے پاس اتنا وقت ضرور نکل آیا تھا کہ وہ فطرت کی پراسرار قوتوں کے بارے میں سوچ سکیں اور مختلف ناولیں گھڑ سکیں۔

قدرتاً جس چیز نے سب سے پہلے مرد کے دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ جنس تھی۔ انسانی تاریخ کے ماہرین نے ثابت کیا ہے کہ قدیم مرد جنس اور مذہب میں بہت قریبی رشتہ سمجھتا تھا۔ محبت کی دیوی زہرہ، اناج کی دیوی سیریز وغیرہ کی آفرینش اور فرائض کا تعلق جنسیات سے تھا۔ قدیم مذہبی رسومات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی زرخیزی، سورج کی زندگی بخش روشنی اور دوسرے مادی مظاہر فطرت کو پیچیدہ

اور مسرت بخش نفسانی جذبات اور پراسرار مادریت سے براہ راست وابستہ سمجھا جاتا تھا۔ آج ہم میں سے اکثر لوگ ان حقیقتوں سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ قدیم مذاہب اور آج کل کے مذہبوں میں بہت سی چیزیں مشابہ ہیں لیکن قدیم مذاہب روحانی تصورات اور عبادت کے طریقوں کے لحاظ سے بہت زیادہ مختلف تھے۔ قدیم اور جدید مذہب میں کتنی وسیع خلیج حائل ہے۔ یہ حقیقت عصمت فروشی کی اصلیت سے واضح ہے عصمت فروشی نے قدیم ترین زمانے کی عبادت گاہوں میں جنم لیا۔

زمانہ بربریت اور نیم مہذب دور کے مذہبی اصولوں کے مطابق تمام عورتوں کا فرض تھا کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک بار یا متعدد مرتبہ اپنے آپ کو مہنتوں کے حوالے کریں اس سے انحراف کی سزا عمر بھر کا بانجھ پن سمجھا جاتا تھا کیونکہ دیوتا ایسی نافرمان عورتوں کو سزا دے دیتے تھے کہ وہ عمر بھر اولاد کو ترسا کریں۔ مثال کے طور پر بابل میں رہنے والی ہر غریب اور امیر عورت کو زندگی میں ایک مرتبہ محبت کی دیوی زہرہ کے مندر میں سفر جانا پڑتا تھا۔ وہ عورت اس مندر کے باغ میں اس وقت تک انتظار کرتی جب تک کوئی اجنبی مگر ہم مذہب اس سے ہمکنار نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کے دل کو اس وقت تک قرار نصیب نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ اپنے مذہبی فریضے سے سبکدوش نہ ہو جاتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بعض اور بدصورت عورتوں کو بسا اوقات کئی سال تک مسلسل منتظر رہنا پڑتا تھا۔ جب کہیں جا کر وہ بڑی مشکل سے کسی پجاری کو بھوگ کرتے اور نجات بخشنے پر رضامند کر پاتی تھیں۔ لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس رسم پر سے مذہبی تقدس کا جھول بہت جلد اتر گیا۔

آخر مندر کی حفاظت اور پجاریوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا تھا ہر مرد کا مذہبی

فرض تھا کہ وہ مندر جائے تو چاندی کا ایک سکہ ضرور بھینٹ چڑھائے۔ یہ رواج بیشمار غلیظ اور غیر روحانی خیالات کا ذریعہ بنا۔ اولاً ایسے آدمیوں کی کمی نہ تھی جو چاندی کے سکے کے بل پر دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کر لیتے تھے۔ کیونکہ تجارت کا یہ طریقہ نہایت ہی سہل تھا۔ دوسرے اکثر عورتوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں مندر جائیں اور ہر مرتبہ نئے سے نئے پجاری کو ممنون کریں اور چاندی کا ٹکڑا بھی ساتھ لیتی آئیں۔

ظاہر ہے کہ بت پرست مہنتوں نے اس فاضل آمدنی سے بہت جلد اپنا حصہ مانگا۔ وہ کب دیکھ سکتے تھے کہ عورتیں ان کے مندر میں آئیں اور دیوتا کے درشن بھی کریں اور اشنان بھی، ہوتے ہوتے دیوتاؤں کی پوجا کا گھر سمت فروشی کا اڈہ بن گیا۔ مرد تو سیدھے اپنی خواہش کے لئے جاتے۔ عورتیں اور مندر کے لئے دھرتا دو پیسہ کماتے۔ عبادت گاہ چکلے میں بدل گئی۔

اس طرح یہ کاری ایک سماجی کاروبار بن گیا اور کئی صدیوں تک اس کی حیثیت نیم مذہبی اور نیم تجارتی رہی۔ موجودہ ہندوستان میں یہ رواج بعینہٖ آج تک چلا آتا ہے رومانی افسانوں کی ناچنے والی لڑکیاں، دیوداسیاں، یہ کردار زنا سائل سے مشابہ ہیں جو اپنے گاہکوں سے مندروں میں ملتی ہیں اور ہر ایسے آدمی کی دسترس میں ہیں جو دکشا دے سکے۔

عام لوگ جانتے ہیں کہ عیسائیت نے اس گندے رواج کو مغربی دنیا میں ہر کہیں منسوخ کر دیا لیکن اس سے زناکاری کا خاتمہ نہیں ہوا اگر کچھ ہوا تو صرف یہ کہ بدکار عورت کلیسا کی حدود سے نکل کر ایک تجارتی اور غیر مذہبی قسم کے مکان میں

جا بیٹھی۔ کافی عرصہ پہلے یہ تجربہ یونان میں آزمایا جا چکا تھا۔ قدیم یونانیوں کی شاعرانہ اور عالمانہ قابلیتوں کا احترام واجب ہے لیکن ہم اس دور کی زندگی کی اصلیت کا تجزیہ کرتے ہیں تو یونان کی کلاسیکی تہذیب کی بے پناہ تعریف و تحسین غیر متوازن سی نظر لگتی ہے۔ سپیس نامی عورت جسے دیکھتے ہی اس وقت کے بڑے فلسفی ڈیموتھینس پر الہام کی بارش ہونے لگتی تھی ایک کھلی فاحشہ تھی۔ اسی قسم کی عورت اسپاسیا تھی جس کا پجاری پیریکلس تھا۔ یہ عورتیں یونان کی چوٹی کی درباریوں میں سے تھیں۔ ان کے حسن اور قابلیت کی جس قدر بھی تعریف آج تک کی گئی ہے اس کے باوجود یہ گھناؤنی حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ سپیس، اسپاسیا اور دوسری درباریانہ نہیں روپے سے پیار کرتی تھیں۔ وہ اپنی ہم پیشہ عورتوں سے زیادہ باوقار اور اعلیٰ درجہ کی تھیں تو محض اس لئے کہ ان میں وہ خوبیاں موجود تھیں جن کے باوصف وہ زیادہ روپیہ طلب کر سکتی تھیں ان سے نچلے درجے میں ایسی عورتیں تھیں جو ان مردوں کا دل لبھاتی تھیں جو شائستہ بات چیت کی بجائے ناچ گانے کے زیادہ شوقین تھے۔ اس سے بھی نیچے ایک اور درجہ تھا۔ اس درجے کی عورتیں سب سے زیادہ غریب مردوں کی خدمت کرتی تھیں۔ ان طوائفوں کے پہلے درجے کو ہیٹی ری، دوسرے درجے کو ایلیو تریدی اور تیسرے درجے کو دکٹی ریادس کہتے تھے۔

یہ تھا یونان کا گندہ نظام جسے ڈکٹیٹرین سسٹم کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ نظام غیر مذہبی اور تجارتی تھا لیکن ایک بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ عصمت فروشی کے اس نظام کو اخلاقی اعتبار سے ہرگز برا تصور نہ کیا جاتا تھا جس وقت یونانی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ ان دنوں روم میں بھی زنا کاری کا ایسا ہی نظام قائم تھا جو

مکانات، باتھ یا حمام کے نام سے مشہور تھے۔ ان میں آج کل کے کوٹھوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ باتھ آراستہ پیراستہ ہوتے تھے۔ ان کا ماحول دلفریب اور فنکارانہ تھا اور ان میں حفظان صحت کی ہر سہولت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

عیسائیت نے زناکار عورتوں کو کلیسا سے نکال کر ایک طرح برا ہی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے بدکاری کے اڈوں کو کلیسا سے الگ کر کے ایک اخلاقی فتح حاصل کی لیکن زناکار عورت کو کلیسا سے نکل کر ہمیشہ کے لئے فحش اور بداخلاقی کی زندگی اختیار کرنا پڑی اور وہ سماج میں بیماریوں کا سرچشمہ بن گئی۔ ہوا یہ کہ بدکاری کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی اور فاحشہ عورتوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا زناکار عورت نے بظاہر سماج میں بدنام ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں سینکڑوں سال تک اس کے سماجی وقار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں زنا اس قدر عام تھا کہ یقین نہیں آتا تھا۔ چارلس بہادر کی فوج مشرق کے کافر اور بداخلاق لوگوں کے خلاف بڑی سج دھج سے جہاد کرنے نکلی تھی لیکن اس مقدس فوج کے ادنےٰ ملازموں اور خیمہ برداروں میں چار ہزار سے زیادہ فاحشہ عورتیں شامل تھیں۔ کھیل کود کے میلوں، عیدوں اور دوسرے مقدس موقعوں پر عیش و عشرت کا جو بازار گرم ہوتا تھا اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس سے جو صورت حال پیدا ہوئی وہ تاریخ طب کا ایک مستقل عنوان ہے۔ ہم یہاں اس کی تفصیلات میں میں جانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

تاہم اتنا بتا دینا ضروری اور مفید سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو ایک زمانہ کی حیثیت حاصل تھی اسے آخر ایک سماجی برائی کیونکر مانا جانے لگا۔ بارھویں صدی کے وسط

ہیں جرمنی اور انگریزی فوجوں نے مل کر لزبن پر چڑھائی کی تو فوجی افسروں نے دیکھا کہ عورتوں کے غول جو فوج کے ہمراہ ہیں وہ سپاہیوں کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے فوج میں زناکاری اور عصمت فروشی کے خلاف انہوں نے سخت قانون نافذ کرائے۔ مثلاً شاہ فریڈرک اول نے حکم دیا کہ آئندہ کوئی سپاہی اپنے کوارٹر میں عورت کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ جس کسی نے ایسا کرنے کی جرأت کی اس سے اسلحہ چھین لیا جائے گا اور اسے برادری سے خارج کر دیا جائے گا اور عورت کی ناک کاٹ لی جائے گی۔ لیکن عورتوں کو بدوضع بنا دینے کا یہ وحشیانہ اقدام بھی اسی طرح ناکام رہا جس طرح فوجی جرنیلوں کو بے عزت کرنے کی دھمکی اور پادریوں کے فتوے بے اثر ہوئے۔ لیکن فریڈرک کی مقرر کردہ سزاؤں کو وقتاً فوقتاً استعمال ضرور کیا جاتا رہا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آئندہ پانچ سو سال یعنی سترھویں صدی عیسوی تک یورپ کے جلاد عورتوں کی ناکیں کاٹنے میں مصروف رہے۔

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان عورتوں کو ناک کاٹنے کی سزا نہ دی جاتی تھی جو لیسوں سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کم از کم امن کے زمانے میں تو ایسا ہرگز نہ ہوتا تھا۔ پادری ڈیوڈ جولس نے ۱۱۸۰ء میں ایک اپیل میں بتایا تھا کہ ملکہ فرانس اور اس کے دربار کی دوسری عورتوں کو ایسا اوقات حسین و جمیل طوائفوں پر مسز بیویاں ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ بڑی الجھن میں پھنس جاتی تھیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر شاہ فرانس لوئیس سیزدہم نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے درباری طوائفوں کو لبادہ پہننے کی ممانعت کر دی گئی تاکہ انہیں آسانی سے پہچانا جا سکے۔

اس سے کوئی سو سال بعد تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ فوجی کیمپوں میں

زناکاری کسی طرح بھی کم نہ ہوئی تو یورپ کی فوجوں میں وہ نظام رائج ہو گیا جسے باضابطہ عصمت فروشی کہتے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک بعض جگہوں پر کئی مرتبہ اس نظام کی وکالت اور حمایت کی جاتی رہی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حکمرانوں نے اس سے بھی پہلے یہ طریقہ رائج کر دیا ہو۔ لیکن شاہ جرمنی، فریڈرک ثانی نے ۱۳۸۰ء میں اپنے مارشل کو حکم دیا کہ شاہی فوجوں میں دھندا کرنے والی عورت سے ایک مقررہ رقم وصول کی جایا کرے۔ اس کے بعد برطانیہ، فرانس، اٹلی اور ہالینڈ کے حکمرانوں نے مختلف افسروں کو ویسے ہی اختیارات دے دیئے۔ آج ہم ایسے احکام کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تفاوت راہ ابھی سو سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گذرا ہوگا کہ ایلبا کے ڈیوک نے ہالینڈ پر چڑھائی کی تھی تو اس کے ہمراہ سینکڑوں عورتیں تھیں جو شہزادیوں کے لباس میں ملبوس تھیں اور ان کی رانوں تلے نہایت ہی نفیس گھوڑے تھے۔ بہت سی عورتیں پاپیادہ تھیں اور سب کی سب فوجی وردی پہنے تھیں۔ ان کے پاس اپنے پرچم تھے جو اسی فوج کے جھنڈے سے مشابہ تھے جس سے وہ وابستہ تھیں۔ ڈیوک نے حکم دے رکھا تھا کہ جو سپاہی مقررہ رقم ادا کر دے اسے ٹھکرایا نہ جائے۔

برطانیہ سمیت یورپ کے تمام ملکوں میں عصمت فروشی کی تاریخ ایک ساتھ چلتی ہے۔ برطانیہ کے حکمرانوں نے حملہ آور رومیوں کے رواج کے مطابق پہلے پہل زناکاری کو باغوں، حماموں تک محدود رکھا۔ ہنری اوّل کے زمانے تک خاص طور سے وہ اڈے جو دریائے ٹیمز کے کنارے واقع تھے عیش و

نشاط کی دعوتوں اور جنسی رنگ رلیوں کے مرکز بن گئے تھے۔ ہنری دوم کو ان اڈوں پر کنٹرول کرنے کے لئے قانون بنانا پڑے۔ مثلاً مذہبی تہواروں کے موقعوں پر ان اڈوں کو بند کر دینے کا حکم تھا۔ ان اڈوں کے مالکوں کو کسی شادی شدہ عورت یا عیسائی پیراگن یا نن سے پیشہ کرانے کی ممانعت تھی۔ کسی عورت کو یہ پیشہ جاری رکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک خاص حکم یہ تھا کہ جو عورت اپنے گاہک کے ساتھ سادی رات نہ گذارے وہ کسی معاوضے کی حق دار نہ ہوگی۔

قرون وسطیٰ میں شہروں کی آبادی کے ساتھ قحبہ کاری بھی بڑھتی گئی۔ فوجوں اور قافلوں کو عورتیں سپلائی کرنے والے دھڑا دھڑ روپیہ کماتے تھے۔ اس وقت جو صورت حال تھی اس کی گواہی بہت سی دستاویزوں سے ملتی ہے جو اب تک محفوظ ہیں۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۱۴۸۱ء میں شہنشاہ سگمنڈ آٹھ سو سواروں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کے شہر برنی میں داخل ہوا تو برنی کی کونسل نے ازراہ مہمان نوازی کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ معزز مہمان اور ان کے ساتھیوں کو تین دن تک کھلی چھٹی ہے کہ وہ جس طوائف سے بھی چاہیں ملیں۔ یہ دعوت نہ صرف قبول کی گئی بلکہ بعد میں شہنشاہ نے نہ دل سے لکھ کر شکریہ ادا کیا۔

یہاں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جو صورت حالات ہمیں ناقابل برداشت اور مذموم معلوم ہوتی ہے ان دنوں اسے بداخلاقی پر مبنی تصور نہ کیا جاتا تھا بلکہ یہ رواج اس زمانے کے اخلاقیات کا ایک خاص جزو ہے۔ قرون وسطیٰ میں عصمت فروشی کو عام اخلاقی زندگی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ تاہم ایک عرصے سے حرام کاری

کو سماج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

تاریخ شاہد ہے کہ عصمت فروشی سماج کے مدارج ترقی کا پیمانہ رہا ہے اس سلسلہ میں جدید جاپان کی صورت حال زیر غور ہے۔ موجودہ جنگ کے دوران میں ٹھنگنے مہذب جاپانی نہایت ہی وحشی ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ مہذب لوگ بدمعاشی کے ہزاروں اڈوں کے مالک تھے اور یہ اڈے مقدس آسمانی شہنشاہ جاپان ہیروہیتو کی حکومت کے زیر نگرانی تھے۔ ان میں سے اکثر کو حکومت خود چلاتی تھی۔ صرف جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اگر کوئی مرد ایسی عورت سے شادی کرلے جو سالہا سال تک سربازار عامۃ الناس کی تسکین کرتی رہی ہو تو اس کے سماجی وقار اور قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہٹلر کے عہد حکومت میں جرمنی کی اخلاقی پستی بھی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اہل جرمنی کی اخلاقی بے راہ روی اور فحاشی صدمہ انگیز تھی۔ یہ معاشی کے اڈوں کی باقاعدہ تنظیم اور بڑے بڑے اخباروں میں فحش جنسی اشتہارات کی اشاعت جرمنی کی عام اخلاقی گراوٹ کی آئینہ دار تھی۔ جاپان اور جرمنی کی اخلاقی پستی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ ملک غلام داری کی طرف مائل ہیں بلکہ اس وقت سے بھی گئے گزرے ہیں۔

جاپانی اخلاقیات کے بارے میں بے حد خرافات سننے میں آئی ہیں جنگ بحرالکاہل کے دوران چند اتحادی افسروں نے نہایت سنجیدگی سے اطلاع دی تھی کہ جاپان کی جیشا گرلز، ناچنے والی دوشیزائیں، طوائفیں ہرگز نہیں بلکہ وہ شریف خاندانوں کی لڑکیاں ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں مختلف اداروں میں ملازمت کرتے

والی لڑکیاں ہیں۔ عرصہ ہوا کہ جاپانی اخلاقیات کے بارے میں آبہر ترزے نے اپنی تصنیف "یوشی وارا" میں تفصیلی حقائق پیش کئے تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ جاپان میں عام چکلوں کو یوشی وارا کہتے ہیں۔ مختلف درجوں کے لحاظ سے ان کے مختلف نام ہیں۔ ان چکلوں کو عام طور پر حکومت چلاتی ہے یا پھر مندروں کے مہنت۔ یہ رسم صدیوں پرانی ہے اور اپنی موجودہ صورت میں قرون وسطیٰ کی رسم کی زندہ مثال ہے۔ اس رسم میں آج تک کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

حکومت جاپان ان اڈوں کے لئے کم سن لڑکیوں کو خریدتی ہے اور انہیں اپنے پیشے کی تعلیم دیتی ہے۔ دیوالیے اور فاقہ زدہ کسان عموماً اپنی لڑکیوں کو برضا و رغبت فروخت کر دیتے ہیں۔ لڑکیوں کو ان کے خدوخال اور عقل و فہم کے مطابق مختلف طبقوں کے مردوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ سب سے اعلیٰ حسین بچیوں کو خاص توجہ سے تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں لکھنا پڑھنا، شعر و شاعری، موسیقی و رقص اور آداب محفل خاص طور سے سکھائے جاتے ہیں۔ پڑھائی بیسواکے کوٹھے میں ہوتی ہے اور عموماً سب سے بوڑھی طوائف استانی کے فرائض سر انجام دیتی ہے لیکن کم سن لڑکیوں کو چودہ سال کے سن سے پہلے عملاً پیشہ شروع کرنے کی قانوناً ممانعت ہے۔ ایک اور قانون کے مطابق طوائف کو صرف اس صورت میں چکلہ چھوڑنے کی اجازت ہے جب کوئی مرد اسے اپنی بیوی بنانے کے لئے خریدے۔ اس مقصد کے لئے ہر شخص کسی طوائف کو خرید سکتا ہے۔ جاپانی زبان میں کسی کا ہم معنی کوئی لفظ نہیں۔ اس کے برعکس پیشہ ور عورت کو "وقتی بیوی" یا "ایک گھنٹے کی بیوی" کہا جاتا ہے۔ پیشہ ور عورت کو "دلدل کے

کنول" سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

ٹوکیو کے جدید شہر کا یوشی وارا یا ہیرا منڈی درحقیقت "دلدل کا نیستاں" ہے شاعر لوگ اسے "وادیٔ مسرت" کہتے ہیں۔ شہر کے اس حصے میں ایک پل کے ذریعے داخل ہوتے ہیں جو خندق نما گڑھوں پر سے گزرتا ہے اس بازار کے دروازے پر یہ کتبہ آویزاں ہے۔

"اِک خواب بہاراں کہ گلیاں چیری کے پھولوں سے لبریز ہیں"

یوشی وارا کے قوانین میں ۱۸۵۷ء میں ترمیم کر دی گئی اور بڑے بڑے چکلے کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ نئی چھلہ کوٹھیاں جو امیروں اور فوجی افسروں کے لئے مخصوص ہیں اچھے خاصے محل ہیں۔ انہی کے نقشے پر جاپان کے دوسرے شہروں میں چھلہ کوٹھیاں تعمیر کی گئی ہیں لیکن ٹوکیو کی چھلہ کوٹھی دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ہزاروں نوجوان لڑکیاں زرق برق لباس پہن کر خوبصورت پردوں کے پیچھے بیٹھی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک فرنگی کے دماغ میں وکٹوریائی عہد کا ایک مشہور گیت ——— "سنہری پنجرے کی چڑیا" تیرنے لگتا ہے۔ اعلےٰ ترین چکلوں میں حسین ترین "پنجرے" ہیں۔ حال ہی میں یہ فیشن چل نکلا ہے کہ اعلےٰ درجہ کی چھلہ کوٹھیوں کے مالک رائیگروں کے سامنے لڑکیوں کی بجائے ان کی تصویروں کی نمائش کرتے ہیں۔ یوشی وارا کے اندر ہر گاہک کو کئی طرح کی رسومات ادا کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے پیش نظر بعض سادہ لوح فرنگی یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ یہ محض سماجی یا تفریحی ادارے ہیں۔ بہرحال ایک گھنٹے کی بیوی" کو حاصل کرنے کے لئے ایک سجے سجائے کمرے میں بیٹھ کر تامرو پیام شروع کیا جاتا ہے۔ جہاں اعلےٰ چکلوں کے مالک ضرورت

مند گاہکوں کو اپنے "ہیروں" کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے پاس اپنے مخصوص نشانات اور ہیں جو باہر محراب پر لٹکتے رہتے ہیں۔ تاہم سستے چکلے اس قسم کے تکلفات سے بری ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں عصمت فروشی کا نظام اس قدر گھٹیا اور غلیظ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کی مثال نہیں۔ جیشا گرل عموماً اوسط درجے کی صاحب عقل اور تربیت یافتہ لڑکی سے بلند تر طوائف ہوتی ہے۔ قصہ کوتاہ جاپان کے نظام بدکاری میں یونانی نظام کے خدوخال بھی ملتے ہیں اور قرون وسطیٰ کے نظام کے بھی۔

قرون وسطیٰ کے اختتام پر یورپ میں عصمت فروشی کے خلاف بے پناہ تحریک پیدا ہوئی اور اس رواج کو بداخلاقی کی علامت تصور کیا جانے لگا۔ بے شمار سائنس دانوں نے اس تبدیلی کے محرکات اور وجوہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں اس ذہنی انقلاب کا موجب مردوں کے دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات کی پیدائش، تعلیم کی ترقی مذہب، جنسی بیماریوں کی روک تھام کی ضرورت وغیرہ ہے لیکن اشتراکی سائنس دانوں نے اس تبدیلی کی تفتیش کی تو انہوں نے جو سبب دریافت کیا وہ دوسرے سائنس دانوں کے خیال سے مختلف بھی ہے اور حیران کن بھی۔ ان کے خیال میں محبت کے متعلق جدید تصور پیدا ہونا اور بدکاری کے خلاف سماجی احتجاج کا آغاز ہونا یعنی اس انقلاب کا محرک محبت کا نیا نظریہ ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ سائنس کو ایک ایسے جذبے سے کیا واسطہ جو وہبی یا جبلی ہے؟ کیا مرد اور عورت ازل سے ایک دوسرے پر عاشق نہیں ہوتے آئے۔

اشتراکی سائنس دان جواب دیتے ہیں کہ آج ہم جس چیز کو "محبت" کہتے ہیں وہ

انسانی زندگی کا ایک بالکل نیا عنصر ہے۔ سب سے زیادہ حیران کن ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے جدید اقتصادی نظام یعنی سرمایہ داری نے جاگیرداری نظام معیشت پر فتح پاکر دائمی محبت کا تصور پیدا کیا اور محبت کو ذلت کے گڑھے سے نکال کر قابل احترام درجہ عطا کیا۔ اس نے محبت کو ایک ایسا اخلاقی رشتہ بنا دیا جو بدکاری کا مزاحم ہے۔

جن طریقوں سے اشتراکی حکومتوں نے بدکاری پر فتح پائی۔ ان کو سمجھنے کے لئے مذکورہ بالا غیر معمولی نتیجے کا ادراک ضروری ہے۔ اشتراکی سائنس دانوں کی معلومات اتنی مشکل نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکیں۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بربریت ہی کے عہد میں صرف ایک عورت سے شادی کرنے کی رسم پیدا ہو چکی تھی۔ قدیم تہذیب کا آغاز ہوا تو اس نظام شادی میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہوئی۔ تاریخ انسانی کے اشتراکی ماہرین بھی اس بات پر دوسرے تاریخ دانوں سے متفق ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں یک زوجیت پیدا ہوئی، وہاں عصمت فروشی بھی پہلو بہ پہلو جاری رہی۔ بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ یونانی اور رومی تہذیبوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی عورت پر کفایت کرنے کا محرک ایک خاص اقتصادی مقصد تھا۔ قانون نے یک زوجیت کو اسی لئے مسلمہ قرار دے دیا کہ شوہر کی جمع کی ہوئی تمام پونجی اس کی وفات کے بعد چند وارثوں میں آسانی سے تقسیم کی جا سکے اور خاص طور سے ان بچوں میں تقسیم کی جائے جو اس کی جائز بیوی کے پیٹ سے ہوں۔ اس اقدام کا اصل مقصد حرام کی اولاد کو حق وراثت سے محروم کرنا تھا۔ تاکہ دولت محض اعلیٰ طبقوں کے ہاتھوں میں جمع رہے۔ ہمارے خیال کے برعکس یک زوجیت

ایک مرد کے ایک ہی عورت سے عشق کے جذبے پر مبنی نہ تھی۔ یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یونان و روم کے مہذب و موقر مرد اپنی معشوقاؤں سے شادی کرنے کی آرزو تک نہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس وہ فیشن کے طور پر ایسی ناقابل شادی عورتوں سے محبت کرتے تھے جو ان کی ہم مذاق ہوتی تھیں۔

قدیم دنیا کے مردوں کے لئے شادی ایک قانونی ضرورت تھی۔ اس کی بدولت وہ جائیداد اور دولت حاصل کرتے تھے، جسے وہ اپنی جائز بیویوں کی اولاد کے نام منتقل کرتے تھے لیکن غریب مرد کے نزدیک شادی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اسے ایک خادمہ اور بچے پالنے والی عورت مل جاتی تھی۔ البتہ تمام مرد اپنی خواہش کی تسکین غیر عورتوں سے کرنے کی خواہش کیا کرتے تھے یہ رواج عین اخلاق سمجھا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی شادی سے صرف عورتوں پر پابندی تھی۔ مرد کو قانونی اور اخلاقی طور پر اپنی منکوحہ عورت کے علاوہ مال خرید کر کے ہر عورت سے مباشرت کرنے کا حق حاصل تھا لیکن عورت پر پابندی تھی۔ زنا کار عورت کے لئے سخت ترین سزا کا حکم تھا۔ منکوحہ عورت کا اپنے جائز شوہر کے علاوہ دوسرے مرد سے تعلق قائم کرنا بداخلاقی تھی، کیونکہ اس طرح خاوند کی جائداد حرام کی اولاد کے ہاتھوں میں چلے جانے کا خطرہ تھا اور حرام کی اولاد حق وراثت سے قانوناً محروم تھی۔ تاہم مرد کے لئے زنا کاری اخلاقاً جائز تھی۔ چارلس بہادر یا شہنشاہ سگمنڈ پیرامنڈی میں ہفتوں گزار سکتے تھے انتہا یہ ہے کہ یونان کے شاعر سپس جیسے لوگ شاہدان بازاری کی محبت کے نغمے کھلم کھلا گاتے تھے۔ ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ صدمہ انگیز بات یہ ہے کہ زمانہ قدیم اور قرون وسطیٰ میں عصمت فروشی کوئی گناہ نہ تھی۔ اس کے برعکس اسے سماج

کے لئے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے عیسائیت نے بھی اسی قسم کے اخلاقی نظام کو اپنایا، جس کی بنیاد ملکیت کے قانونی رشتوں پر تھی۔ اس قسم کی قانونی وراثت کی سب سے ترقی یافتہ صورت بادشاہوں کا آسمانی حق تھا۔ گویا رفتہ رفتہ زمین اور دولت کے حق وراثت میں اعلیٰ سیاسی اقتدار کا حق بھی شامل کر لیا گیا اور آخر کار جاگیرداری نظام کا تمام سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ سخت قسم کی وراثت پر کھڑا کیا گیا۔ بادشاہ کے تخت و تاج کا مالک اور اس کا جائز فرزند شہزادہ ہوتا تھا۔ ڈیوک، یا نواب اپنی جاگیر اپنے جائز فرزند کے نام منتقل کرتا تھا۔ جبرئیل کی اولاد ہی جبرئیل کہلا سکتی تھی اور پسماندہ زرعی غلام ہمیشہ کے لئے اپنے باپ، کے جھونپڑے سے بندھا رہتا تھا۔ قرون وسطیٰ کے صنعتی دستکار بھی شادی اور وراثت کی پابندی حسداً کرتے تھے۔ ہم پیشہ ماہر دستکار اپنی اپنی تنظیمیں بناتے تھے، جنہیں گلڈز کہتے تھے اور وہ اپنا ہنر اپنی اولاد کے سوا دوسروں کو نہ سکھاتے تھے۔ نہ صرف اپنی برادری اور طبقے سے باہر شادی کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ محبت کی شادی بھی منع تھی۔ ہر لڑکی کی شادی کا بندوبست اس کے اپنے طبقے میں پیشہ ور دلالوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات بادشاہ وقت بھی دلالی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ عورت کی ذاتی پسند کا خیال شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ اس کی رضا ایک رسمی سی بات تھی۔ اکثر اوقات لڑکی اپنے خاوند کی شکل پہلی مرتبہ نکاح کے دن ہی دیکھتی تھی۔

لہٰذا اس زمانے میں وہ اہم انسانی جذبہ جسے محبت کہتے ہیں قانونی اعتبار سے مسلمہ نہ تھا۔

نکاح کے وقت ہر لڑکی کو تاکید کی جاتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے مرد واحد یعنی اپنے خاوند کی وفادار رہے۔ قانون اور مذہب اس کی وفاداری کے ضامن ٹھہرتے تھے۔ اگرچہ لوگ جانتے تھے کہ عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کی محبت میں گرفتار ہو سکتی ہے لیکن وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ ادھر اس کے ہرجائی خاوند کے آوارہ جذبات کی تسکین کے لئے عورتیں فوج در فوج موجود تھیں۔

اس کے باوجود قرونِ وسطیٰ میں عورت کی محبت، وفاداری اور شرافت کا گہرا احساس پیدا ہوا۔ شاعروں اور داستان سراؤں نے عورت کی پاک محبت کی نغمہ سرائی شروع کر دی اور عشق بازی یا شولری پیدا ہوئی۔ اس کے بارے میں وکٹوریائی ادب میں جو کچھ بنایا جاتا ہے اس سے وہ بالکل مختلف شے تھی۔ اس کا مطلب سنگ دل مردوں کے ظلم سے مقدس نسوانیت کا دلیرانہ تحفظ نہ تھا بلکہ وہ جبر کی شادی کے خلاف عورت کی حقیقی اور رومانی محبت کا اظہار تھی۔ صاف لفظوں میں مرد کا اس عورت سے محبت کرنا جو اسے دل سے چاہتی ہو، خواہ اس کی شادی ایک ایسے مرد سے کر دی گئی ہو جس سے وہ نفرت کرتی ہو۔ عشق بازی یا شولری ہے۔

محبت کے جدید نقطہ نظر کے پیش نظر ہمیں عشق بازی محض ہوس پرستی اور زنا کا بہانہ معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ پرلے درجے کی بداخلاقی تھی لیکن یہ خیال غلط ہے ہم اسے اپنے سماجی معیاروں پر نہیں پرکھ سکتے۔ درحقیقت یہ ایک نئے اور طاقت ور اخلاق کی ابتدا تھی کیونکہ اس نے یہ سوال کیا کہ عورت کو اپنی جذباتی

پسند کے آدمی سے محبت کرنے کا حق ہے نہ کہ ایک ایسے مرد سے جو اس پر ریاست یا کلیسا کی طرف سے مسلط کیا جائے۔

اس نئے رجحان نے ایک طرف عورت کے حق محبت کا پرچم بلند کیا اور دوسری طرف مردوں پر بھی خوشگوار اثر ڈالا۔ اس نے مردوں میں محبت کی روحانی قوت کا شعور پیدا کیا۔ اس نے اس قسم کی شادی کا عیارانہ پردہ چاک کر ڈالا جسے دوسرے طے کریں اور بدکاری کے تمام عیوب کو فاش کر دیا۔ شولری بہادری تھی کیونکہ اس نے عورت کو محبت میں وہ بلند مقام عطا کیا جس کی وہ مستحق تھی۔ یہ عین اخلاق تھا۔ کیونکہ اس نے ثابت کر دیا کہ مرد بھی وفادار اور جاں نثار ہیں اور وہ عورت کی مخلص محبت کے مستحق ہیں۔ قرون وسطےٰ کے زمانہ کی نئی اور عظیم دریافت یہ تھی کہ مرد و عورت ایک دوسرے کو چاہتے ہوں تو کسی دوسری جگہ قانونی شادی کے باوجود ایک دوسرے کے جذبات شوق کا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ مرد و عورت محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں تو وہ مرتے دم تک ایک دوسرے کے وفادار رہتے ہیں۔ ان کے لئے قانون و رواج کی زنجیروں کی ضرورت نہیں۔

شولری نے عورت کو قانونی اور جبری شادی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے ایک ایسے مرد سے نجات دلانے کی کوشش کی جسے اس نے خود اپنا ساتھی منتخب نہ کیا تھا۔ اس ریت نے اس کے ساتھ ہی مردوں کو غیر عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم کرنے کی لعنت سے چھڑایا اور یہ بات اس کی اخلاقی عظمت کی دلیل ہے۔

قرونِ وسطیٰ کی تمام شاعری محبت کے اس نئے نظریئے کی تعریف سے بھری پڑی ہے۔ ساتھ ہی اس زمانے کی تاریخ شاعروں پر ظلم و تشدد کے واقعات سے بھی بھرپور ہے۔ تاہم یہ نیا رجحان ایک نئے اخلاقی نظام کی حیثیت سے ابھر نہ سکا۔ صدیوں تک اس میں شہوت پرستی کی چاشنی نہ رہی۔ لہٰذا کلیسائے وقت کو اس پر پورے غضب اور شور سے حملہ کرنے کا اخلاقی موقع مل گیا تھا۔

لیکن اس رومانی محبت کی مخالفت کا اصل سبب کچھ اور تھا۔ اقتصادی حرکات، سرمایہ داری اور اس کا جمہور دوست فلسفہ جاگیرداری نظام پر کاری ضرب لگا رہا تھا۔ جاگیرداری کی اخلاقی اور قانونی پشت پناہ، دوسروں کی طے کردہ شادی، وراثت کا سخت رواج اور بدکاری تھی۔ رومانی محبت نے جاگیردارانہ سماج کی جڑوں پر ایک مزید ضرب لگانے کی کوشش کی۔ لہٰذا جو شاعر رومانی محبت کے گیت گانے کی جرأت کرتے تھے انہیں ہر وقت اپنی زبان کے کٹ جانے، شکنجے میں کس دیئے جانے یا سربازار پھانسی کے تختے پر لٹکا دیئے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔

تاہم نئی اخلاقی محبت کو پوری طرح کچلا نہ جا سکا اور ایک وقت ایسا آیا کہ شیکسپیئر اس مسئلے کو لندن میں کھلے اسٹیج پر پیش کرنے لگا۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی ناقد ایسا نہیں کہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ "رومیو اینڈ جیولٹ" اپنے وقت کا ایک سیاسی ڈرامہ تھا اور اس کی اثر انگیزی بے پناہ تھی۔ اس کا موضوع اب متروک ہے۔ لیکن عہدِ حاضر کے شائقین کے لئے ایک ایسا عظیم المیہ ہے جو

رومانی اور اخلاقی محبت کے سوال کو آزادانہ پیش کرتا ہے اور اپنے معشوق سے شادی کے حق انسانی کا پرچم بلند کرتا ہے۔ شیکسپیئر نے بے مثال فن کاری سے ثابت کیا کہ عاشق اپنے معشوق کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ شاعر اس سے پہلے بھی شاہان یا زادی یا دوسرے کی بیوی سے مرد کی آزاد محبت کے ترانے گا چکے تھے۔ لیکن "رومیو اینڈ جیولیٹ" میں نئی بات یہ تھی کہ اس نے حاضرین کو دو ایسے کشتگان محبت پر خون کے آنسو رلائے جنہیں آپس میں شادی کرنے کے حق سے جبراً اور تادم مرگ محروم رکھا گیا۔

آج ہم اس حق کو بلا چوں وچرا تسلیم کرتے ہیں۔ اشتراکی تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ محبت کی شادی کا حق اپنے زمانے میں ایک انقلابی نظریہ تھا۔ ان کا دعوے ہے کہ قرون وسطیٰ میں شادی ایک سیاسی معاہدہ رہی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ جاگیردار اور نواب غلاموں اور شہزادوں کے مقابلہ میں اپنی طاقت مجتمع کرلیں۔ محل میں محبوس شہزادی سے لے کر کھیت سے پالیستہ غلام لڑکی تک اس مقصد کا بے بس آلہ تھی۔

غرضیکہ قرون وسطیٰ کا اخلاقی نظام ایک طرف مردوں کے لئے کھلی زنا کاری کو ضروری قرار دیتا تھا اور دوسری طرف جبری شادی کی شکار معصوم عورت کو محبت جتانے کے خیال تک سے بھی منع کرتا تھا۔

اخلاقیات کے اشتراکی ماہرین نے ایک اور حیران کن نتیجہ نکالا۔ وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داری، جاگیرداری پر مکمل فتح حاصل کر چکی تو اس کے بعد کہیں محبت

کی شادی کا امکان پیدا ہوا۔ جس چیز کو ہم آزاد تجارت کہتے ہیں اس نے اخلاقیات پر دیرپا اثر چھوڑا۔ جمہوریت کے نظریئے نے سب سے پہلی مرتبہ شخصی آزادی کے سوا اتھ ایک بنیادی اور اخلاقی اصول کی حیثیت سے پیش کیا اور کہا کہ تمام انسانوں کو ہر قسم کے عمل کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ ہر انسان اپنی پسند کا لباس پہنے، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرے اور اس پر ذات پات اور اونچ نیچ کی پابندی نہ ہو۔ اس کی سماجی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو وہ آزادی سے روپیہ کما سکے اور جہاں جی چاہے جا کر آباد ہو جائے۔ یہ خیالات اپنے زمانے میں انقلابی تھے۔ ان اصولوں کے زیر اثر عیسائیت میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ تاہم ایسے علمائے دین کی کمی نہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم میں آزادی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کسی انسان کو ایسا فعل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جس کے بارے میں اس کا ضمیر گواہی دے کہ وہ کام خدا کی نظروں میں برا ہے لیکن قرون وسطیٰ میں ایسا خیال یقیناً کفر والحاد تھا۔ جاگیرداری و کلیسا اس قسم کے آزاد خیالات کے سراسر مخالف تھے کیونکہ ان دونوں کی بنیاد پیدائش سے موت تک ہمہ گیر جبر پر تھی۔ جونہی پرانے نظام کو زوال آیا قانون، مذہب اور اخلاق میں بنیادی تبدیلیاں آ گئیں۔

سب سے پہلے سرمایہ داری نے شادی کو ایک اخلاقی رشتہ بنایا اور اسی سلسلے میں ہر قسم کے جبر کا خاتمہ کیا۔ اس سے پہلے شادی ایک کھلا سودا تھی جس کو بزرگ طے کرتے تھے اور اجنبی روحوں کو زنجیروں میں جکڑ دیتے تھے۔ جمہوریت کے نظریئے کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھا کہ سماج میں تمام کاروباری ٹھیکے یا

سمجھوتے طرفین کی رضامندی سے طے پاتے ہیں تو دو انسانوں کو اپنی رضامندی اور آزادی سے شادی کرنے کی اجازت کیوں نہ ملنا چاہیئے۔ یہ سمجھوتہ توسب سے زیادہ مقدس ہے۔ اس میں دو جسم اور دو جانیں عمر بھر کے لئے اپنی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔ اس لئے لوگوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ محبت کی شادی کریں اور ہر وہ شادی خلاف اخلاق ہے جس کی بنیاد باہمی محبت پر نہ ہو۔

ہمیں یہ اقدام دلیرانہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمیں ایسے مرد یا عورت سے نفرت یا ہمدردی کرانا سکھایا گیا ہے جو کسی مصلحت کی بنا پر مخالف صنف سے محبت کے بغیر شادی کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آسانی سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جمہوری اخلاقیات کی بنیادی اہمیت کیا ہے اور یہ قدیم اخلاقیات سے کتنے متضاد ہے۔

اشتراکی محققین اس اخلاقی انقلاب کی توجیہہ یوں کرتے ہیں کہ سرمایہ داری جمہوریت نے جنسی تعلقات میں جو دور رس اصلاح کی اس سے شادی کے نظام میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی البتہ عورت کی سماجی حیثیت میں ضرور انقلاب آیا۔ عورت کے اس حق کو قانونی اور اخلاقی اعتبار سے جائز سمجھ لیا گیا کہ وہ محبت کرنے پر بھی عزت و احترام کے قابل ہے۔

ہمارے ہاں کے اخلاق پرستوں نے ہمیں آج تک اس تاریخی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا بلکہ اس میں بھی شبہ کی گنجائش ہے کہ ان میں اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت ہے بھی لیکن اشتراکی محققین نے اس تحقیق کو اتنا اہم جانا کہ انہوں نے اخلاقی نظام کا ڈھانچہ ہی اسی بنیاد پر کھڑا کیا ـــــ کیوں؟

اس لئے کہ اولاً اس تحقیق سے اس مسلمہ فریب کی قلعی کھل گئی کہ محبت

شادی اور اخلاق آغاز تہذیب سے لے کر آج تک کم و بیش غیر متبدل رہے ہیں لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ نہ صرف اخلاق بدلے ہیں بلکہ ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا کہ سرمایہ داری اور جمہوریت کے عروج کے وقت جو اخلاقی اقدار پیدا ہوئیں وہ پرانے اخلاقی اقدار کی ضد ہیں۔

جاگیرداری کے زمانہ میں محبت یا پسند کی شادی کا خیال تک گناہ تھا ہمارے نظریئے کے مطابق محبت کے سوا کسی اور وجہ سے شادی کا خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جاگیرداری عہد میں بڑے بڑے راہنما بدکاری کے اڈوں کی کھلے بندوں سرپرستی اور تحسین و توصیف کرتے تھے اور اس بات کو شیطانی فعل تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اس پر نہ سماج نکتہ چینی کرتا تھا نہ کلیسا۔ لیکن جمہوریت کے استحکام کے ساتھ ہی منظم بدکاری سماجی اعتبار سے ناقابل برداشت ہو گئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس قدر تبدیلی محبت، جنس اخلاق اور گناہ کے نظریات اور ان سے متعلق انسانی عمل میں پیدا ہوئی ہے کسی اور شعبے میں نمودار نہیں ہوئی۔

تاریخی تحقیقات سے دوسرا نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ اخلاقیات کو کسی معیار سے بھی جانچیں ان میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ اس بات پر ایک مادہ پرست سائنس دان اور ایک پادری دونوں متفق ہیں۔ لیکن دونوں کے دلائل مختلف ہوں گے۔ اخلاقی ترقی کا سبب بیان کرتے وقت سائنس دان کی نظر میں انقلاب فرانس سے پہلے کے یورپ میں آتشک کی عام وبا سے پیدا شدہ صورت حال ہو گی تو پادری کے ذہن میں عورتوں کی وہ فوجیں ہوں گی جو قرون وسطےٰ میں زندگی بھر عصمت فروشی پر مجبور تھیں۔ بہرحال آج انسانیت ماضی کے

مقابلے میں بہت زیادہ یا اخلاق ہے۔

ہمارا تیسرا اور آخری نتیجہ عورتوں کی موجودہ حیثیت سے متعلق ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سب سے پہلے سرمایہ داری دور میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی مرد سے کسی عورت کو محبت کرنے پر بھی عورت کی ذات قابل احترام ہے اور اسے محبت کی شادی کا حق حاصل ہے لیکن اشتراکی ماہرین نے عورت کے اس حق کا تجزیہ کیا تو انہیں اس کی خامیاں بھی فوراً معلوم ہو گئیں۔ عورت کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا حق قانونی ڈگریوں کے ذریعے نہیں مل سکتا۔ قانونی اعتبار سے جب تک کوئی عورت آزادی سے اپنی رضا کا اظہار نہ کرے اسے شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور بس۔ آج کل تقریباً تمام مہذب ملکوں میں ایسے قانون موجود ہیں لیکن کوئی قانون اس امر کی ضمانت نہیں دیتا کہ عورت محض محبت کی بنا پر شادی کرنے کی مجاز ہے کیونکہ اس قسم کی آزادی کا تقاضا ہے کہ عورتیں سماجی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہوں اور مردوں کے برابر ہوں۔ کیا وہ ہیں؟

نومبر کے انقلاب کے بعد یہ حقیقت بہت جلد آشکارا ہو گئی کہ اشتراکی حکومت کے کاغذی اعلانوں میں تو عورتوں کو مساوات حاصل ہے لیکن وہ عملاً مردوں کے برابر نہیں۔ اس عدم مساوات کا ایک سبب تو ہمیں اپنے تجربے سے معلوم ہے آزادی محبت کے نئے رجحان کو ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ گورکی اور لینن نے بری طرح رد کیا تھا۔ اس برے رجحان کا مقصد یہ تھا کہ "پانی کے گلاسوں" یعنی "عورتوں کو پینے والوں" یعنی مردوں کی طرح شہوت پرستی کی آزادی ہو جائے۔ ایسی آزادی دراصل ایک شیطانی فعل تھا۔ اگرچہ بعض روسی عورتوں نے جو جنسی اختلاط کی

عملاً حامی تھیں۔ اپنے آپ کو نہایت "انقلابی" ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن ان پر زندگی کی ایک بنیادی اور عام حقیقت جلدی ہی آشکارا ہو گئی۔

علم حیات کا یہ اصول تمام قوانین اور اخلاقیات پر بھاری ہے کہ عورت اور مرد جسمانی اعتبار سے برابر نہیں۔ اس لحاظ سے عورتوں کو مردوں پر فضیلت حاصل ہے مباشرت سے دونوں کا مقصد صرف وقتی تسکین ہوتا ہے لیکن بچے کی پیدائش، انسانی نسل کی بقا اور خاندان کا وجود ایسا افضل ترین فریضہ صرف عورتیں ہی ادا کر سکتی ہیں۔ اور معاشرہ اس فضیلت کو عملی زندگی میں کس طرح تسلیم کرتا ہے۔ مادریت پر سخت سزائیں عاید کر کے۔

عورت حاملہ ہو جائے تو اپنے کام کاج سے بھی جائے۔ بچے کی پیدائش کے وقت عورت کو جو جسمانی تکلیف ہوتی ہے اسے وہی جانتی ہے۔ معصوم بچوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے تو عورت۔ جس طرح آج ہمارے ملکوں میں دستور ہے اسی طرح بداخلاقی کے خاتمے سے پہلے روس میں بھی کوئی عورت ماں بن، یعنی اولاد کی پرورش کا بوجھ صرف اسی صورت میں ہلکا کر سکتی تھی، جبکہ وہ اپنے اوپر ایک مرد یعنی شوہر کا مکمل قبضہ تسلیم کر لے۔ عورت شادی کر کے دوسرے کی دست نگر بن جاتی ہے، لیکن مرد اس پابندی سے آزاد ہے۔

لہٰذا ان حالات میں اصناف کی برابری کا دعوے خالی لفاظی ہے۔ تسلیم کہ جمہوریت اور سرمایہ داری نے عورت کو ایک ایسے مرد سے شادی کرنے کی مذموم پابندی سے نجات دلائی جس سے اسے کوئی محبت نہ ہو۔ یعنی عورت کو ایک ایسا خاوند قبول کرنے سے آزادی مل گئی جسے اس نے منتخب نہ کیا ہو بلکہ جاگیردارانہ

اصولوں کے مطابق دوسرے لوگوں نے چنا ہو لیکن عورتیں حق مادریت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ تو ان میں سے اکثر کے راستے میں ہزاروں قسم کی سماجی اور معاشی رکاوٹیں تھیں۔ شادی کر کے اسے آزادی جیسی مقدس چیز کی قربانی کرنا پڑتی تھی۔ عورتوں کے تمام نجات دہندوں اور حامیوں کی سب کوششیں اس لئے ناکام رہیں کہ ہمارے سماج میں عورت جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ان کی ہیئت اقتصادی ہے اور حیاتی حقائق کے فولاد سے گھڑی گئی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہٹلر کے عہد حکومت میں جرمنی کے اخلاق پرستوں نے جدید عورت کی پس ماندگی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ خود ہمارے ہاں کے رجعت پسند حضرات نازیوں کے اس نعرے میں بہت زیادہ کشش محسوس کرتے ہیں کہ "عورتوں کو ـــــ انہیں بچے عطا کر دو۔ کھانا پکانے کے آہنی چولہے دے دو اور کلیسا بخش دو"

ہٹلر کے اس گھسے پٹے جاگیردارانہ اصبہ العین کو قدیم مذہب کا درجہ عطا کرنے سے کافی عرصہ پہلے اشتراکی ماہرین سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد میں مکمل مساوات نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جدید دنیا میں بداخلاقی کا بنیادی سبب ہی عدم مساوات ہے۔

# سوال نامہ

لیڈی اودلارڈ پاس فیلڈ نے اپنی مشہور کتاب "سوویت اشتراکیت، ایک نئی تہذیب" میں سوویت یونین کا مفصل حال بیان کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "لینن اور اس کے ساتھیوں نے روسی قوم کی اصلاح کا کام آدم کی بجائے حوا سے شروع کیا۔" اس پر بھی اشتراکی رہنماؤں نے کبھی بڑ نہیں ماری کہ وہ صنف نازک کے نجات دلانے والے ہیں۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کو اس قسم کے ادنیٰ حقوق تک محدود نہیں رکھا کہ عورتیں اونچی قمیض پہنیں چاہے نیچی۔ وہ لمبے بال رکھیں چاہے چھوٹے یا وہ سرعام سگریٹ پی سکتی ہیں اور قانون کے آگے مردوں کے برابر ہیں انہوں نے جہاں عورتوں کے عام مردوں سے تعلقات کی مخالفت کی وہاں مردوں کے اس "حق" کی بھی مخالفت کی کہ وہ عام عورتوں سے جنسی تعلقات رکھ سکتے ہیں خاص بات یہ ہے کہ سوویت یونین میں عورتوں کی آزادی کا پروگرام صرف عورت کو پیش

نظر رکھ کر نہیں بنایا گیا بلکہ عام انسانیت کی بھلائی کے لئے تیار کیا گیا۔

اشتراکی سائنس اس نتیجے پر پہنچی کہ نسل انسانی کی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مرد اور عورت کے درمیان مساوات قائم نہیں ہو جاتی۔ انہوں نے بد اخلاقی اور حرام کاری پر حملہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ انسانیت ناقابل تقسیم ہے اور کسی ایک طبقے کی اصلاح الگ سے ممکن نہیں۔

سوویت یونین سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آج سے پچیس سال پہلے لینن نے اعلان کیا تھا کہ عورتوں کا مسئلہ انہیں عدم مساوات کی ذلت سے چھڑانے تک محدود نہیں بلکہ ان اہم مسئلوں میں سے ایک ہے جن سے آج تک کی دنیا دوچار ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوویت یونین کے وسیع علاقے میں سب سے پہلے اسلامی ریاستوں میں اصلاح کا کام شروع کیا گیا اور دوسرے سیاسی فریضوں پر عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کو ترجیح دی گئی۔

اس سلسلہ میں جو عملی اقدام اٹھائے گئے وہ ایک مدت سے سوویت یونین کے قانون میں شامل ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) عورتوں کو رائے دینے اور تمام سرکاری اداروں کے لئے منتخب ہونے کا حق دیا گیا۔ اکثر مہذب ملک اس حق کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن عملاً اسے نظرانداز کر جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عورتیں رائے دے سکتی ہیں، لیکن تمام قانون مرد ہی بناتے ہیں اور وہی ان پر عملدرآمد کراتے ہیں۔

(۲) تمام قانونی فرائض اور شہری حقوق عورتوں اور مردوں میں برابر تقسیم کئے گئے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت اور مرد کو عدالت کے سامنے برابر کی ذمہ داریاں

اور حقوق دیئے گئے۔

(۳) ہر ایسے شخص کے لئے سخت سزائیں مقرر کی گئیں جو عورت کو کسی طرح اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر مجبور کرے۔ اس سزا سے والدین کو بھی بری نہ کیا گیا۔ اس قانون میں اس کے سوا کوئی خاص انقلابی بات نہ تھی کہ اس پر سختی سے عملدرآمد کرایا گیا۔ ہمارے ہاں ہولناک قسم کے جسمانی تشدد کی صورت میں ہی ایسے قوانین کا سہارا لیا جاتا ہے۔

(۴) عورت کی مکمل معاشی آزادی کے تحفظ کے لئے بیسیوں قوانین بنائے گئے اور احکام جاری کئے گئے۔

ہمارے ملکوں میں بیاہی ہوئی یا کنواری عورتوں کے حق ملازمت کے تحفظ کے لئے شاید ہی کوئی قانون بنایا گیا ہوگا۔ لیکن سوویت یونین میں عورتوں کو ملازمت کی ضمانت حاصل ہے جس کا تحفظ قانون کرتا ہے۔ بظاہر یہ امتیاز مصنوعی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم نے کم از کم جنگ کے دوران میں تو دیکھا ہے کہ عورتوں کے لئے ہر کہیں ملازمت موجود تھی لیکن یہ صورت حال مردوں کی انتہائی قلت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور سال ہی میں عورتوں کو گھر واپس بلانے کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ اس تحریک کا محرک یہ خدشہ ہے کہ جنگ کے بعد کے زمانے میں تمام مردوں کے لئے کام مہیا نہیں کیا جا سکے گا اور ہمارے ہاں یہ اصول مسلمہ ہے کہ کام کی قلت کے دنوں میں مردوں کو عورتوں پر ترجیح دی جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے ٹریڈ یونین اس جدوجہد میں تو کامیابی حاصل کر چکے ہیں کہ محنت کش عورتوں کو ایک جیسے کام کا مساوی معاوضہ ملنا چاہیئے لیکن صنعتی اداروں

ہیں بچہ گھروں کے قیام کے مطالبے کی فوری ضرورت کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی تاکہ ان ہیں محنت کش مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ سکیں اور بے فکری سے اپنا کام کر سکیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ عورتیں کارخانوں سے دور ہی رہیں۔

سوویت یونین کی عورتوں کی موجودہ نسل ملازمت کے بارے میں بالکل مختلف نظریہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مردوں کے بالکل برابر سمجھتی ہیں۔ اشتراکی ملکوں میں مرد اور عورت کو ملازمت کا حق دینے کی محرک معاشی ضرورت سے زیادہ اخلاقی اہمیت تھی۔ اشتراکی سائنس دان اور سیاست دان جانتے تھے کہ عورت کی آزادی کی تمام باتیں اس وقت تک فضول اور بے کار ہیں جب تک ان پر معاشی پابندیاں عائد ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں یہ احساس بھی تھا کہ عورتوں کو معاشی مساوات کا درجہ "قلم کے ایک جھٹکے" یا "قانون کے نفاذ" سے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ بدکاری کے تمام مسائل ابھی جوں کے توں باقی تھے۔

اشتراکی انقلاب کے چار سال بعد ۱۹۲۱ء میں دیکھا گیا کہ قوم میں بدکاری پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ صورت حال اس عام بحران کا نتیجہ تھی جو غیر ملکی حملہ آور فوجوں کے خلاف طویل جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت باقاعدہ منصوبہ بندی پر عمل نہ ہو سکتا تھا۔ بے روزگاری بہت بڑھ گئی تھی۔ بے کاروں میں دو تہائی تعداد عورتوں کی تھی۔ ملک جنگ سے تباہ حال تھا اور خاص طور سے عورتوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

دو سال تک حرام کاری بتدریج بڑھتی گئی۔

اشتراکی سائنسدان ۱۹۲۳ء میں اس قابل ہو گئے کہ بدکاری کے خلاف عام مہم کا آغاز

کر سکیں۔ انہوں نے حرام کاری یہ پہلا وار کیا تو ملک میں سنسنی پھیل گئی۔ اس قسم کی کوشش آج تک کہیں نہ کی گئی تھی۔ اس مہم کا آغاز ایک مطبوعہ سوال نامے سے کیا گیا۔ یہ سوال نامہ ہمارے ہاں کے گیلپ پول کی طرح نہ تھا۔ بلکہ اسے خفیہ طور سے کئی ہزار عورتوں اور لڑکیوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ سوالات دونوں صنفوں سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں، ماہر نفسیات، ٹریڈ یونین رہنماؤں اور دوسرے ماہرین نے تیار کئے تھے۔

ان سوالات کو تمام تر دہرانا یہاں ممکن نہیں۔ ان سب کا واحد اور غیر معمولی مقصد یہ تھا کہ ان حالات کا پتہ لگایا جائے جن کے تحت عورت اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔

اپنے طرز کا یہ پہلا تجربہ تھا جو اس مقصد کے پیش نظر کیا گیا کہ عورتیں زناکار کیوں بن جاتی ہیں۔ مرد اس دلچسپ سوال کو سینکڑوں سال سے اٹھاتے آئے تھے۔ اس مسئلے سے متعلقہ ادب مشہور پیشہ ور عورتوں کے سنسنی خیز اعترافات سے بھرپور ہے اور زیادہ تر ایسے رنگین اور مفصل بیانات پر مشتمل ہے جو بالکل اعتماد کے قابل نہیں علم طب اور نفسیات کے ماہرین نے گناہ کے نظریوں کے متعلق مسلسل قیاس آرائیاں کی تھیں۔ لیکن سوویت یونین میں اس اہم سوال کا جواب چند بداخلاق نوجوانوں سے سوال و جواب کے ذریعے یا ان کے نفسیاتی تجزیے سے حاصل نہیں کیا گیا بلکہ ایسی بے شمار عورتوں سے بلاواسطہ سوال کئے گئے جو ہر عمر، ذات اور سماجی حیثیت سے تعلق رکھتی تھیں۔ تمام جواب تحریری تھے اور پوری طرح خفیہ رکھے گئے تھے۔

اس عجیب وغریب سوال نامے سے قدیم مسلمہ اعتقادات کا بھرم کھل گیا چونکہ عورتوں کو پوری طرح یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی رائے بالکل پوشیدہ رکھی جائے گی اس سوال کا جواب جس آزادی سے دیا گیا اس پر خود اشتراکی رہنما حیران رہ گئے۔

اس رائے شماری سے جو چونکا دینے والا نتیجہ نکالا گیا وہ یہ تھا کہ پیشہ ور عورتوں اور عام عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ بیاہی ہوئی اور کنواری دونوں قسم کی عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے انکشاف کیا کہ وہ ایک نہ ایک وقت پر خاص حالات کے تحت زنا پر مجبور ہو چکی ہیں۔

بعض نے اطلاع دی کہ انہیں صرف ایک مرتبہ زنا کے تلخ تجربے سے گزرنا پڑا اور بعض نے بتایا کہ وہ کئی بار ایسا کر چکی ہیں۔ بعض نے تسلیم کیا کہ وہ زندگی میں کئی بار مختلف مدتوں کے لئے پیشے پر گذران کر چکی ہیں۔ تاہم وہ طوائف کا لیبل لگنے سے محفوظ رہی ہیں۔ بعض عورتوں اپنی دوسری ہمراز عورتیں کے تجربے کے پیش نظر یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ وہ اپنے آپ کو پیشہ ور کہیں یا نہ، جن عورتوں نے زنا کاری کا اعتراف کیا ان کی ایک بھاری اکثریت نے بیان کیا کہ ان کی جائز آمدنی بہت قلیل تھی اس لئے وہ بدکاری کے ذریعے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئیں تاکہ وہ خود اور ان کے بال بچے اچھی زندگی بسر کر سکیں۔

ہم آگے چل کر اس بے نظیر مشاہدے کو ذرا تفصیل سے بیان کریں گے چونکہ اشتراکی ماہرین کے اخذ کردہ نتیجے ان نتائج کی ضد تھے جو ہمارے ہاں کے سائنس دان یا ماہرین اخلاقیات نکالتے رہے ہیں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ دیر ٹھہر کر اس مشاہدے سے پہلے کی تحقیقات کا اجمالی تجزیہ کریں۔

طوائف کی اصلی تعریف کیا ہے؟

عام طور سے اس ترکیب کا اطلاق ایسی عورتوں پر کیا جاتا ہے جو روپے کے عوض اپنا جسم مختلف آدمیوں کے پاس بیچیں لیکن جس وقت سے جدید سماجی تحقیق پیدا ہوئی ہے۔ طوائف کی مذکورہ تعریف کو تسلی بخش نہیں مانا جاتا۔ تمام یا اختیار حضرات متفق ہیں کہ جنسی بیماریوں کو جگہ جگہ پھیلانے والوں میں دو تہائی تعداد ایسی لڑکیوں کی ہے جنہیں اصلی معنوں میں طوائف نہیں کہا جا سکتا۔ وکٹری گرلز تو شوقین پیشہ ور عورتوں کا ایک ہی طبقہ ہے۔ ہم اس مسئلے کی دوسری انتہا کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ماہرین نفسیات نے ایسے تمام جنسی تعلقات کو زناکاری کا نام دینے کی کوشش کی ہے جو دو ایسے افراد کے درمیان پائے جائیں جنہیں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو۔

لیکن یہاں بھی حقائق ہمیں عجیب الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ امریکی تحقیقات اور اشتراکی سوال نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی بڑی تعداد جس قلیل معاوضے پر اجنبی مردوں سے محبت کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ اس کی قدر شام کی تفریح کے اخراجات سے کسی صورت بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ اخلاقی نقطہ نظر سے دو ایسی لڑکیوں میں کس طرح سے تمیز کی جا سکتی ہے، جن میں سے ایک اپنے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر چند ڈالروں پر محبت کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور دوسری محبت میں نقدی کے دخل کو بھیانک تصور کرنے کا بہانہ کرتی ہے لیکن نہایت چالاکی سے ایک پُرتکلف دعوت اور سینما کے تماشے کی صورت میں معاوضہ قبول کرتی ہے۔ ایسی دو لڑکیوں میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ غریب لڑکی ایماندار ہے، کیونکہ دونوں صورتوں میں محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں مذہبی نقطہ نظر یہ ہے کہ شادی کے بغیر ہر قسم کا جنسی تعلق بداخلاقی کی دلیل ہے خواہ اس کا محرک محبت ہو یا روپیہ۔ یہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ سوویت یونین

میں بھی سالہا سال سے جنسی تعلقات کے بارے میں یہی نقطہ نظر پایا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں کے پادری اور سوویت یونین کے کمیونسٹ رہنما اپنے اپنے اخلاقی نظریوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ نظریہ وہی سچا جو عمل میں درست ثابت ہو۔ جنگ کے دوران میں جن لوگوں کو روس جانے کا اتفاق ہوا انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ روس میں آج کل ایسی عورت ناپید ہے جو اپنے خاوند کے سوا کسی غیر آدمی سے کسی قسم کا قریبی تعلق قائم کرنے کا خیال تک گوارا کرے۔ انتہا یہ ہے کہ روس کی نوجوان نسل کئی سال سے باہم چہل بازی کو بھی برا خیال کرتی ہے اور ان کے فلم، اخبار اور اشتہار تک کسی قسم کے جنسی اشارے سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری جمہوریتوں اور اشتراکی جمہوریتوں میں جو فرق ہے وہ نہایت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔

آیئے ہم اس فرق اور تضاد کو مکمل کر دیں۔ اس سے انکار نہیں کہ اکثر لوگ شادی کو ایک مقدس سماجی رواج تصور کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ابدی ہے اور اس طریقے سے جنسی تعلقات جائز ہیں۔ خواہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے مسلسل محبت کرتے رہیں یا نہ۔ بلکہ اکثر مذہبوں میں تو محبت کے ختم ہو جانے پر بھی شادی برقرار رہتی ہے۔ ہر باشعور عورت نصف درجن کے قریب ایسی مثالوں کے نام گنوا سکتی ہے جو محض اس لئے شادی میں بندھی رہتی ہیں اور اپنے خاوند کی اطاعت کرتے پر مجبور رہتی ہیں کہ ان کے لئے کوئی راہ نجات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اور اس کے بچے معاشی اعتبار سے شوہر کے غلام ہیں۔ کیا ایسی رشتہ داری کی کوئی اخلاقی بنیاد ہے۔ جدید ماہرین نفسیات

کے قریب اس قسم کی شادی عورت کے لئے بدکاری کے مترادف ہے کیونکہ اس کا نتیجہ کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا۔ سوویت یونین کے باشندے ایسی شادی کو انتہائی بداخلاقی اور بدکاری کی دلیل تصور کرتے ہیں۔

ذاتی عقائد کا احترام مسلم، شادی کے مسئلے کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو بھی اعلےٰ اخلاقی معیار کا تقاضا ہے کہ ایسے تمام افراد کے درمیان جنسی تعلقات ناجائز ہیں جنہیں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو اور ایسے تمام طریقے قابل نفرت ہیں جن میں کسی نہ کسی صورت میں نقدی کا استعمال کرنا پڑے۔ ہم اسی موقف سے بداخلاقی کے خلاف جدوجہد کا تجزیہ کریں گے۔

جب تک سرمایہ دارانہ جمہوریت نے جاگیرداری نظام کا خاتمہ نہیں کر دیا اس وقت تک حرام کاری کے خلاف جدوجہد نام کو بھی نہ تھی۔ دراصل عصمت فروشی کے خلاف منظم جدوجہد کا محرک محض اخلاق نہ تھا بلکہ جنسی بیماریوں کو روکنے کی ضرورت بھی تھی۔ یورپ میں آتشک کا مرض سولہویں صدی میں رونما ہوا۔ غالباً یہ مہلک بیماری ہیٹی سے یورپ میں آئی۔ امیر مگیو دیسپگی کی سوانح عمری گذشتہ صدی کے دوران میں چھپی۔ اس میں اس مرض کا ذکر ہے جسے ہم "فرانس کی پیداوار" کہتے ہیں۔ اس نے دعوےٰ کیا کہ یہ مرض وہ ملاح امریکہ سے یورپ لائے جو کولمبس کے ساتھ واپس لوٹے۔ وہاں سے یہ بیماری طوائفوں میں پھیلی پھر سپین بھر میں پھیل گئی اور چارلس ہفتم کی فوجوں کے سپینی سپاہی اس بیماری کو اٹلی لے گئے۔ دوسرے تاریخ دان بھی شہادت دیتے ہیں کہ چارلس کی فوجوں نے ۱۴۹۵ء میں آٹھ دن تک نیپلز کی فتح کی خوشی منائی تو اس کے

بعد یہ مرض عام ہوگیا۔ ایک غیر مصدقہ حکایت میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یوطوالفین آتشک میں مبتلا تھیں۔ انہیں دشمن کے ایسے سپاہیوں میں جسمانی تباہی پھیلانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو اس وقت تک اس آفت سے ناواقف ہوتے تھے۔

بہرحال اٹھارہویں صدی کے اواخر تک تمام سرکاری اور مذہبی لوگ اس نئی مصیبت پر چوکنے ہوگئے تھے اور جنہیں یہ ہولناک مرض لاحق ہو جاتا تھا انہیں مجرم گردانا جاتا تھا۔ شہنشاہ میکسی ملین نے ایک حکم نافذ کیا جس میں آتشک کو "بولسٹی ملیٹرن" یعنی ایک ایسی مصیبت کہا گیا جسے پہلے کسی نے دیکھا نہ سنا۔" فوجوں نے اس ہولناک پلیگ کو فرانس اور جرمنی میں پھیلا دیا آتشک زدہ لوگوں کے ساتھ نہایت ہی وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ عورتوں کو جسمانی ایذا دی جاتی تھی اور انہیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ ہر بیمار مرد اور عورت کو کوڑھیوں کی طرح دھتکارا جاتا تھا۔ انہیں گھروں سے نکال دیا جاتا تھا اور شہروں اور قصبوں سے دور باہر رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چند سال کے عرصے میں یہ مرض تمام یورپ اور جزائر برطانیہ میں پھیل گیا۔

آئندہ صدی کے دوران میں جنسی بیماریوں کی مصیبت پر فوجی افسر خاص طور سے چوکنے ہوگئے۔ مسلح فوجوں کے ساتھ جو عورتیں ہوتی تھیں ان پر سخت نئی پابندیاں لگائی جاتیں۔ ۱۵۱۵ء میں فرانسس اول نے حکم دیا کہ تمام بیمار عورتیں سپاہیوں کے ساتھ پیدل چلیں۔ ان کو زین اور گھوڑے دے کر ان کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ ۱۵۸۰ء میں بلجیم کے متقی بادشاہ البرٹ کو اس مرض کے

خلاف طبی تدابیر اختیار کرنا پڑیں ـــــ اور متاثر عورتوں کا فوجوں میں داخلہ سختی سے بند کر دیا گیا۔ تاہم اس وقت تک اس مرض کی تشخیص بہت ہی بھدی اور ناقابل اعتبار تھی۔ غالباً سب سے زیادہ خطرناک عورتوں کی کبھی شناخت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ البرٹ کی طرح شاہی احکام کی خلاف ورزی پر آئے سال سخت سے سخت سزا دی جانے لگی۔ قانون کی رو سے آتشک کے مریض مجرم تھے۔ اخلاقی لحاظ سے انہیں کھلا گناہ گار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ رویہ محض وسواس پر مبنی تھا کیونکہ مہذب اور عالی وقار خاندانوں کے بہت سے مرد اور عورتیں بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ سزا صرف ان بدنصیبوں کو دی جاتی تھی جو روپے اور سماجی وقار سے اپنا تحفظ کرنے کے ناقابل تھے۔ پولیس سینکڑوں سال تک مرض اور مریضوں کے صفائے کے لئے وقتاً فوقتاً منظم حملے کرتی رہی۔ جلادوں کو حکم دے دیا جاتا تھا کہ طوائف کی ناک کاٹ دی جائے اور بعض اوقات ناک کے ساتھ کان بھی کٹوا دیئے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شرابی سپاہیوں کی قطاریں کھڑی کر دی جاتیں جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہوتے۔ طوائفوں کو ان کے درمیان دوڑنے کا حکم دیا جاتا اور سپاہی انہیں ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیتے تھے۔

بد اخلاقی کے خلاف قدیم قوانین میں بادشاہ لوئیس کا آرڈی ننس مجریہ مارچ ۱۷۶۹ء سب سے زیادہ عدیم المثال ہے۔ اس آرڈی ننس کے مطابق پیشہ ور عورتوں کو گرفتار کیا جاتا تھا اور انہیں تین مہینے تک صرف سوکھی روٹی اور پانی پر گذارہ کرنے کی سزا دی جاتی تھی اس کے بعد انہیں اس وقت تک

قید میں رکھا جاتا جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کر لیتیں۔ اس قید کی کوئی میعاد مقرر نہ تھی۔ یہ سزا مقابلتاً کم وحشیانہ تھی۔ اس میں مزید رعایتیں یوں کی گئی کہ قید کے دوران میں زنا کار عورتوں کا بھی علاج کیا جاتا، جس کا تمام تر خرچ فوجی خزانے سے ادا کیا جاتا تھا۔ چونکہ ان دنوں ابھی آتشک کا کوئی موثر علاج دریافت نہیں ہوا تھا اس لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ بدنصیب عورتوں کو اس اقدام سے کیا فائدہ پہنچتا تھا۔ اگر کوئی عورت کئی مرتبہ گرفتار کی جاتی تو اس کی قید میں پہلے کی نسبت زیادہ توسیع کر دی جاتی تھی لیکن لوئیس نے عورتوں کی جسمانی سزا اور انہیں سرعام رسوا کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اس وقت کے کلیسیت زدہ حضرات کے خیال میں عورتوں کے ساتھ اس غیر معمولی ہمدردی کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ کے ہاں اکثر درباری عورتیں ہوتی تھیں جن کے دام میں خطاب یافتہ منصب دار پھنسے ہوئے ہوتے تھے۔

جنسی بیماریوں کی روک تھام کے لئے مزید جو کچھ کیا گیا، اس کی تفصیل انقلاب فرانس کے مشہور مہندس، کارنٹ کی رپورٹ میں موجود ہے۔ کارنٹ نے ۱۷۹۳ء میں ڈوئی کے کیمپ میں تقریباً تین ہزار عورتیں دیکھیں۔ اس نے آتشک کی بھیانک تباہی کا مشاہدہ کیا اور لکھا کہ اس مرض نے اس تعداد سے تقریباً دس گنا زیادہ مردوں کو مفلوج کر دیا، جتنے دشمن کی گولیوں سے ناکارہ ہوئے تھے۔ طبی سفارشات پر عمل نہیں کیا جاتا تھا اور نپولین کے عہد حکومت میں عورتوں کو دوبارہ وحشیانہ سزائیں دی جانے لگیں تھیں۔ یونا پارٹ نے بدکار اور بیمار عورتوں کے خلاف بہت سے احکام جاری کئے۔

لن احکام میں عام طور سے یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ بدکار عورتوں کے سروں کے بال کاٹ دیئے جائیں اور ان کا منہ کالا کر کے بازاروں میں پھرایا جائے تاکہ پبلک ان کا مذاق اڑائے اور لوگ عبرت پکڑیں۔ تاہم اس اثنا میں علم طب میں تھوڑی بہت ترقی ہوئی اور بعض مقامات پر مقامی مجسٹریٹوں کو بیمار عورتوں کے لئے طبی مرکز کھولنا پڑے۔

۱۸۱۱ء میں جرمن فوج کے راسٹوک ہیڈ کوارٹر میں ایک طبی مشن مقرر کیا گیا۔ یہ سب سے پہلا کمیشن تھا جسے ایک مخصوص علاقے کی تمام عورتوں کا معائنہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کمیشن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بیمار عورتوں کے والدین سے اخراجات وصول کرنے کا مجاز تھا یا وہ ان لوگوں سے بھی خرچ وصول کر سکتا تھا، جو پیشہ ور عورتوں کے لئے مکان کرائے پر لیتے تھے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد آتشک کی روک تھام کے لئے ریاست کی طرف سے باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں ۱۸۳۵ء میں جرمنی کی پولیس ایسے تمام اشخاص کی نگرانی رکھتی تھی جن پر آتشک کے مریض ہونے کا شبہ ہو۔ اس پر بھی کچھ نہ بنا تو کابینہ نے زیادہ موثر اقدام کیا۔ اس نے حکم دیا کہ برلن کے تمام چکلے اٹھارہ مہینے کے اندر بند ہو جانے چاہئیں اور اکثر بند بھی ہو گئے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ جو سپاہی برلن کے علاقہ میں مقیم تھے ان میں آتشک کا عارضہ تیزی سے پھیلنے لگا۔ لہٰذا فوجی کمان افسر رینگل نے ۱۸۴۸ء میں مجبوراً اپیل کی کہ چکلے دوبارہ کھول دیئے جائیں۔

اس کے بعد جرمنی اور براعظم یورپ کے دوسرے ملک کبھی اس انتہا کی طرف مائل ہو جاتے کبھی اس انتہا کی طرف مائل۔ کبھی پیشہ ور عورتوں کو نکال باہر کیا جاتا اور چکلے بند کر دیئے جاتے۔ کبھی پولیس کے مقرر کردہ ڈاکٹروں کی زیر نگرانی وہی اڈے پھر کھول دیئے جاتے۔

برطانیہ کا تجربہ خاص طور پر بصیرت افروز ہے۔ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جس میں باقی تمام ملکوں سے بعد میں محسوس کیا گیا کہ آتشک کے خلاف زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کا سبب برطانیہ کی روائتی قدامت پسندی نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ دولت مشترکہ کے طبی ماہرین یورپ کے تجربوں کا مشاہدہ کر چکے تھے اور انہیں ان تجربوں کی کامیابی پر بالکل یقین نہ تھا۔

تاہم جون ۱۸۶۶ء میں بعض بحری اور فوجی سٹیشنوں پر چھوت کی بیماری کو زیادہ موثر طریقے سے روکنے کے لئے ایک قانون پاس کیا گیا، جسے عرف عام میں "دباؤ امراض" کا قانون کہتے ہیں۔ اس قانون نے پولیس کو اختیار دے دیا کہ وہ مشکوک عورتوں کو ڈاکٹروں کے پاس جبری معائنے کے لئے لے جا سکتی ہے اور ضروری سمجھے تو انہیں علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس قانون کے پاس ہونے کے بعد سپاہیوں اور جہازیوں میں آتشک کی وبا گھٹ گئی۔ لیکن پارلیمان نے کسی واضح سبب کے بغیر آٹھ سال کے بعد اس قانون کو منسوخ کر دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز سے عین پہلے مشہور انگریز ڈاکٹر سر ولیم آسلر نے چند مشہور طبی ماہرین کو ایک خط پر دستخط کرتے پر ابھارا اور اس خط کو وہ

"ٹائمز" میں شائع کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس خط میں تنبیہ کی گئی تھی کہ آتشک کی بیماری پھیل رہی ہے۔ اس خط کو پڑھ کر برطانیہ کے لوگ سکتے میں آ گئے کیونکہ یہ پہلا خط تھا جو انگریزی بولنے والی دنیا میں اس بیماری کے متعلق شائع ہوا تھا اور جس میں نئی بیماری کو ٹھیک آتشک کا نام دیا گیا تھا۔ اس خط کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسکوتھ کی حکومت نے جنسی بیماریوں سے متعلق مشہور سڈرن ہام رائل کمیشن مقرر کیا۔

اس کمیشن نے اپنی رپورٹ جنگ کے دوران میں پیش کی۔ اس نے آسلر کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ انگلستان کی کم از کم دس فیصد آبادی آتشک میں مبتلا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ سوزاک کی مریض ہے۔ آتشک سے ہر سال تقریباً تربیسٹھ ہزار انگریز ختم ہو رہے ہیں اور تپ دق اس سے بھی زیادہ اموات کا باعث ہے۔ آج بھی اس صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

جنسی وبا سے متعلق نظریوں میں جس سست رفتاری سے ترقی ہوئی ہے اسے دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ابھی لوگ حال ہی میں جنسی بیماریوں سے متعلق کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ جدید ماہرین کا خیال ہے کہ اس بیماری کے متعلق صحیح علم اس لئے دیر بعد ہوا کہ اس سلسلے میں ظاہری شرافت اور مذہب حائل رہا اور اس بیماری کو روکنے کے لئے سائنٹفک اقدامات بہت دیر بعد کئے گئے۔ علاوہ ازیں وہ اوہام کو بھی اس کا موجب سمجھتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ علم طب کے سائنٹفک بن جانے کے کافی عرصہ بعد تک جنسی زندگی کے تمام پہلوؤں کے

بارے میں سائنٹیفک علم پیدا نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان کو مجامعت اور پیدائش کا صحیح علم ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔

یونانی تہذیب سے پہلے بچے کی پیدائش کو مافوق الطبیعاتی مظہر خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن یونانی فلسفیوں نے جن کی قوت مشاہدہ اور عقل کو رومانی تاریخ دانوں نے درجے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اس قیاس کو صرف اتنی ترقی دی کہ انہوں نے بچے کی پیدائش کا معجزہ خداؤں سے چھین کر ماں سے منسوب کر دیا۔

بقراط نے اپنی مشہور تصنیف "انسان کی فطرت میں" جو چار سو سال قبل المسیح لکھی گئی، قیاس آرائی کی کہ بچے کی پیدائش زنانہ و مردانہ "بیجوں" پر منحصر ہے لیکن اس نے اس خیال کو ماہواری حیض کے ساتھ بری طرح گڈمڈ کر دیا۔ ارسطو نے اس خیال کو یہ ترقی دی کہ انسان کے جنسی افعال جانوروں کے افعال سے مشابہ ہیں۔ قرون وسطیٰ میں انسان کو دیگر مخلوقات سے محض روایتاً افضل شمار کیا جاتا تھا۔ اس خیال کی بنیاد کوئی سائنٹیفک علم نہ تھا۔

البتہ مغربی سائنس کے عروج سے بہت عرصہ پہلے اس سلسلے میں چینیوں نے بہت زیادہ ترقی کی تھی۔ انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ زنانہ اور مردانہ عناصر ہوتے ہیں جو الگ الگ حمل نہیں ٹھہرا سکتے۔ علاوہ ازیں چینی زبان میں ایسے لفظ موجود تھے جن کے معنی "اووری" یعنی انڈادانی اور "منی" کے ہوتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حیض کا حمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرون وسطیٰ کے زمانے میں انسان کو زندگی کے بنیادی حقائق کا قطعی

علم نہ تھا۔ جنس کے متعلق سنجیدہ علم کی بجائے توہم اور جادو ٹونے کا دور دورہ تھا۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ کسی کے ذہن میں کبھی خیال تک پیدا نہ ہوا تھا کہ بچے کی پیدائش کا علم قابل ادراک ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں لی یرو بین ہوک نے خوردبین ایجاد کی لیکن اس ایجاد کے سو سال بعد اس کے شاگرد ہام نے منی کے جراثیم دریافت کئے۔ انہی دنوں اس کے ساتھی گراف نے انڈادانی کے متعلق نئی معلومات مہیا کیں۔ اب حمل کی سچی کہانی تیار کرنے کا امکان پیدا ہو گیا لیکن سو سال یونہی گزر گئے اور اس کے بعد کہیں جا کر سپیلن زانی نے منی کے کیڑوں کو حرکت کرتے ہوئے دکھایا اور تقریباً ایک صدی اور گزر جانے کے بعد ہرٹ برگ اس قابل ہوا کہ منی کے کیڑے کو انڈادانی میں داخل ہوتے ہوئے دکھا سکے۔ لہٰذا تاریخ کے آغاز سے لے کر ۱۸۷۵ء تک انسان کو حمل کی حقیقت کا کوئی علم نہ تھا۔

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمیں ۱۸۷۵ء کے بعد ہی علم ہوا کہ انسانی اور دوسری حیوانی زندگی کا آغاز کس طرح ہوتا ہے اور ہمیں اس حقیقت کی روشنی میں جنس سے متعلق انسانی علم کی سنجیدہ ترقی کا جائزہ لینا چاہیئے۔

اگر ہم جنسی بیماریوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکے تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہم جنسی عوامل کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہمارا تمام علم قیاسات، توہمات اور قصے کہانیوں کا مجموعہ تھا۔

حاصل کلام یہ کہ جنسی بیماریوں کے خلاف جہد و جہد آج سے کوئی تین سو

سال پیشتر شروع ہوئی اور یہ پہلے پہل بالکل غیر سائنسی تھی۔ جب ہم نے دیکھا کہ آتشک کا مرض اپنے دوسرے اور تیسرے درجے میں کس قدر خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کے علاج کے طریقے دریافت ہونے لگے جلد ہی طوائف سماجی بیماری کا سرچشمہ مانی جانے لگی لیکن بدمعاشی کے اڈے ہزاروں سال سے جائز سماجی اداروں کی حیثیت سے قائم تھے۔ اس لئے تجارتی عصمت فروشی کے خلاف رفتہ رفتہ ہی نفرت پیدا ہوئی۔ عصمت کی تجارت کی مخالفت ہوئی تو اس پر طبی حملہ کیا گیا اور اس کے بعد کلیسا اور قانون نے دھاوا بول دیا لیکن دو سو سال تک بدکاری کے خلاف جو جدوجہد جاری رہی وہ بالکل غیر منظم تھی اور غیر موثر ثابت ہوئی۔

بعد ازیں عصمت فروشی کو "سرکاری طور پر تسلیم" کرنے کا زمانہ آیا۔ خطرے کے مقامات کو دوسری آبادی سے الگ کیا گیا اور اس علاقے کو بظاہر طبی نگرانی میں رکھا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی تجارت کی وسیع ترقی نے جسے ہم بزنس کہتے ہیں بدکاری پر بھی گہرا اثر ڈالا اور نوجوان لڑکیوں کی تجارت شروع ہوئی لڑکیوں کو باقاعدہ طور پر عصمت فروشی کے لئے بھرتی کیا جانے لگا اور تمام منافع چکلوں کے چودھریوں کی جیبوں میں جانے لگا۔ ایک وقت آیا کہ عصمت کی فروخت کو قانوناً منع کر دیا گیا لیکن یہ دھندا چوری چھپے جاری رہا اور اس قدر نفع بخش ثابت ہوا کہ اسے ختم کرنا قانون کے بس کا روگ نہ رہا۔ نتیجۃً عصمت فروشی اور بدکاری کے خاتمے کی تحریک پیدا ہوئی۔ نئے قانون پاس کئے گئے۔ اکثر ملکوں میں حرام کاری کے خلاف جدوجہد کے لئے پولیس کے خاص محکمے کھولے گئے۔ ڈاکٹروں نے جنسی بیماریوں کے خلاف

پر زور پراپیگنڈہ کیا اور کلیساؤں نے زبردست تبلیغ شروع کر دی۔ ان سب کوششوں کا مقصد بدی کو ختم کرنا تھا لیکن انسان کی جہالت نے اس نیک کام کو سرے نہ چڑھنے دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء تک سوزاک اور آتشک کا اخباروں اور رسالوں تک میں ذکر شرافت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد عصمت فروشی کی ممانعت کے تمام قانون اور بدکاری کے خاتمے کے پروگرام کا تمام ڈھانچہ دھڑام سے نیچے آیا۔ تمام ملکوں میں بدکاری اور جنسی وبا زور پکڑ گئی۔ لہٰذا اس کے خلاف، سائنٹیفک بنیادوں پر دوبارہ مہم چلانے کی کوشش کی گئی۔ سینکڑوں مریضوں کی داستانیں عبرت کے طور پر اخباروں اور رسالوں میں چھاپی گئیں اور بدکاری کے متعلق نام نہاد سائنسی مواد کا اتنا بڑا ڈھیر لگ گیا کہ انسانی اخلاق، محبت، شادی اور خاندان کے تمام اہم سوال اس کے تلے دب گئے۔ نفسیاتی تجزیے سے کام لیا جانے لگا۔ اور گناہ سے متعلق جو نئے نظریئے پیدا ہوئے ان میں سے اکثر کو طبی حمایت بھی مل گئی۔ اس کے باوجود یہ ابدی سوال بدستور قائم رہا کہ عورتیں حرام کاری پر مجبور کیوں ہوتی ہیں۔

روس کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بدکاری کے عجیب و غریب وجوہ بیان کئے گئے ہیں، جن سے شاید آپ بھی آگاہ ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) طوائفیں فطرتاً پیدا خلاق ہوتی ہیں۔ اس لئے جب تک سائنٹیفک طریقے پر انسانی نسل کی پرورش شروع نہ ہو جائے یا مذہب کے ذریعے انسان کی اصلاح نہ کی جائے اس وقت تک بدکاری کے خلاف کچھ

نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) چونکہ مرد جنسی زندگی میں ذائقے کی تبدیلی کو فطرتاً پسند کرتا ہے اس لئے زنا کا خاتمہ ناممکن ہے۔ بدکاری باقی رہے گی۔

(۳) صرف مرد ہی حرام کاری کے ذمہ دار ہیں اس لئے وہ برے فعلوں سے بچنے کا حلفاً وعدہ کریں اور ایسے افعال کی حمایت نہ کریں تو شاید یہ بدعت ختم ہو جائے

(۴) بہت سی بدکار عورتیں ایسی ہیں جو شروع میں شریف لڑکیاں تھیں لیکن بری صحبت میں پڑ کر خراب ہو گئیں۔ لہٰذا علاج کلیسا اور گھر سے شروع ہونا چاہیئے۔

(۵) چونکہ دنیا میں عورت ہمیشہ رہے گی، اس لئے بدکاری بھی ہمیشہ رہے گی کیونکہ عورتیں زندگی کی لعنتوں کے حصول کے لئے آسان طریقہ اختیار کرتی ہی رہیں گی۔

(۶) تقریباً تمام پیشہ ور عورتیں فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکیوں سے بھرتی کی جاتی ہیں۔ اس لئے حرام کاری کو ختم کرنا ہے تو عورتوں کو صنعتوں میں کام کرنے سے روک دیا جائے

(۷) جو لڑکیاں بعد میں پیشہ اختیار کرتی ہیں، وہ شادی سے پہلے مائیں بننے کا تجربہ کر چکی ہوتی ہیں۔

(۸) بدکار عورت نفسیاتی علاج سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا بہت سی پیشہ ور عورتوں کو نفسیاتی تجزیئے کے ذریعے ان کا کھویا ہوا وقار واپس مل سکتا ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اس سفید جھوٹ اور نیم حقیقت کا کیا کیا جائے۔ لہٰذا بدکاری اور عصمت فروشی کے خلاف جہاد کرتے کرتے قانون ساز اسمبلیاں مفلوج ہو گئیں تو حیرانی کی کوئی بات نہیں اور پھر کوئی مثال بتایئے کہ کوئی قانون اقدام اس قسم کی مخالفت کے بغیر اٹھایا گیا ہو کہ یہ لامحالہ ناکام رہے گا۔

چند سال پیشتر مالپ ڈی کروئف نے مردوں کے ایک رسالے میں اپنا ایک سنسنی خیز مقالہ شائع کیا، جس میں اس نے بدکاری کے خلاف جدوجہد کرنے کا ایک نیا طریقہ پیش کیا۔ یہ مقالہ اچھا خاصا افسانہ تھا جس میں ایک ایسی دوا کی موجودگی کی اطلاع دی گئی تھی جسے عورتیں استعمال کریں تو نہ صرف یہ ہوگا کہ دوسروں کو ان سے بیماری نہیں لگے گی بلکہ بیماری کا زور ٹوٹ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دوا کے استعمال سے کوئی خوف باقی نہیں رہتا اور ان گنت بار زنا کیا جا سکتا ہے۔ بچے کی ضرورت ہی کیا ہے مقصد تو بیماری سے بچنا ہے۔

لیکن یہ دوا مسٹر کروئف کے زرخیز تخیل کی پیداوار نکلی پھر بھی ایسی دوا کی ایجاد ناممکنات میں سے نہیں چونکہ اب تک کوئی ایسی دوا موجود نہیں ہے اس لئے طبی تحقیقات کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ مانع مرض اور دافع مرض دوائیں ایجاد کی جائیں۔ سائنسدانوں کی اچھی خاصی تعداد کا خیال ہے کہ یہ بڑواں نہیں ایجاد ہو گئیں تو حرام کاری سے پیدا شدہ مصیبت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ کیا ہم ان سے اتفاق کر سکتے ہیں۔

اس سوال کے جواب کے لئے کسی خاص سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ آج کل بیماری لگنے اور حمل ٹھہرنے کے دو ایسے قدرتی خوف ہیں جن کے پیش نظر بہت سے نوجوان اور دوشیزائیں جنسی تعلقات میں محتاط ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ بدکاری ایک حد تک قابو میں ہے۔ جونہی یہ خدشہ جاتا رہے گا ہر قسم کی بدکاری میں کمی کی بجائے اضافہ ہو جائے گا۔ عام لوگ جتنی مقدار میں جنسی بیماری سے بچاؤ اور ضبط تولید کے طریقوں کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے زیادہ گناہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ سوویت یونین کے سوا ہر ملک میں عصمت فروشی کا قومی امکان ہے کیونکہ سوویت یونین میں سائنس کا کام محض جنسی بیماری اور ناجائز پیدائش سے اعداد و شمار جمع کرنے تک محدود نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہاں اس سے کہیں زیادہ اہم اخلاقی مسائل درپیش تھے۔ اشتراکی حکومتوں کو تو اس بات کی لگن تھی کہ انسانی نسل کی اصلاح کیسے ہو اس کی فطرت کو کیسے بدلا جائے

# عصمت کی تجارت کا خاتمہ

روسی عورتوں نے سوال نامے کے جواب میں متفقہ طور پر بتایا کہ عورتیں معاشی دباؤ یا غریبی سے مجبور ہو کر عارضی یا مستقل طور پر بدکاری اختیار کرتی ہیں لیکن اس سوال کا یہ جواب ادھورا ہے۔

روس کی غریب عورتوں کی اکثریت نے بدکاری کو غریبی کا حل سمجھ کر اختیار نہ کیا تھا۔ اس کی وجہ؟ کیا ان کی حالت اس بدنصیب اقلیت سے اچھی تھی جنہوں نے عصمت فروشی کو اپنی غریبی کا علاج سمجھا تھا؟ ہرگز نہیں؟ روسی عورتوں نے اس سوال کا بھی موثر جواب دیا۔

جو عورتیں عصمت فروشی کی لعنت میں گرفتار تھیں انہوں نے بتایا کہ وہ دوسرے لوگوں کے اکسانے پر عصمت کی تجارت کرنے لگیں۔ یہ اکسانے والے کون تھے؟ عموماً یہ ایسے مرد نہ تھے جو سب سے پہلے ان کے گاہک بنتے، بلکہ یہ ایسی عورتیں اور مرد تھے

جو عصمت کی تجارت سے نفع کماتے تھے اور یہ لوگ، دلال یا پھکول کے چودھری اور مالک تھے۔

بعض قاری یہ خیال کریں گے کہ مذکورہ بالا ہر دو حقائق کا اطلاق صرف روسی عورتوں پر ہی ہو سکتا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں فلیکسنر اور کوپر کی کتابیں پڑھیں ان کتابوں سے معلوم ہوگا کہ ان دونوں حقیقتوں کا اطلاق ۱۹۲۳ء کے روس کی طرح آج روس کے علاوہ ہر ملک پر ہوتا ہے اور اس سے دنیا کا کوئی ملک، مستثنیٰ نہیں، عصمت فروشی کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ دنیا میں بے شمار مفلوک الحال اور بے یار و مددگار لڑکیاں پائی جاتی ہیں اور دوسرا سبب یہ کہ عصمت کی باقاعدہ اور منظم تجارت سے بھاری منافع حاصل ہوتا ہے۔

بدنصیب لڑکیوں کو ان منافعوں سے کوئی خاص حصہ نہیں ملتا۔ رومانی اور خیالی اندازوں کے برعکس پیشہ ور لڑکیوں کی ماہوار آمدنیاں نہایت قلیل ہیں۔ ان کی زندگیاں نہایت ہی ہولناک اور ان کا ماحول نہایت ہی غلیظ اور پست ہے۔ البتہ چند لڑکیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے عصمت فروشی کو مستقل پیشہ بنانے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ہزاروں لڑکیوں نے اعتراف کیا کہ وہ نا سمجھی میں بدکار بن گئیں اور ان پر حقیقت حال بعد میں کھلی۔ اکثر نے یہ دھندا مجبوراً اختیار کیا۔ وہ فاقوں مر رہی ہوتیں یا ان کا کام غیر دلچسپ اور اکتا دینے والا ہوتا یا وہ نہایت قلیل اجرت پر حد سے زیادہ مشکل اور ناقابل برداشت کام کر رہی ہوتیں یا فرصت کے وقت ان کے پاس دل بہلاوے اور تفریح کا کوئی سامان نہ ہوتا تو اس حالت میں کوئی دلال مرد یا عورت وارد ہوتی۔ وہ نہایت چالاکی سے منہی جال بچھاتی اور لڑکی کے ساتھ تاریخ اور معاوضہ طے کر جاتی

عام طور سے یہ معاوضہ قلیل ہوتا تھا۔

انسٹرا کی محققوں نے معلوم کیا کہ اکثریت کو کسی خاص معاوضے کا وعدہ نہ دیا جاتا تھا وہ اس قدر خستہ حال ہوتی تھیں کہ ان کے لئے معمولی معاوضہ بھی گناہ کی زبردست ترغیب ثابت ہوتا۔ کوپر نے اپنی کتاب میں بتایا کہ امریکہ میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ لڑائی سے چند سال پہلے فی ہفتہ اکیس بکس (BOCKS) خالص منافع کے وعدہ پر لڑکیوں کو عصمت فروشی کے لئے بھرتی کیا جاتا تھا اور یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ گناہ کی جڑ نہایت افلاس میں ہے۔

مذکورہ بالا سوال نامے کی تیاری کے وقت سوویت حکومت نے ملک کی صنعتی اور زرعی زندگی کو نئے سرے سے منظم کرنا شروع کیا ہی تھا۔ اس وقت عورتوں کے لئے تقریباً کوئی نوکری یا عہدہ خالی نہ تھا اور اگر کوئی تھا بھی تو تنخواہ بہت ہی تھوڑی تھی۔ سوال نامے میں عورتوں کو کوئی ملازمت پیش نہیں کی گئی تھی۔ اور نہ کوئی باعزت کام دینے کا وعدہ ہی کیا گیا تھا۔ اس پر بھی کچھ عورتوں نے لکھا کہ وہ باعزت روزگار کے ذریعے اپنی اخلاقی زندگی کو بحال کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ انہیں اپنی اخلاقی پستی کے معاشی وجوہ کا پورا احساس تھا۔ ان بدنصیب عورتوں کی اکثریت بچوں کی پرورش کر رہی تھی اور وہ ہر وقت یہ خواب دیکھتی تھیں کہ بچوں کے باشعور ہونے سے پہلے اپنے ذلیل پیشے سے نجات حاصل کر لیں، تاکہ وہ ان کے لئے ندامت کا داغ ثابت نہ ہوں۔

اس سوال نامے سے ایک اور حقیقت کی تصدیق ہوئی جسے آج ہر ماہر نفسیات، مصلح اور دانا مرد اچھی طرح جانتا ہے لیکن اس سے بہت کم شریف

عورتیں آگاہ ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ایسی لڑکیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو ہوس پرستی یا حد سے زیادہ بڑھی ہوئی جنسی خواہش کی تسکین کی خاطر عصمت فروشی اختیار کرتی ہیں۔ روسی عورتوں نے متفقہ طور پر بتایا کہ اس قسم کی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعت، جنس سے قطعاً اچاٹ ہو جاتی ہے اور دل کو جنسی فعل سے نفرت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ بدکاری کی طرف مائل ہوئیں تو لذت کشی کا خیال تک ان کے قریب نہ پھٹکا تھا۔

اشتراکی ماہرین نفسیات نے اس سوال نامے کے جوابوں کی روشنی میں اس عام تجربے کی تصدیق کی کہ اکثر طوائفیں نفسیاتی اعتبار سے صحت مند ہوتی ہیں۔ ان کے دماغوں میں خلل ہوتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی قدر، جتنا کہ عام یا اخلاق عورتوں کے دماغوں میں پایا جا سکتا ہے یعنی ان کی ذہنی حالت عام عورتوں کی سی ہوتی ہے۔ شائستگی اور حیا سے بے حیائی اور بدکاری کی طرف میلان کا باعث نفسیاتی دباؤ نہیں بلکہ معاشی دباؤ ہے۔

آج کل ہمارے ہاں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ بد اخلاق لڑکی کی سماجی حیثیت کو بحال کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے کافی عرصہ تک نفسیاتی شفاخانے میں رکھا جائے۔ یہ نظریہ سائنس اور عقل کے خلاف ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر بے شمار مضحکہ خیز سکیمیں تیار ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً عورتوں کے لئے "نجات، گھر" اور "اصلاح گاہیں" تعمیر ہونے لگتی ہیں۔ لڑکی کو پہلے جرم پر قید کی سزا دی جاتی ہے اور اس کے دوران میں ایک افسر اس کی نگرانی کرتا ہے۔ وہ تصدیق کر دے کہ ملزمہ کا اخلاق درست ہو گیا ہے تو اسے تجربتہً رہا کر دیا جاتا ہے۔ ایسی سکیموں سے کوئی

کوئی مقصد حاصل ہوتا ہے تو صرف یہ کہ جرائم اور بدکاری کا عام سبب یعنی افلاس وقتی طور پر ـــــ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ روسی عورتوں نے بدمعاشی کے معاشی اسباب پر بہت زیادہ زور دیا اور نہایت موثر الفاظ میں مطالبہ کیا کہ ہمیں کوئی باعزت کام دیجئے۔ مناسب تحفظ کا یقین دلایئے۔ ہم اپنے آپ کو فوراً بحال کر لیں گی۔

وہ جواب خاص طور سے بصیرت افروز تھے جو عصمت کی تجارتی لوٹ کھسوٹ سے متعلق تھے۔ ان سے اس فریب کی قلعی کھل گئی کہ عصمت فروشی کے اڈوں کو چند امیر اور صاحب دماغ آدمیوں کا گروہ چلاتا ہے اور اس پراسرار گروہ کا راز فاش ہو گیا۔ جسے "عصمت کا تاجر" کہتے ہیں۔ کیونکہ سوال نامے نے ثابت کر دیا کہ بدکاری سے نفع کمانے والے لوگ عام عورتیں اور مرد ہوتے ہیں۔ ان دنوں روس میں بدکاری کا جو حال تھا اسے اپنے زمانے پر منطبق کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بدکاری سے نفع کمانے والوں کی اکثریت عام اور گمنام قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں تانگے والے ہوٹلوں کے بیرے، عام جرائم پیشہ اور نشے کے عادی لوگ ہوتے ہیں اور گھٹیا درجے کے تاج گھروں، ہوٹلوں، ریستورانوں اور تفریح گاہوں کے مالک اور سب سے بڑھ کر ایسے جاگیردار اور صاحب جائداد لوگ شامل ہیں جو سستے ہوٹلوں سراؤں اور سیاحوں کی قیام گاہوں کے مالک ہوتے ہیں۔

اب ہم نکتہ اختلاف یعنی اس مسئلے پر پہنچ گئے ہیں جس کا سامنا اشتراکی ماہرین کو عصمت فروشی کے خلاف مہم چلانے سے پہلے کرنا پڑا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایسا نکتہ ہے جو اشتراکی مہم کو باقی تمام مہموں سے ممیز کرتا ہے جو کسی دوسرے ملک میں عصمت فروشی کے خلاف چلائی گئیں۔

اس نکتے کی آسان تشریح یہ ہے کہ سوویت یونین میں بدمعاشی کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ اس مہم کا رُخ طوائف کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ منظم بدکاری ایک سماجی برائی ہے اسکا بنیادی سبب عورتوں کا افلاس ہے۔ اور نفع اندوزی کا لالچ اس لعنت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس پالیسی کی اخلاقی بنیاد کیا ہے؟ اس کی مکمل تشریح میکسم گورکی ان الفاظ میں کر چکا ہے۔

"دنیا میں ایک بھی غلام اور مظلوم باقی نہ رہے۔ تو اغلب ہے کہ انسان مثالی طور پر نیک بن جائے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی غلام اور مظلوم نہ رہے تو ان لوگوں کے خلاف زبردست جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے جو غلاموں کی محنت پر زندہ رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔"

سوویت حکومت نے ۱۹۲۵ء میں ایک قانون کے ذریعے اپنے نظریوں کو عملی شکل دی۔ اس قانون کا نام تھا "عصمت فروشی کے خلاف جدوجہد کے اقدامات"۔ اس قانون کا پیش لفظ چونکا دینے والا تھا۔ اس میں بدکاری اور بیماری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ اور ہر حکومتی ادارے، ٹریڈ یونین، امداد باہمی اور عوامی تنظیم کو ہدایت دی گئی کہ مندرجہ ذیل امور پر فوراً عمل کیا جائے

۱۔ حکم دیا گیا کہ یہ شیا یعنی مسلح مزدوروں کے دفاعی دستے ٹریڈ یونینوں کی براہ راست حمایت حاصل کریں اور محنت کش عورتوں کو ان کی موجودہ ملازمتوں سے بہر قیمت برطرف نہ ہونے دیں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جائے کہ غیر شادی شدہ عورتوں کو جو محنت کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں یا جو حاملہ ہیں، جو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مائیں ہیں۔ یا بے گھر نوجوان لڑکیوں کو کسی صورت میں بھی ملازمت سے برطرف نہ کیا جائے۔

۲۔ اس وقت ملک میں بہت زیادہ بے روزگاری پائی جاتی تھی اس مسئلے کے جزوی حل

کے لئے مقامی حکومتوں کے مختلف اداروں کو ہدایت دی گئی کہ غریب عورتوں کو محنت مزدوری بہم پہنچانے کے لئے امداد باہمی کی بنیادوں پر زرعی فارم اور فیکٹریاں قائم کی جائیں۔

۳۔ تمام عورتوں کو سکولوں اور تربیت گاہوں میں داخل ہو کر علم اور فن سیکھنے پر اُبھارا گیا اور یونیونوں کو ہدایت کی گئی کہ صنعتی اور پیشہ ورانہ اداروں میں عورتوں کے داخلے کی جو مخالفت پائی جاتی ہے۔ اس کا کامیابی سے مقابلہ کیا جائے

۴۔ رہائشی مکانوں کا بندوبست کرنیوالے محکموں کو حکم دیا گیا جن عورتوں کا کوئی مخصوص ٹھکانہ نہیں یا جو لڑکیاں ملازمت کے سلسلہ میں دیہات سے شہروں میں آتی ہیں ان کے لئے مشترکہ رہائشی ادارے قائم کئے جائیں۔

۵۔ لاوارث اور بے گھر بچوں اور لڑکیوں کے تحفظ کے لئے جو قوانین بنائے گئے ہیں۔ ان پر پوری طرح عمل کیا جائے

۶۔ ملک کی تمام آبادی کو جنسی بیماری یعنی آتشک کی خطرناک مصیبت اور عصمت فروشی کی لعنت سے آگاہ کرنے اور نئی جمہوریت سے ان برائیوں کے خاتمے کے لئے قومی امنگ اور عزم کے ساتھ جہالت پر عام دھاوا بولا جائے اور تعلیم کو رواج دیا جائے۔

یہ سب اقدامات ابتدائی قسم کے تھے اور ان کا مقصد نہایت غریب عورتوں اور لڑکیوں کی حالت کو قدرے بہتر بنانا تھا۔ اشتراکی حکومت کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ بدکاری سوسائٹی کے ہر طبقے میں پاؤں جما چکی ہے۔ صرف معاشی دباؤ کے ہلکا کر دینے سے یہ موجودہ نسل سے تو ہرگز دور نہیں ہو سکتی۔ اور شاید آئندہ نسل میں بھی باقی رہے۔ لہٰذا اس پر براہ راست حملہ کیا گیا۔ اس مقصد کے پیش نظر مرکزی حکومت نے تین مزید قانون نافذ کئے۔

۱۔ زار شاہی کے قانون میں بدکار عورتوں کے خلاف جتنے بھی ظالمانہ اقدامات روا رکھے

گئے تھے انہیں قانون اور پولیس کی سرگرمیوں سے قطعاً الگ کر دیا گیا۔

۲۔ مفت خوروں اور طفیلیوں کے خلاف شدید جنگ کا آغاز کیا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کا مفاد بلا واسطہ یا بالواسطہ عصمت فروشی سے وابستہ تھا۔ مقامی حکومتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں ان بے رحموں سے بے رحمی کے ساتھ پیش آئیں۔

۳۔ جو لوگ جنسی بیماریوں سے متاثر تھے انہیں ہر ممکن طریقے سے ڈاکٹر اور طبی سہولتیں مفت بہم پہنچائی گئیں۔

ان قوانین پر عمل کرانے کے لئے محکمہ صحت عامہ کے ماتحت ایک نیا ادارہ قائم کیا گیا لیکن شروع ہی سے بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اقتصادی اقدام سے رفتہ رفتہ خاطر خواہ نتیجہ نکلنے لگا تھا۔ لیکن منظم بدکاری یعنی عصمت کی تجارت کے خلاف جدوجہد میں کوئی کامیابی نظر نہ آئی۔

زار شاہی پولیس کے وحشیانہ طریقے مسلح مزدوروں کے بعض دفاعی دستوں نے جو بہ اختیار کر لئے جن کے قائد ایسے لوگ تھے جو بداخلاقی سے متعلق نئے نظریئے کو سمجھ نہ سکے تھے۔ اس لئے ۱۹۲۳ء میں عوامی مجلس انصاف نے ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر دی۔ جس کا آزاد ترجمہ حسب ذیل ہے۔

دفعہ ۱۷۰ جو شخص ذاتی منفعت یا کسی دوسری غرض سے جسمانی یا اخلاقی دباؤ کے ذریعے عصمت فروشی کی حوصلہ افزائی کریگا وہ اپنے پہلے جرم پر کم سے کم تین سال کی سزائے قید کا مستوجب ہوگا۔

دفعہ ۱۷۱ عصمت کے تاجر اپنے پہلے جرم پر کم سے کم تین سال قید اور تمام ذاتی جائیداد کی ضبطی کی سزا کے مستوجب ہوں گے۔ اگر طوائف کسی ملزم کی زیر نگرانی ہو یا اس کی ملازمت میں ہو یا اس کی عمر اکیس سال سے کم ہو تو قید کی سزا بڑھا کر کم سے کم پانچ سال کر دی جائے گی۔

ان قوانین پر عملدرآمد کی ذمہ داری پہلے پہل محکمہ صحت عامہ کے سپرد کی گئی تھی۔ لیکن بعد میں جنوری ۱۹۲۴ء میں امور داخلہ کی عوامی مجلس کے حوالے کر دی گئی۔ یہ ادارہ تقریباً ہمارے ہاں کے محکمہ عدل و

انصاف یا سرکاری وکیلِ اعظم کے دفتر سے مشابہ ہے اس کے بعد ایک اور آرڈی ننس جاری کیا گیا۔ جسے فوراً قانونی شکل دے دی گئی۔ یہ قانون عصمت فروشی کے خلاف جدوجہد میں ملیشیا کے فرائض سے متعلق تھا۔ یہ غیر معمولی قانون تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ کیونکہ یہ پہلا قانونی اقدام ہے۔ جو منظم بدکاری اور بداخلاقی کی سماجی بنیادوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوا اور یہ اس قابل ہے کہ دوسرے ملکوں کو نمونے کا کام دے سکے اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ پہلے حصے میں ملیشیا کے فرائض وضاحت سے بیان کئے گئے۔ ملیشیا کا فوری کام یہ تھا کہ وہ بدمعاشی کے تمام اڈوں کا سراغ لگائے کیونکہ یہ بدطینت لوگوں کے لئے حصولِ منفعت کا ایک بڑا اور مستقل ذریعہ تھے جو شخص اڈوں کو چلانے والا یا ان مکانوں کا مالک یا کرائے پر دینے والا نیز یا ان اڈوں کے لئے گاہک یا عورتیں مہیا کرتے ہیں جس شخص کا کسی طرح بھی کوئی ہاتھ ثابت ہوا سے فوراً گرفتار کیا جائے اور ضابطہ فوجداری کی دفعات کے مطابق سزا دی جائے۔ جن مکانوں میں عصمت فروشی کا کام ہوتا ہو، ان کے مالکوں یا مالکنوں، دلالوں یا کٹنیوں وغیرہ کے ساتھ ویسی سلوک کیا جائے۔ جو انسانوں کے سوداگروں کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔ ملیشیا کو تنبیہہ کی گئی کہ وہ بدمعاشی کے مشہور اڈوں پر چھاپے کے فوراً بعد تفریح گاہوں، رستوراں کی طرف خاص طور سے توجہ کرے۔ تفریح گاہ یا ہوٹل وغیرہ کا مالک خواہ لاکھ عذر پیش کرے کہ اسے قطعاً کوئی علم نہیں کہ اس کی عمارت میں کیا ہوتا ہے، اسے بہرصورت پکڑا جائے اور اس پر الزام لگا کر سزا دی جائے جس مکان میں بدکاری کے متعلق ثبوت مل جائے اسے اس وقت تک لازماً بند رکھا جائے جب تک اس کے مالک اور اور اس کے مددگاروں کو قرار واقعی سزا نہ مل جائے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایسے سخت اور لازمی اقدام کے متعلق ہمارے ہاں کے قانون سازوں نے کبھی سوچا تک نہیں۔ ہمارے ہاں عصمت فروشی کا اڈہ روپیہ لگانے کا سب سے اعلیٰ ادارہ ہے۔ کیونکہ پولیس خواہ جتنی مرتبہ چاہے چھاپے

مارے اس کے مالک کا کھوج ہی نہیں ملتا اور وہ ہر طرح بری الذمہ رہتا ہے۔

۲۔ اس قانون کا دوسرا حصہ بالکل اچھوتا ہے اس میں ملیشیا اور عوام کو تنبیہ کی گئی کہ بدکار عورت کے خلاف کسی قسم کا ذاتی اقدام نہ کیا جائے حتیٰ کہ ایک دفعہ کے ذریعے طوائفوں کی گرفتاری ممنوع قرار دے دی گئی انہیں عدالت میں صرف ان کے تاجروں کے خلاف گواہوں کی حیثیت سے طلب کیا جا سکتا تھا تاہم اس قانون میں ایک استثنائی دفعہ بھی تھی جس کے تحت ملیشیا کو اختیار تھا کہ وہ کم سن نوجوان لڑکیوں کو حکومت کی ایک خاص تحقیقاتی تنظیم یعنی مزدوروں اور کسانوں کی تحقیقاتی مجلس کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ اس قانون میں اس طریق کار کو مفصل طور پر بیان کیا گیا جسے بدمعاشی کے اڈوں پر چھاپہ مارتے وقت اختیار کرنا ملیشیا کے لئے ضروری تھا۔ ملیشیا کے ارکان کے لئے لازمی تھا کہ وہ عورتوں کو سماجی لحاظ سے اپنے برابر سمجھیں انہیں جرائم پیشہ لوگوں کی بے بس اور بدنصیب شکار جانیں۔ اور خواہ وہ ان کے ساتھ کسی طرح پیش آئیں وہ ان سے شریفانہ انداز میں گفت گو کریں اور ان پر ہرگز ذاتی حملے نہ کریں حد تو یہ ہے کہ افسروں کو بدکردار عورتوں کے نام اور پتے حاصل کرنے کی بھی اجازت نہ تھی لیکن ہمارے ہاں کے پولیس افسر کے تقریب یہ تمام اقدام عجیب اور ناقابل عمل ہیں۔ کیونکہ یہاں رسماً طوائفوں کے ساتھ انسان سے نچلے درجے کی مخلوق ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن روس میں یہ نئے قوانین نہایت ہی کارگر اور کامیاب ثابت ہوئے۔ ملیشیا اور دوسری عوامی تنظیمیں۔ مثلاً ٹریڈ یونینیں جو بدکاری کے خلاف جدوجہد کر رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگیں کہ جس عورت کی گذران گناہ پر ہے اسے مادی حالات کا دباؤ اور نفع اندوز جرائم پیشہ لوگوں کا مفاد ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

خیر ان قوانین سے حقیقی نتائج کیا نکلے؟ بدمعاشی کے اڈوں کے مالک اور بدمعاشی کے کاروبار میں ان کے شریک کار رفیق عدالتوں میں نظارانہ قطار پیش ہونے لگے اور انہیں جیلوں کا راستہ دکھایا جانے لگا جیسا کہ توقع تھی ان لوگوں نے مزاحمتی مہم چلانے کی کوشش کی۔ سوویت یونین

کے اخباروں کے "ایڈیٹر کی ڈاک" کے کالم دن بدن پھیلنے لگے۔ یہ خط عموماً اخلاقی چاشنی لئے ہوتے تھے۔ ان میں سوویت حکومت پر عموماً الزام لگایا جاتا کہ وہ طوائف کی حفاظت کرکے اور بدمعاشی کے اڈوں کے کرایہ دار مالکوں ایسے گناہگار لوگوں کو نوازیں دے کر ہولناک بداخلاقی کی مرتکب ہو رہی ہے پس پردہ رہ کر عصمت فروشی کا کاروبار چلانے والے افراد کے خلاف ملیشیا کی جدوجہد جتنی تیز ہوتی گئی۔ ان کے احتجاج اتنے ہی وحشتناک ہوتے گئے۔ اس مخالفت نے جلد ہی ایک خاص شکل اختیار کر لی۔ جس سے دوسرے ملکوں کی پولیس اچھی طرح واقف ہے۔ کہ کس طرح "مذہب اور قانون" میں لپٹی ہوئی دلیلوں سے رائے عامہ کو ورغلا کر عصمت کی تجارت کے خلاف ہر مہم کو ناکام بنایا جاسکتا ہے لیکن سوویت یونین میں ان احتجاجوں کا اثر الٹا ہوا اور ملیشیا نے اپنی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ تیز اور وسیع کر دیں۔

جن بڑے بڑے حلقہ داروں کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے جلد ہی سوویت حکومت پر الزام لگانا شروع کر دیا کہ وہ صاحب جائداد لوگوں یعنی ہوٹلوں کے مالکوں وغیرہ کو غیر منصفانہ سزائیں دے رہی ہے۔ امور داخلہ کی مجلس نے ان الزامات کے جواب میں کہا کہ کوئی سماج اپنے کسی رکن کو منظم عصمت فروشی جیسے قبیح فعل کی حمایت کا حق نہیں دے سکتا اور اس دلیل کے جواب میں کہ طوائفوں کو بھی اپنا پیشہ جاری رکھنے کا حق حاصل ہے سوالنامے سے اخذ کردہ نتیجے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا کہ عصمت فروشی ایک تلخ معاشی ضرورت ہے اور جو عورتیں اسے اختیار کئے ہوئے ہیں انہیں نجات دلانا اور قابل عزت کام عطا کرنا سماج کا فرض ہے

۱۹۲۶ء کے اواخر میں ایک نئی مشکل کا سامنا ہوا۔ اسے اخبار "ازوستیا" نے اپنے ایک ضمیمے میں ماسکو کے باشندوں کے سامنے پیش کیا اور بتایا کہ سوویت یونین میں اخلاقی منصوبہ بندی کافی حد تک کامیاب رہی ہے اس وقت تک عصمت فروشی کے خاتمے کی جدوجہد کے لئے صرف

مذکورہ بالا اقدام اٹھائے گئے تھے۔ لیکن اب ایک نیا اخلاقی مسئلہ اٹھایا گیا یعنی ہماری اصطلاح میں "آگ کا رُخ گاہکوں کی طرف کر دیا گیا۔"

"ازدستیا" نے اطلاع دی کہ عصمت کی تجارت سے نفع کمانے والوں کو ختم کرنے میں بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے اور اپنے اداریے میں تنبیہہ کی کہ عصمت فروشی کے خاتمے میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ تمام عورتوں کے لیے ملازمت کا بندوبست کیا جائے۔ اخبار مذکور نے ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کیا کہ سعی و جہد کی کامیابی کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ مردوں میں نیا اخلاقی نظریہ پیدا ہو۔ اس مسئلے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔ اگر ایک شہری کے لیے کسی عورت کی لوٹ گھسوٹ پر لبرلز وقات کرنا جرم ہے، تو مردوں کا عصمت کو خرید کر کسی عورت کے وقار کو تباہ کرنا بھی برابر کا جرم ہے۔"

ہم نے بدکاری کی تاریخ کا تجزیہ کرتے وقت بتایا تھا کہ یہ مسئلہ سب سے پہلے سماجی حیثیت میں اس وقت سامنے آیا جبکہ جاگیرداری زوال پذیر ہو چکی تھی اور محبت اور شادی کے بارے میں سماج کا نقطۂ نظر بنیادی طور سے بدل گیا تھا۔ لیکن روس میں نئی بات یہ ہوئی کہ اس مسئلے کو لاکھوں مردوں کے آگے پہلی مرتبہ پیش کیا گیا۔ سوویت یونین کے مردوں کے سامنے ایسے حقائق تھے۔ جن سے گریز ناممکن تھا وہاں ایک ایسا سماجی نظام قائم ہو چکا تھا جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر پوری قانونی، سماجی اور سیاسی برابری دے دی گئی تھی۔ محبت اور شادی کے ذریعے جنسی خواہش کی تسکین کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کی جا رہی تھیں ان حالات میں کسی مرد کا ضمیر جنس کی خریداری کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ مرد کب تک نہ صرف عورت کو اخلاقی پستی کے گڑھے میں گراتے رہتے بلکہ اپنے وقار کو بھی صدمہ پہنچاتے رہتے۔

سوویت ماہرین کو پہلے سے علم تھا کہ یہ مسئلہ اٹھے گا۔ "ازدستیا" کے مقالہ افتتاحیہ کے بعد پروفیسر المیتراتوف نے اسے جنسی بیماریوں کے خلاف جدوجہد کی دوسری کانگریس کے

موقع پر اور زیادہ ٹھوس اور واضح طریقے سے پیش کیا اس نے کہا کہ عورتوں کی لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف ملیشیا کی کامیاب جدوجہد کا اب یہ تقاضا ہے کہ ان مردوں پر سماجی دباؤ ڈالا جائے جو ابھی تک بدمعاشی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

اس نے دعویٰ کیا کہ "ہم اس مسئلے کو تنگ اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اسے ایک نہایت ہی اہم سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں، سوویت یونین ایک ایسی ریاست ہے جس کی بنیاد انسانوں کی ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کے خاتمے پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص عورتوں پر یہ ہولناک ظلم روا رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو ہمارے سماج کا فرد نہیں سمجھ سکتا"

درست کہ پروفیسر صاحب کا بیان ہمارے کانوں کو ایک وعظ لگتا ہے لیکن یہاں بھی اشتراکی ماہرین نے پہلے نظریہ پیش کیا پھر سائنسی منصوبہ بندی کے مطابق عملی اقدام کیا امور داخلہ کی مجلس نے اس مسئلے کو محض مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے فوراً ملیشیا کے حوالے کر دیا تاکہ وہ مناسب کارروائی کرے۔

پس منظر ایک حیران کن قانون منظور کیا گیا۔ اس کی رو سے ملیشیا کے افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ بدمعاشی کے کسی اڈے پر بھی چھاپہ ماریں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا شراب خانہ ہو یا محض کوئی کالی گلی تو جتنے بھی مرد وہاں ملیں ان کے نام اور گھروں، دفتروں، کارخانوں وغیرہ کے پتے ضرور درج کریں۔ لیکن انہیں گرفتار نہ کیا جائے۔

اگلے دن ان تمام مردوں کے نام اور شناخت کی فہرست کسی ایسے مقام پر چسپاں کر دی جاتی جہاں عام لوگ آتے جاتے یا جمع ہوتے فہرست کا عنوان ہوتا "عورتوں کا جسم خریدنے والے" یہ فہرست ایک خاص مدت کے لئے چسپاں رکھی جاتی عام طور سے ایسی فہرستیں سرکاری عمارتوں کے باہر یا فیکٹریوں کے نوٹس بورڈوں پر چسپاں کی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے یہ قانونی اقدام بہت زیادہ موثر ثابت ہوا۔ ہمارے ملکوں میں پولیس ایک اَن لکھے قانون کے تحت مجبور ہے کہ وہ مردوں سے رازداری اور عزت کے ساتھ پیش آئے۔ کیونکہ اسے پورا احساس ہے کہ وہ ایک ایسے شریف آدمی کو ننگا کر دے جو کسی چکلے کا سرپرست ہو۔ تو اس بیچارے کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی سوویت حکومت نے صرف اتنا کیا کہ اس طاقتور اور خفیہ سماجی احساس کو ایک موثر حربے میں ڈھال دیا۔ اس نے قلم کی ایک ہی جنبش سے آدمی کے ضمیر کو عوام کا ہدف تنقید بنا دیا۔ سوویت حکومت نے گناہگاروں کو سزا دینے اور اخلاقی جعلسازی کے خلاف تلقین کرنے کی بجائے ایسا اقدام کیا کہ مردوں کے لئے آئندہ اپنی فریب کاری کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔

ایسا دلیرانہ قدم اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھایا گیا تھا جن ماہرین نفسیات نے اخلاقی جعلسازی کے خاتمے کا منصوبہ بنایا تھا انہوں نے اس کا نفاذ عین مناسب وقت پر کیا۔ یہ قانون اس وقت تک نافذ نہ کیا گیا جب تک پہلے موثر قوانین کے ذریعے منظم بدکاری کی معاشی بنیادیں پوری طرح کھوکھلی نہ کر دیں۔

ہمیں یہ بات خاص طور پر دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ یہ اقدام کوئی اخلاقی جبر نہ تھا۔ مردوں کو جنسی خواہش کی تسکین سے ہرگز نہ روکا گیا۔ نہ ہی انہیں عورت کا جسم خریدنے پر سزا کی دھمکی دی گئی بلکہ انہیں صاف صاف بتا دیا گیا کہ نئی ریاست اس فعل کو اس لئے برا تصور کرتی ہے کہ یہ انسانوں کی لوٹ کھسوٹ کی ایک ہولناک شکل ہے اور سماج کے باعزت افراد کو جو غریبوں اور بدنصیبوں کی اخلاقی پستی سے کسی قسم کا فائدہ اُٹھانے کے خواہاں نہیں۔ یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اپنی ذاتی تسکین کے لئے اس لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے پر مصر ہیں۔

محض قانون نافذ کرنے پر اکتفا کر لیا جاتا اور متعلقہ مسائل کو نہایت احتیاط سے واضح نہ کیا جاتا تو یہ قانون ہرگز اس قدر مؤثر ثابت نہ ہوتا۔ اس قانون کے اجرا کے ساتھ ہی لوگوں کو باشعور بنانے کی مہم قومی پیمانے پر شروع کی گئی اس مہم کی خصوصیت اور خاص پہلو یہ تھا کہ سوویت یونین کے تھیٹروں میں اس کی ڈرامائی پیش کش کی گئی اس ڈرامے میں ایک ایسی عدالت کا منظر دکھایا گیا جس میں عصمت کی تجارت کے مقدمے کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔

کہانی میں بتایا گیا کہ کس طرح ملیشیا نے ایک چکلے پر چھاپہ مارا اور کس طرح اس اڈے کے مالک، عورت اور گاہک کو عوامی عدالت کے سامنے لایا گیا۔ عصمت فروشی کے کاروبار کے متعلق مکمل اور واضح شہادت اور ثبوت مل جانے کے بعد چکلے کے مالک کو قید کی سزا دی گئی طوائف کو چھوڑ دیا گیا اور گاہک کو نہ صرف اپنی اور عورت کی عزت خراب کرنے بلکہ قومی اخلاق کے ضابطے کو توڑنے کا مجرم بھی ٹھہرایا گیا۔ قدرتاً یہ ڈرامہ خلاف معمول لاتعداد عوام کی کشش کا باعث ہوا اور جس کسی تھیٹر میں بھی اسے پیش کیا جاتا اس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ رہتی۔ اس ڈرامے کی شعوری اور بچگانہ سادگی نے اسے فحاشی کی لفظی تصویر سے بہت زیادہ بلند اور مؤثر بنا دیا۔ اس ڈرامے میں ایک سماجی مسئلے کو نہایت سیدھے سادھے الفاظ میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ ہر قسم کی حماقتوں، مضحکہ خیز پیچیدگیوں اور لفظی گورکھ دھندوں سے بالکل پاک تھا۔ دوسرے لفظوں میں ایک کھلی سماجی حقیقت کو سٹیج پر ہو بہو پیش کر دیا گیا تھا۔

کرداروں نے حقیقت اور قانون دونوں کی ترجمانی کی۔ ہر تماشائی مرد، عورت اور نوجوان سمجھ گیا کہ کون سا اخلاقی مسئلہ درپیش ہے۔ ساتھ ہی ان نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب مزدور کچھ ہونے والا ہے اور آئندہ جو آدمی کسی طوائف کے ہاں پایا گیا اس کا علم

سب کو ہو جائے گا اور جب اس کا نام عورتوں کے جسموں کے خریداروں کی فہرست میں شامل کر کے رسوائے عام کر دیا جائے گا تو وہ اپنے رشتہ داروں، ساتھیوں اور تمام قوم کی نظروں میں ذلیل اور ملزم ٹھہرے گا

# عیسائیت اور ڈاکٹر

ہم نے ابھی تک اس جد وجہد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جو روس میں جنسی بیماری یعنی آتشک کو ختم کرنے کے لیے کی گئی۔ سوویت حکومت نے زار شاہی سے دوسری سماجی لعنتوں کے ساتھ زر و پٹے کے نظام، یعنی عصمت کی تجارت کو بھی ورثے میں پایا، اور اس کے ساتھ ہی جنسی بیماری کا ہولناک مسئلہ بھی۔ اس زمانے میں روس میں آتشک کا مرض بُری طرح پھیل چکا تھا۔ اس موذی مرض کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ چہرے کے خد و خال کو بگاڑ دیتا ہے۔ چنانچہ رُوس کی بعض چھوٹی قومیں، خصوصاً وہ قبائل جو دریائے والگا کے کنارے آباد تھے، اس لاعلاج بیماری کے ہاتھوں اپنی بدوضعی کے لیے ملک بھر میں مشہور تھے، اس پر طُرّہ یہ کہ آزاد محبت کے نئے تجربوں نے دونوں جنسی طاعونوں یعنی آتشک اور سوزاک کو اور بھی ہوا دی۔

اس نازک صورت حال کے باوجود رُوس کے طبّی ماہروں نے حتی الوسع دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی پیروی کرنے سے گریز کیا۔ کیونکہ ان ملکوں میں جنسی بیماری کے خلاف

جتنی مہمیں چلائی گئی تھیں وہ سب بے اثر ثابت ہو چکی تھیں ۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنی توجہ ایکیلی جنسی بیماری کے خلاف طبّی جد وجہد پر مرکوز نہیں رکھی ۔ وہ اپنے اس درست فیصلے پر جمے رہے کہ جنسی بیماری صرف اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب کہ عصمت فروشی کے خلاف عام بداخلاقی کا بھی انسداد کیا جائے ۔ اُنھوں نے اخلاقی مسئلے کو بنیادی قرار دیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ عام اخلاقی مسئلے کو حل کر لیا گیا تو سوزاک اور آتشک پر سائنسی طریقے سے حملہ کرنا آسان ہو جائے گا ۔ اور ان دونوں علتوں کا انسداد اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ انھیں عام سماجی بیماریوں مثلاً تپ دق ، شراب نوشی وغیرہ کا ایک جزو قرار دے کر ان کے خلاف قومی پیمانے پر وسیع مہم چلائی جائے ۔ اس وقت ایسا کرنا آسان بھی ہوگا ۔ کیونکہ لوگوں میں کسی قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ پیدا نہیں ہوگی ۔ جو اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے ۔ جب کہ آتشک اور سوزاک کے ازالے کو عام اخلاق سدھار مہم سے الگ کر لیا جائے ۔ سب سے پہلے ضروری تھا ، کہ اس فضول حجّت بازی کو رد کیا جائے کہ کس قسم کی عورت سب سے زیادہ بیماری پھیلانے کا موجب ہو سکتی ہے ۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ہر بیمار عورت اور مرد دوسروں کے لیے وباء کا سرچشمہ ہے ۔ سوویت حکومت نے موجودہ اور آئندہ نسلوں پر جنسی بیماریوں کے مضر اثرات پر بڑی سنجیدگی سے غور کر کے ضابطہ فوجداری میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیا ۔ اس قانون کے رُو سے قرار پایا کہ آئندہ کوئی شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جنسی بیماری میں مبتلا ہے اور اس سے دوسروں کو بیماری لگ سکتی ہے جنسی فعل کا ارتکاب کرے گا ۔ تو اس کی یہ حرکت سنگین جرم شمار کی جائیگی ۔ اس طرح جنسی بیماری کے انتقال کو فرد کے ضمیر پر نہ چھوڑا گیا ۔ بلکہ ملزم کو ریاست کے

سامنے جواب دِہ بنا دیا گیا۔

یہاں بھی اشتراکی حکومت صرف قانون پاس کر کے نہیں بیٹھ رہی۔ اِس اقدام کے ساتھ ہی باقاعدہ منصوبے کے تحت ملک بھر میں جنسی امراض کی تشخیص کے مرکز اور علاج کے رہائشی شفاخانے کھولے گئے۔

یاد رہے کہ یہ مرکز آج سے تقریباً بیس سال پہلے کھولے گئے تھے اِس وقت آتشک اور سوزاک کی تشخیص اور علاج کے طریقے مقابلتہً گھٹیا تھے۔ علاوہ ازیں سوویت یونین اقتصادی مشکلوں میں بُری طرح گرفتار تھا اور اس کے لیے ڈاکٹری سامان اور دوائیاں وساور سے منگوانا تقریباً ناممکن تھا۔ اِس کے باوجود یہ شفاخانے اِس قدر کامیاب رہے کہ ان کے سامنے ہمارے ہاں کی تمام طبّی مہمیں ہیچ ہیں۔

اِس کا سبب بالکل واضح اور عام فہم ہے۔ سوویت روس میں ان شفاخانوں یعنی "صحت گاہوں" کو عصمت فروشی اور بدکاری کے اِنسداد کی مہم کا ایک جزو بنا دیا گیا۔ ان کی کوئی جداگانہ حیثیت نہ تھی۔

اِن مرکزوں کو ابتدا ہی سے اِس طرح منظم کیا گیا جس طرح صحت افزا پہاڑی مقامات پر تپ دق کے اسپتالوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ان میں رہائشی مریضوں اور عام بیماروں، دونوں کا علاج ہوتا تھا۔ مہم کے آغاز میں بڑے بڑے شفاخانوں نے اپنی تمام تر توجہ صرف طوائفوں پر مرکوز کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن پیشہ ور عورتوں کے خلاف ضابطہ فوجداری کو اندھا دُھند اِستعمال نہیں کیا گیا۔ عدالتوں نے ایسی طوائفوں کو بھی پیشہ جاری رکھنے پر سزا نہ دی جنھیں معلوم ہوتا کہ ان سے دوسروں کو بیماری لگ سکتی ہے۔ کیونکہ انھیں ایک ایسی سماجی علت کی شکار مانا جاتا تھا۔ جو ان کے بس کی بات نہ تھی۔

کوئی ملزم طوائف عدالت میں پیشی بھگت چکتی تو اس سے معزز شہریوں کی ایک کمیٹی ملاقات کرتی اور اسے شفاخانے میں داخل ہونے پر راضی کرتی۔ تاکہ کم سے کم اس کی حالت اتنی بہتر ہو جائے کہ اس سے دوسروں کو بیماری لگنے کا احتمال نہ رہے۔

اس طریقہ کار پر عمل شروع ہوا تو ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے ہاں کی نرسیں اور ڈاکٹر اس مسئلے سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایسی عورت کا علاج لاحاصل ہے جو پھر سے پیشہ شروع کر دے اور جلد ہی دوبارہ بیمار ہو جائے۔

اشتراکی سائنس دانوں نے اس مسئلے کا حل بھی فوراً تلاش کر لیا۔ انھوں نے زنانہ شفاخانوں کو نئے سرے سے منظم کیا اور نئے ادارے کھولنے کی بجائے انہی صحت گاہوں کو فنی تربیت کے سکولوں اور ملازمت گاہوں میں بدل دیا۔

تاہم بنیادی مقصد یہی رہا کہ بیماروں کا علاج کیا جائے اور انھیں جلد از جلد شفا حاصل ہو۔ ان شفاخانوں میں مریض عورتوں کا داخلہ جبری نہ تھا۔ ان کی نگرانی کے لیے افسر مقرر نہ کیے گئے اور نہ ہی رازداری کا کوئی خاص پُرتکلف اہتمام کیا گیا۔ اس پلان کی خصوصیت یہ تھی کہ علاج کے دوران میں تمام مریضوں کو ایک ایسا پیشہ سیکھنے کا موقع دیا جاتا جو عام زندگی میں ان کے کام آسکے۔ چنانچہ علاج کے دوران میں ہی اکثر مریض کام سیکھ کر روپیہ کمانے لگے۔ اس کا نفسیاتی پہلو بالکل واضح ہے۔

سزا، وعظ و تلقین یا نفسیاتی علاج کی بجائے زیر علاج عورتیں علم و فن ملازمتیں اور باعزت روزگار سے روپیہ حاصل کرنے لگیں۔ ان مریضوں میں بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو کسی طرح بھی پیشہ ور نہ تھیں۔ وہ ایسی بے روزگار لڑکیاں تھیں جو زار شاہی میں باعزت روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

جب بیمار لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد اس قابل ہو جاتی کہ ان سے دوسروں کو بیماری

لگنے کا خدشہ نہ رہتا تو انھیں شفاخانے کی بجائے اپنے گھروں میں سونے کی اجازت دے دی جاتی۔ لیکن دن کے وقت تربیت اور مزید علاج کے لیے شفاخانوں میں باقاعدہ حاضر ہوتی تھیں، اچھی اور بری عورتوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ تمام مریضوں میں یہ احساس پیدا کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو ایسے شہریوں سے گھٹیا خیال نہ کریں جو آتشک اور سوزاک کی بجائے دوسری بیماریوں مثلاً تپ دق وغیرہ میں مبتلا ہیں اور انہی کی طرح مختلف شفاخانوں میں زیر علاج ہیں۔

اس طرح سوویت یونین کی صحت گاہیں عملاً منظم بدکاری یعنی عصمت کی تجارت کے خلاف جدوجہد کے مرکز بن گئے۔ تھوڑے عرصے میں ماسکو شہر کے شفاخانوں میں پچاس لاکھ روبل سالانہ کی مالیت کی اشیائے استعمال تیار ہونے لگیں۔ یہ مرکز لوگوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ پہلے پہل رضاکار عورتوں کے دستے چکلوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو شفاخانوں میں مفت علاج کرانے کی ترغیب دیتے تھے۔ رضاکار عورتوں کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح پیشہ ور عورتوں کے دل سے یہ خوف نکالا جائے کہ شفاخانے دراصل نئی قسم کی جیل ہیں۔ اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔ تو اکثر طوائفیں خود بخود شفاخانوں میں آنے لگیں۔ چونکہ اس سلسلے میں جو پروپیگنڈا کیا گیا اس کی بنیاد ان اطلاعات پر تھی جو مشہور رسوا نامے کے ذریعے اکٹھی کی گئی تھیں۔ اس لیے علاج معالجے کے اس نئے طریقے کو مقبول بنانے کی ہر کوشش حقیقت پسندانہ تھی اور اس کی کامیابی لازمی تھی۔

منتظمین نے جلد ہی یہ فیصلہ کیا کہ جو عورتیں شفاخانوں میں زیر علاج ہیں، وہ کم سے کم دو سال اور وہیں رہیں۔ اس دو سال کی مدت میں وہ مدت شامل نہ تھی جو ابتدائی علاج میں صرف ہوئی تھی۔ اس فیصلے کے بعد شفاخانوں کے درکشاپوں کا

انتظام جمہوری اصولوں کے مطابق کیا جانے لگا۔ عورتوں نے اپنی قوت ایجاد سے کام لے کر خود ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا اور اس سے انحراف کرنے والی کے لیے سخت سے سخت سزا یہ تجویز کی گئی کہ اسے شفاخانے سے خارج کر دیا جائے۔

اشتراکی صحت گاہوں کا اصل کام جنسی بیماریوں کی روک تھام تھا۔ کیا وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئیں؟

اس کے جواب میں ایک ہی مثال کافی ہے جو اعداد و شمار کی بھاری بھرکم کتابوں پر حاوی ہے۔ امریکہ میں جنسی بیماری کے انسداد کی کوشش ایک مدت سے جاری ہے اس پر بھی امریکہ میں جو صورت حال پائی جاتی ہے۔ اس کا مقابلہ ان نتائج سے کیا جائے جو روس میں صحت گاہوں کے قیام کے بعد حاصل ہوئے جن کا مقصد نہ صرف جنسی بیماری کی روک تھام تھا بلکہ اس سے بھی بڑے مسئلے کا حل یعنی عام اخلاقی اصلاح کرنا تھا۔ تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

امریکہ کے محکمہ صحت عامہ کے منتظمین نے بڑے فخر سے اعلان کیا ہے۔ کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک پانچ سال کے عرصہ میں جنسی بیماری کے انسداد پر جو دوائیں ریاست میں صرف ہوئیں ان کی مقدار پہلے سے دوگنا تھی۔ لیکن دو سال بعد نتیجہ نکلا کہ جنسی بیماریوں کے متعلق فہم کو تیز تر کرنے اور طریقہ علاج کو بہتر بنانے کے باوجود آتشک اور سوزاک پہلے سے بھی زیادہ پھیل گئے۔

سوویت یونین میں انسدادی مہم کو ۱۹۲۶ء کے قریب باقاعدہ اور مؤثر طریقے پر منظم کیا گیا۔ اگلے پانچ سال تک اسے بڑھایا گیا۔ ۱۹۳۱ء کے اختتام تک یہ سکیم اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ مریضوں کے فقدان کے باعث شفاخانوں کے دروازے بند ہونے لگے۔ اس کے دو سال بعد جنسی بیماریوں کے خاص انسدادی مرکز بالکل بند ہو گئے۔

۱۹۳۸ء تک سُرخ فوج اور بحریہ سے آتشک اور سوزاک کو بالکل ختم کر دیا گیا۔ اور شہری آبادی میں اس بیماری کی حیثیت، صحت کے ایک معمولی مسئلے کی رہ گئی کیونکہ اس وقت تک تمام صحت گاہیں بند ہو چکی تھیں اور عصمت فروشی ختم ہو چکی تھی۔

اس حیران کن مہم کی مزید تفصیلات دوسرے ذریعوں سے مل سکتی ہیں۔ ڈاکٹر ٹے۔ اے۔ اسکاٹ نے ۱۹۴۵ء میں برطانیہ کے ماہرین کے سامنے سوویت یونین کے کام کا جائزہ لیا جو جنسی بیماریوں سے متعلق برطانوی رسالے کے مارچ ۱۹۴۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر موصوف نے بیان کیا، کہ اشتراکی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے روس میں صرف تیرہ میڈیکل سکول تھے۔ اور آج ستر ہیں ۱۹۱۴ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ زار کی سلطنت میں آتشک کی وبا دُنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ یاکوت کے علاقے میں تیس فی صد آبادی آتشک میں مبتلا تھی۔ ماسکو شہر میں اس کی شرح ۳۳۸ فی دہ ہزار تھی۔ اس بیماری کے عام انتشار کے سبب کے علاوہ روس کے ڈاکٹروں کو بعض نئے اسباب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ سب جنسی اختلاط نہ تھا۔ اس مرض کے پھیلاؤ کے دوسرے اسباب ہمہ گیر قسم کی رسمیں تھیں۔ مثلاً مقدس تصویروں کو بوسہ دینا، مشترکہ حقّہ نوشی اور بچّوں کو دانتوں سے چبا کر روٹی کھلانا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کے بعد ڈاکٹر برنز کو خاص طور سے ان گندی رسموں کے خلاف تعلیمی مہم چلانے کا کام سونپا گیا۔

طوائفوں کے علاج کے لیے جو اقدام کیے گئے ان کے علاوہ ملک کی آبادی میں جنسی وباؤں کے انسداد کے لیے ایک خاص اور وسیع تنظیم بنائی گئی۔ ڈاکٹر اسکاٹ کے قول کے مطابق جنسی بیماری کی ڈسپنسریاں جن میں سے اکثر حرکت پذیر تھیں۔ دوسرے طریقوں سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئیں۔

یہ ڈسپنسریاں دراصل باقاعدہ اور مکمل شفاخانے تھے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ

یہ چلتے پھرتے شفاخانے سال میں ایک مرتبہ اپنے علاقے کے ہر باشندے کے پاس ضرور گئے۔ چھوٹی سے چھوٹی ڈسپنسری میں دو طبّی ماہر، دو غیر سند یافتہ طبّی کارکن، ایک معائنہ کرانے والی عورت، ایک منشی اور دو اردلی ہوتے تھے، قانون کے رو سے کم سے کم اتنے عملے کا ایک ڈسپنسری میں موجود ہونا ضروری تھا۔ ہر ڈسپنسری میں آتشک اور سوزاک کے جراثیم اور مریض کے خون کا معائنہ کرنے کا پورا سامان موجود تھا۔ اور ان میں مردوں اور عورتوں کے علاج کے لیے علیحدہ جگہ اور وقت کا انتظام بھی تھا۔ کسی زمانے میں سوویت یونین میں چلتی پھرتی قسم کے تقریباً دو ہزار شفاخانے تھے۔ جنسی بیماریوں کے انسداد کے بعد انہی ڈاکٹروں نے ان شفاخانوں میں جلد کی متعدی بیماریوں کی تشخیص اور علاج کا کام شروع کر دیا۔

ان ڈسپنسریوں کے اسٹاف کے ذمے طبّی اور سماجی دونوں قسم کے کام تھے۔ یہ لوگ جنسی بیماری، عصمت فروشی اور عام جنسی مسائل پر لیکچروں اور مختصر عرصے کے تدریسی نصابوں کا انتظام کرتے تھے۔ فلموں، اشتہاروں اور نمائشوں کے ذریعے عوام کی حمایت حاصل کی جاتی تھی، اسی کام کا نتیجہ تھا کہ عوام کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت، نفرت اور مزاحمت نہیں ہوئی۔ اور ہمہ گیر ڈاکٹری معائنے کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ جو لوگ ایک بار شفایاب ہو جاتے تھے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی جنسی بیماری میں دوبارہ مبتلا پایا گیا۔

ڈاکٹر اسکاٹ بیان کرتے ہیں کہ روس میں جو عورتیں یا مرد ارادتاً یا دانستہ بیماری کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ یا دوسروں کو یہ مرض لگاتے ہیں وہ ملک کے قانون کے مطابق چھ مہینے سے تین سال تک کی سزا کے مستوجب ہیں۔ لیکن اختیارات کو استعمال کرنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے۔

ڈاکٹر اسکاٹ بتاتے ہیں کہ سوویت یونین میں جنسی بیماریوں کے جدید شفاخانے آرسینی کلز ARSENICALS اور سلفانوامائیڈز SULFONAMIDES ہر دو کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات پنسلین PENCILLIN کی ایجاد سے پہلے کی ہے جنسی بیماری کے علاج کے لیے سوویت یونین کے ڈاکٹروں نے جو دوائیں تیار کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کامیاب دوا گلوکوز ٹریپٹوسائیڈ GLUCOSTREPTOCIDE ہے۔ جو گلوکوز مالی کیول GLUCOSEMOLECULE اور سلفانوامائیڈ کا مرکب ہے

جرمن حملے سے پہلے روس میں آتشک کی ابتدائی اور وبائی صورتوں کا قلع قمع کیا جا چکا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں ماسکو کے میڈیکل سکولوں میں ڈاکٹری کے طالب علموں کے مشاہدے کے لیے بھی کوئی مریض دستیاب نہ ہوتا تھا، البتہ سوویت یونین میں تیسرے درجے کا آتشک ابھی تک پایا جاتا ہے جو بیماری لگنے کے تیس سال بعد یکایک پھوٹ پڑتا ہے۔ لہٰذا وہاں آتشک کی بیماری کے اس درجے کی تشخیص اور علاج ابھی تک جاری ہے۔

ڈاکٹر اسکاٹ کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر آرنارگن نے کہا کہ روس کی فیکٹریوں میں حفظانِ صحت کا جو وسیع کام ہوا ہے۔ اس کا مقابلہ اس کام سے کیا جائے جو آجکل انگلستان میں ہو رہا ہے تو روس کی کامیابی ہمارے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری وزارتِ صحت اور وزارتِ محنت فیکٹریوں میں حفظانِ صحت کے کام کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ لیکن وہ اپنے منصوبے میں روس سے بہت پیچھے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے دونوں حکومتوں کے طرزِ عمل کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا کہ دو سال پہلے یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ کہ وزارتِ محنت جس کتابچے کو فیکٹریوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اس میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ جس مرد یا عورت کو جنسی بیماری کا شبہ ہو۔ اس کے لیے ڈاکٹر سے

مشورہ طلب کرنا یا کسی شفاخانے میں جاکر تشخیص کرانا ضروری ہے۔" لیکن وزارت صحت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

ایک اور ماہر نابیروف نے اس مہم کا حوالہ دیا جو روس کے دیہات میں جنسی امراض کے انسداد کے لیے چلائی گئی اور بیان کیا کہ اگر سوویت یونین جیسے وسیع ملک میں ایسی صورت حال پیدا کی جاسکتی ہے تو بشرط ارادہ برطانیہ عظمیٰ جیسے چھوٹے سے ملک میں ایسی مہم نتیجوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں نیت ہی نہیں۔ عمل کا تو ذکر ہی کیا۔

ظاہر ہے مندرجہ بالا حقائق کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ تمام سرمایہ دار ملکوں کے سائنسدان اور صحت عامہ کے منتظمین جنسی بیماری پر قابو پانے کے لیے تحقیق اور علاج کی ہر سہولت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہیں۔ وہ سوزاک اور آتشک کے لیے ایک دن اور ایک ہفتے کے مؤثر علاج دریافت کرنے میں کوشاں ہیں۔ چونکہ شہری آبادی کی بہ نسبت افواج میں سخت اقدام کرنا سہل ہے۔ اس لیے انھیں افواج میں قدرے کامیابی رہی ہے۔ لیکن ان کے سامنے مستقبل اور مقصد کیا ہے؟

ہمارے ہاں کے سائنس دان رفتہ رفتہ اس رائے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ جو ۱۹۴۳ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ کے ایک افسر ڈاکٹر داجرای ہیرنگ نے نیویارک کی تپ دق اور صحت کی انجمن کے سامنے پیش کی تھی۔

"جنسی بیماری پر قابو پانے کے کام میں کسی پراسرار شعبدہ بازی کی ضرورت نہیں بلکہ مسئلے کی اہمیت کے احساس، بیماری کے خاطر خواہ علم، انسانی خدمت کی معمولی سی واقفیت اور اس یقین کی ضرورت ہے کہ کچھ کیا جاسکتا ہے اور ضرور کرنا چاہیئے۔"

اس نے یہاں تک کہہ دیا "کہ یہ بیماریاں چھوت کی بیماریاں ہیں۔ ذلت کی بیماریاں

نہیں۔ طوائف جرائم پیشہ نہیں۔ وہ تو ایک سماجی مسئلہ ہے جو پہلے ہی ایک طبّی مسئلہ بن چکی ہے یا جلد ہی بن جائے گی۔ مجرم اس کی لوٹ کھسوٹ کرنے والے ہیں۔"

مندرجہ بالا بیان کو جنسی بیماری کے خاتمے کے پروگرام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تاہم اس میں چند بنیادی امور کو ضرور چھوا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہیرنگ نے اِس واہیات مقالے کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دلائی جیسے مسٹر پال ڈی کروئف نے ایک رسالے میں "آتشک کا ایک روزہ علاج" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کے جھوٹے سائنسی خیالات اور آتشک کے علاج کے نام نہاد ترقی یافتہ طریقے اِس خوف کو مار رہے ہیں جو بسا اوقات جنسی بیماری کو روکنے میں مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں امریکی محکمہ صحت عامہ نے اعلان کیا کہ امریکہ کی شہری آبادی میں سوزاک کی بیماری میں گیارہ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ غالباً اس کا سبب علاج کے ان سنسنی خیز طریقوں کا پراپیگنڈا ہے جن میں زود اثر دوائیں اِستعمال کی جاتی ہیں۔"

تجربہ شاہد ہے کہ طبّی تحقیقات نے جنسی بیماری کے علاج کے طریقوں کو بہتر بنایا تو اس کے ساتھ ہی بیماری کا خوف کم ہو جانے کی وجہ سے اخلاقی دباؤ کمزور پڑ گیا۔ اِس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ طبّی سرگرمیوں کو تیز تر کر دینے کے باوجود بیماری میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ایک ایسی دوا کی ایجاد کے لیے بڑے پیمانے پر تجربے کیے جا رہے ہیں۔ جس کو استعمال کر کے بازاری عورت کے پاس جائیں تو آتشک اور سوزاک کی بیماری لگنے کا ڈر نہ رہے۔ ان کوششوں کا زنا اور عصمت فروشی پر جو اثر پڑے گا۔ وہ ظاہر ہے۔ یہ کتنا تکلیف دہ امر ہے کہ ہمارے بہت سے طبّی ماہر جو صحت عامہ کو بہتر بنانے کی غرض سے جنسی وبا کے مسئلہ میں بُری طرح مصروف ہیں، وہ اتنے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کہ

عصمت فروشی کی محض اِس لیے مخالفت کرتے ہیں۔ کہ اِس سے جنسی بیماری پھیلتی ہے۔ بعض ڈاکٹر تو بدکاری اور بداخلاقی کے وسیع مسائل پر غور کرنے کو بھی حماقت تصور کرتے ہیں اور مصر ہیں کہ ان مسائل سے سائنس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ دلیل غیر شعوری طور پر اس مکروہ عیاری کی حمایت میں جاتی ہے۔ جو آج بھی جنسی بیماری کے خلاف قومی پیمانے پر انسدادی مہم چلانے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ ہم برطانیہ کی وزارتِ محنت کے رویے پر ڈاکٹر نارگن کی تنقید اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اِس قسم کا رجحان بر عظیم امریکہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ نیویارک سٹیٹ میڈیکل جرنل کے مارچ ۱۹۴۳ء کے شمارے میں بتایا گیا کہ جب ہیلتھ کمشنر ڈاکٹر ارنسٹ ایل اسٹینز نے سکولوں میں حفظانِ صحت کی تدریس کی تجویز پیش کی تو اعلیٰ تعلیم کے بورڈ نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اس کے ایک سال بعد امریکی محکمہ صحت عامہ اور دفتر اطلاعات جنگی کو سماجی بیماریوں کے انسدادی طریقوں کی عام تعلیم کی نئی اور حوصلہ افزا مہم منسوخ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مذہبی مشیروں کے ایک گروہ نے اِس فلم کی تجارتی تھیٹروں میں تقسیم روک دی جس کا نام "امریکی عوام سے" تھا۔ اور جس میں جین ہرشولٹ نے کام کیا تھا۔ اور جسے والٹر وینگر نے تیار کیا تھا۔ لہٰذا ساری مہم شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔

ماہ ستمبر میں امریکی محکمہ صحت عامہ اور دفتر اطلاعات جنگی نے رائے عامہ کو دوبارہ باخبر بنانے کی کوشش کی اور اِس سلسلے میں ڈاکٹر پیرن نے مجلس نشریات جنگی سے خط و کتابت بھی کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ مجلس اس وقت تمام بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں نشر و اشاعت کی مہم چلا رہی تھی۔ لیکن اس پر سخت دباؤ ڈالا گیا۔ کہ وہ اس کام کو ترک کر دے۔ اس ضمن میں جو اشتہارات تیار کیے گئے تھے۔ ان پر اشاعت سے

پہلے ہی گندے، اخلاق سوز اور مکروہ ہونے کا لیبل لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر پیرن نے جواب میں کہا کہ یہ سکیم سائنسی بنیادوں پر تیار کی گئی ہے۔ جنسی اخلاق سکھانا گھر، اور سکولوں کا اہم فریضہ ہے۔ چونکہ یہ وبائیں بے حد خطرناک ہیں۔ اس لیے جنسی بیماریوں سے "پبلک ہیلتھ" کے اداروں کی ذمہ داری ہے۔ میں پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ اس مہم کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے اور شہریوں کا تعاون حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔"

مجلس نشریات جنگی نے جواب دیا کہ ہمیں "جنسی بیماری کی نزاکت اور خطرے کا پورا احساس ہے، لیکن اس مہم کی متنازعہ فیہ نوعیت کے پیش نظر" ہم مجبور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسی نیک مہم کے سپرد تاڑ کی جتنی بھی مذمت کی جائے تھوڑی ہے۔ دراصل عام تعلیم کی بجائے سازشی لوگ ہی مکروہ اور اخلاق سوز ہیں۔ خیر ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان حضرات کے ارادے خواہ کچھ بھی ہوں۔ انھیں اپنی مکروہ حرکتوں کے لیے تمام تر مواد اس افسوسناک ذہنی اُلجھاؤ سے ملتا ہے جو طبقی حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ زارشاہی روس میں جو صورت حال پائی جاتی تھی۔ اس کا مقابلہ ان حقائق سے کرنا دلچسپی سے خالی نہیں جو ہمارے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے چوری چھپے گھروں میں دھندا کرنے والی عورتوں سے جتنے مردوں کو بیماری لگی تھی، ان کی تعداد ایسے مردوں سے دُگنی تھی۔ جن کو بازاری عورتوں سے بیماری لگی تھی۔ حالانکہ اوّل الذکر عورتوں پر سخت قسم کی طبّی نگرانی تھی۔ اور دوسری پابندیاں عاید تھیں آجکل ڈاکٹری معائنے کے فن اور علاج میں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے لیکن صورت حال کیا ہے؟

جنسی بیماری کے مذکورہ بالا اسباب کا مطالعہ حال ہی میں امریکی محکمہ صحت کے ایک افسر ڈاکٹر بائکوم جانسن نے کیا ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ چکلوں کے

سرپرستوں کو جنسی بیماری سے محفوظ رکھنے میں جدید ترین طریقے بھی ناکام رہے ہیں جو لوگ روس کے زرد پٹے کے نظام کا حال پڑھ کر حیران اور خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے مذکورہ نتیجہ جنگ کے دوران میں ٹیکساس کے شہر ایلپاسو کی صورت حال کے مطالعے کے بعد نکالا تھا۔ اس شہر میں کبھی عصمت فروشی کے نو اڈے تھے۔ اور وہ ان سپاہیوں کی جیب سے دو پیسہ کھینچ رہے تھے جو قریب ہی قلعہ بلس میں تربیت پا رہے تھے۔ فوجی افسروں نے ان اڈوں کو جبراً بند کرا دیا تو یہی اڈے سرحد پار میکسیکو کے شہر جوارز میں منتقل ہو گئے اس کے کچھ عرصے بعد اطلاع ملی کہ فوج میں جنسی بیماری کم ہو گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جانسن نے دو حیران کن حقائق کا انکشاف کیا۔ اس نے اپنی رپورٹ "جنسی بیماری سے متعلق" جلد ۲۳، مطبوعہ جنوری ۱۹۴۲ء میں بتایا کہ "عصمت فروشی" کے اڈوں کو سرکاری طور سے بند کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپتالوں کے ڈاکٹروں نے جنسی بیماری میں معتدبہ کمی کی رپورٹ دی۔ لیکن ساتھ ہی زیر علاج سپاہیوں کی تعداد بڑھ گئی۔

اعداد و شمار کے اس تضاد کی تشریح بالکل آسان ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے خیال کیا کہ وہ اڈے درحقیقت بند ہو گئے۔ حالانکہ ہوا صرف یہ کہ ان کے مالک ان اڈوں کو ٹیکساس کی سرحد کے پار لے گئے۔ اور ڈاکٹروں نے اس خوف سے رپورٹ میں نئے مریضوں کی تعداد بتانے میں تامل کیا کہ یہ امر فنی نقطۂ نظر سے درست نہ تھا۔ تقریباً ہر شہر میں سالہا سال سے دیکھا جاتا ہے کہ بدکاری کے خلاف پولیس ذرا سخت رویہ اختیار کرے تو حقائق کو بالکل اسی طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ چکلے بند کر دئے جاتے ہیں۔ تو اس کے بعد زود یا بدیر پہلے مقام کے حدود سے باہر حسب معمول کاروبار

جاری ہو جاتا ہے۔ یا پھر شراب خانوں، نائٹ کلبوں، سیاحوں کے کیمپوں وغیرہ میں دھندا شروع ہو جاتا ہے، پولیس کا تشدد بہت ہی بڑھ جائے تو بدمعاشی اور بدکاری کے جدید ناظم کرائے کی گاڑیوں میں چلتے پھرتے اڈے قائم کر لیتے ہیں۔ ہمارے عورتوں کو اس طرح منتشر کرنے اور تمام قوم کے لیے خطرناک نتائج پیدا کرنے کے واقعات کے علاوہ ہم اُوپر ایسے اعداد و شمار بھی درج کر چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھیں پیشہ ور عورتوں کی بجائے وکٹری گرلز سے بیماری لگتی ہے۔

روس میں جنس کی باقاعدہ تجارت ہوتی تھی۔ اس نظام میں اور اس بدکاری اور بدمعاشی میں جو ہمارے ملکوں میں دن رات ترقی کر رہی ہے، عملاً کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ روس میں بدکاری پر سخت وحشیانہ نگرانی تھی اور عصمت فروشی کے وجود کو عام تسلیم کیا جاتا تھا لیکن ہم اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ہمارے ہاں سماج کے بالکل نچلے طبقوں میں ہی عصمت کی تجارت ہوتی ہے۔ آجکل ہم اتنے سائنس پرست ضرور ہو گئے ہیں کہ آتشک اور سوزاک کے متعلق بلا جھجک پڑھتے اور بات چیت کرنے لگے ہیں۔ لیکن ہم اس سے آگے نہیں بڑھتے، ہمارے ڈاکٹر بڑے دھڑلے سے دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ وہ عقل اور سائنس کے پجاری ہیں۔ ان کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آج تک عام فریب کاری اور خوش فہمی کو طبّی زبان کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ ہمارے اجداد کے زمانے کی واہیات مہموں کو دہرا رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ احیا پرستانہ وعظ سے کام لیتے تھے اور ہم زود اثر ادویات اور پنسلین سے کام لیتے ہیں۔

جس پریشان کن ذہنی اُلجھاؤ کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس سے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل یہ مضحکہ خیز بحث جاری ہے کہ منظور شدہ چکلوں میں جو بدکاری ہوتی ہے وہ مقابلتہً کم خطرناک ہے۔ یا وہ بدمعاشی جو ایسے خلاف قانون

اڈّوں میں جاری ہے جنھیں پولیس خفیہ یا ظاہری طور پر برداشت کر رہی ہے۔ اِس بحث کا مقصد اس مکروہ کردار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کہ ہم کیسے جی بھر کر عیاشی کرنے کے باوجود جنسی بیماری سے محفوظ رہیں۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ آج سے کافی عرصہ پہلے زارشاہی رُوس میں اِس بحث کو اپنے آخری اور تلخ نتیجے پر پہنچایا گیا۔ ذرا بنیادی امور کو لیجیے جنسی بیماری کس طرح لگتی ہے؟ ابتداً جنسی فعل سے۔ مرد اور عورت اِسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مردوں اور عورتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا نہیں جا سکتا، ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ انھیں نظر بند کرنا بھی محال ہے۔ انھیں ہسپتالوں میں بھی بند نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ لاکھوں مریضوں کے لیے بے شمار اداروں کی تعمیر و تنظیم ناممکن ہے اور بیمار اشخاص کو دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے سے روکنا بھی آسان کام نہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ ہمیں اسی شیطانی چکر میں اُلجھائے رکھتا ہے۔

اِس مایوس کن صورت حال سے یہ عقیدہ جنم لیتا ہے کہ منظم بدکاری یعنی عصمت کی تجارت اور جنسی بیماری، ہر دو ابدی چیزیں ہیں۔ لیکن ہم آجکل کے ترقی یافتہ اور جدید مہذب زمانے میں یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ آتشک اور سوزاک جیسے ہلاکت آفرین طاعون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لہٰذا طبّی نقّارے پر چوٹ پڑتی ہے اور ہم دوبارہ اسی چکر میں پھنس جاتے ہیں۔

گذشتہ دو برس میں ایک بالکل نیا اور نازک سا واقعہ رونما ہوا ہے جس سے جنسی بیماری کے متعلق رائے عامہ اور اُلجھ گئی ہے۔ ہمارے ڈاکٹر ایسے سفید پوش مجاہد تو نہیں ہیں۔ جن کا سائنسی تقدس کسی شُبہ سے بالا ہو۔ اِس لیے طبّی تحقیقات نے خاص طور سے جنسی بیماری کے معاملے میں انوکھا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ان میں سے

ایک تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ بدکاری اور بدمعاشی کو تمام مردوں، عورتوں اور نوجوانوں کے لیے بے ضرر بنا دیا جائے۔

جو بادری فوجوں میں ملازم ہیں وہ اِس تحقیق کو بڑی تشویش ناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ کسی قاری کو حقیقت حال کا پورا علم نہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ امریکی فوج کے دو ڈاکٹروں، کرنل ولیم وُنٹسن اور کیپٹن جیمز لولیس کی رپورٹ کا مطالعہ کرے جو امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے سرکاری ترجمان کے ۱۳ مارچ ۱۹۴۳ء کے شمارے میں چھپی ہے۔ اِس سائنسی رسالے میں اِس تجربے کا ذکر ہے جو پانچ ہزار امریکی سپاہیوں پر کیا گیا۔ اس سے پیشتر کہ یہ سپاہی اتوار منانے کے لیے قلعہ چھوڑتے، انھیں جدید ترین مانع مرض دوائیں استعمال کرائی جاتیں۔ چنانچہ مشاہدہ کیا گیا کہ جن سپاہیوں کو یہ دوائیں استعمال نہیں کرائی گئی تھیں ان کے مقابلے میں اوّل الذکر گروہ کے بہت کم سپاہیوں کو یہ بیماری لگی۔ اب اِس طریقے کو مزید آزمایا اور بہتر بنایا جا چکا ہے لیکن اِس کی اشاعت نہیں کی جا رہی۔ "ماہرین" کا خیال ہے کہ یہ تجربہ مکمل ہو گیا تو جنسی بیماری پر قومی پیمانے پر کنٹرول کیا جا سکے گا۔

ہماری رائے میں عصمت فروشی، بدکاری اور نوجوانی کے جرائم کا انسداد قطعاً ناممکن ہو جائے گا۔ ہم اس طبّی طریقے کو قبول کر لیں تو کسی قسم کے کنٹرول کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ فوجی ڈاکٹروں میں دن بدن یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ سماجی اصلاح کے ادارے بدکاری کے خلاف اپنی تمام سرگرمیاں ترک کر دیں۔ پیشہ ور شوقین طوائفوں کے خلاف مزید اقدام کرنا بند کر دیں۔ اور جنسی بیماری کے انسداد کے لیے حفاظتی دواؤں کا آزادانہ استعمال کریں۔ ایک مکتبہ خیال سے تعلق رکھنے والے سائنس دان تو ایسا فیصلہ

کر بھی چکے ہیں۔ اِس مکتبۂ خیال کے حامی اپنا پراپیگنڈا ابھی احتیاطاً ذاتی بحث مباحثے تک ہی محدود رکھتے ہیں اور رسالوں میں مبہم طبّی اصطلاحات اور تراکیب کے پردے میں اپنے مقصد کا پرچار کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی وہ زیادہ دلیر ہو جائیں گے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جمہوری ممالک کے اس فوجی اور طبّی اخلاقیات کے تباہ کن پہلو کے خلاف اگر کسی نے آواز بلند کی ہے تو وہ صرف فوجی پادریوں کی ذات ہے۔

لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ حفاظتی دواؤں کے ذریعے بدکاری کے مسئلے کو حل کرنے کی مخالفت محض مذہبی دلائل سے کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال آخرکار غیر مؤثر ثابت ہوگا۔ پادریوں کی نیت نیک ہے۔ اور اُن کا مقصد قابلِ تحسین ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنسی بیماری کا یہ نیا طریق انسداد وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا تو بے شمار لوگوں کی اخلاقی، سماجی اور خاندانی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ اس گندے نظریے کی مخالفت پر بالکل حق بجانب ہیں کہ ناجائز جنسی تعلقات کے بُرے اثرات کا انسداد مباشرت میں حفظانِ صحت کے طریقوں پر عمل کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔

صرف ایک لحاظ سے وہ سوویت یونین کے سرکاری نقطۂ نظر کے قریب ہیں اور ہم بلا خوف مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید پادریوں کے گناہ کے متعلق نظریے اور بداخلاقی کے بارے میں اشتراکی نقطۂ نظر میں صرف ایک ہی اختلاف کا پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے نظریے کی ایمانداری سے تبلیغ کی جاتی ہے۔ اور دوسرے نظریے پر کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔

# مہینے میں پانچ کروڑ مرتبہ

بدکاری کے خلاف سوویت یونین کی انسدادی جدوجہد کا مزید جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنسی بیماری یعنی آتشک کے تدارک کے لیے آج تک جو کچھ امریکہ میں کیا گیا ہے اس کے باقی ماندہ حصے کو بھی بیان کر دیا جائے۔ پرل ہاربر کے واقعہ سے لے کر آج تک امریکہ کے مختلف قدرتی خطوں میں جنسی بیماری کے خلاف جداجدا مگر وسیع پیمانے پر مہمیں چلائی گئی ہیں۔ یہ مہمیں سوویت یونین کی جدوجہد سے کئی طرح مختلف ہیں۔ خاص فرق یہ ہے کہ امریکی شہروں میں تمام تر توجہ جنسی بیماری کے طبی علاج پر مرکوز رہی، اور سوویت یونین میں سماجی بیماری کے سماجی محرکات کو دور کرنے پر زور دیا گیا۔

ابتدائی اقدامات میں وہ مہم خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جو شہر سیکرامنٹو کے محکمہ صحت نے اگست ۱۹۴۱ء میں شروع کی۔ اس وقت جنسی بیماری کی ہولناک وبا کا الزام طوائف اور وکٹری گرل پر دھرا جاتا تھا۔ چونکہ پولیس اور ڈاکٹر جن اقدامات کی سفارش کرتے تھے، ملک کا قانون ان پر عملدرآمد کی اجازت نہ دیتا تھا، اس لیے

محکمہ صحت نے اِس ہنگامی مسئلے کو نرالے طریق پر سلجھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جنسی بیماریوں یعنی آتشک اور سوزاک کے لیے ایک تجربہ گاہ کھولی گئی، اور شہر کے تمام مردوں اور عورتوں کو فوری توجہ کے لیے بُلایا گیا۔

اِس اقدام سے کیا مقصود تھا؟ اس کا جواب نہایت سیدھا سادا ہے یہ مرکز شام کے سات بجے سے صبح کے تین بجے تک کھلا رہتا تھا۔ کیونکہ انہی ساعتوں میں اکثر مرد بازار جاتے تھے۔ اس میں ایک ڈاکٹر ہر وقت حاضر رہتا تھا اور اس کے پاس ایسی دوائیں ہر وقت موجود رہتی تھیں، جو آتشک اور سوزاک کی بیماری لگ جانے کے فوراً بعد مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ "زنا ہ عامہ" کا یہ مرکز کتنا قابلِ نفرت تھا! یہ ایک عمارت کے سب سے نچلے کمرے میں واقع تھا، جس کا دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا۔ دروازے پر ایک سائن بورڈ ٹنگ رہا تھا، جس پر "انسدادی مرکز" کے حروف لکھے تھے۔ ان حروف پر سبز روشنی پڑتی تھی۔ مرکز کے اندر مختصر سا سامان تھا۔ تاہم دن کے وقت محکمہ صحت کے ملازم مزید دوائیں لے آتے تھے اور علاج معالجے کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے۔

نشر و اشاعت دو طریقوں سے کی گئی۔ اوّلاً، تمام طوائفوں اور آوارہ عورتوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ بیماری کی شرح کو اگر اِس سطح سے نیچے رکھنا چاہتی ہیں۔ جس پر پولیس کے لیے چھاپہ مارنا لازمی ہو جاتا ہے، تو انھیں چاہیئے کہ اپنے خریداروں کو نصیحت کریں، کہ وہ ہم آغوشی کے بعد احتیاطاً انسدادی مرکز کا رخ کریں۔ دوسرا طریقہ قدرے پیچیدہ تھا۔ سینکڑوں اشتہارات چھپوائے گئے اور ناچ گھروں، سرکاری دفتروں، شراب خانوں وغیرہ پر چسپاں کیے گئے۔ ان پر یہ مختصر سی عبارت درج تھی:۔

"جنسی بیماریوں کو روکا جا سکتا ہے۔
- خیراتی اسپتال۔
پندرہ منٹوں کے اندر۔
محکمہ صحت کے خیراتی شفاخانوں میں جائیے۔
شفاخانہ فلاں جگہ ہے
تربیت یافتہ ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہے۔"

---

یہ شفاخانہ کھلنے کے بعد چار مہینوں کے اندر تقریباً چار ہزار مرد اس میں داخل ہوئے ان میں تقریباً نصف شہری تھے اور نصف فوجی، ان کے قول کے مطابق بازاری عورت سے بیماری لگنے اور ہسپتال سے حاضری کے درمیان اوسطاً پندرہ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ چونکہ سخت رازداری ملحوظ تھی۔ اس لیے مریضوں کے متعلق کوئی ریکارڈ نہ رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس امر کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ یہ شفاخانے آتشک اور سوزاک کو روکنے میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہے ہیں۔ تاہم شفا پانیوالوں کی فی صد شرح کافی تھی۔ ان شفاخانوں میں مریض سے صرف یہ دریافت کیا جاتا تھا کہ اس نے کسی بازاری عورت سے فعل کیا تھا یا کسی پیشہ ور سے۔ یا عام شوقین عورت سے اور جواب محکمے کے رجسٹر میں درج کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کے اعداد و شمار جمع نہ کیے جاتے تھے۔ اور علاج کے مؤثر یا ناکام رہنے کا کوئی اندازہ نہ لگایا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ سکیم بنیادی طور سے غیر سائنسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شہر سکرینٹو کے شفاخانے کے ڈاکٹر رسل فرانظر نے رسالہ اطلاعات امراض جنسیہ کے شمارہ بابت ماہ اگست ۱۹۴۲ء میں اپنی رپورٹ شائع کی تو وہ اس شستہ بیان سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کہ "مؤثر مانع امراض کیمیائی دواؤں کو وسیع

پیمانے پر رائج کرنے اور شفاخانوں کے قیام کا مسئلہ کافی غور طلب ہے"!

دوسرے شہروں میں جو تجربے کئے گئے وہ بھی اسی قسم کے تھے۔ لہٰذا ان کے ذکر کے اعادے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں صورت حال یکسر بدل گئی۔ پنسلین کی وسیع پیمانے پر تیاری اور ہر دو جنسی امراض آتشک اور سوزاک میں اس کے کامیاب اور مؤثر استعمال سے ایک مرتبہ پھر نہ صرف جنسی بیماریوں کے انسداد بلکہ ان کے قطعی خاتمے کی توقع پیدا ہو گئی۔ فوج اور بحریہ میں ہزارہا مردوں پر تجربہ کیا گیا اور اس دوا کے اثرات کا گہرا مشاہدہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بہ یک وقت بے شمار بیماروں کے معائنے کے طریقے پہلے سے زیادہ مکمل اور بہتر ہو گئے۔ اس لئے طبی اور سماجی اعتبار سے اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ جنسی بیماریوں کے خلاف بڑے پیمانے پر مہمیں چلائی جائیں۔

سب سے پہلی مہم کا بندوبست ایلاباما میں کیا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں امریکی پارلیمان کا ایک ممبر بروس ہینڈرسن جو ضلع دل کوکس کا امیر جاگیردار تھا۔ یہ قانون منظور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ جو وہ اور پچاس سال تک کی عمر کے باشندوں کے لئے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانا لازمی ہے۔ ایک اور قانون کے ذریعے لازمی قرار پایا کہ معائنے کے بعد جو لوگ آتشک کے مریض نکلیں وہ اپنے گھرانے کے ڈاکٹر سے یا سرکاری ہسپتال میں مفت علاج کرائیں۔ یاد رہے کہ اس قانون کو قانون ساز اسمبلی نے بڑی قیل و قال کے بعد پاس کیا کیونکہ اس کے خواب میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بیماری اتنی پھیل چکی ہے کہ اس کے خلاف ایسی سخت اور وسیع جدوجہد کی ضرورت ہو گی جو دیکھنے میں آئی۔

مسٹر ہینڈرسن کے سامنے ایک واضح مقصد تھا اس کی جاگیر بہت بڑی تھی اور اس کی تمام رعیت جنسی بیماری میں مبتلا تھی لہٰذا ان کے علاج میں اسے نفع نظر آیا

ہر سال اس کے حبشی مزدوروں کے خون کا معائنہ مفت ہونے لگا تو اس کے طبی اخراجات کی مد میں ۵ فیصد کمی ہو گئی لہٰذا موصوف نے محسوس کیا کہ اسی طرح ریاست کے تمام قانون سازوں کے طبی اخراجات میں کمی ہو سکتی ہے۔ خون کے معائنے کے اخراجات کے لئے پچھتر ہزار ڈالر کی رقم منظور کی گئی اور سب سے پہلا تجربہ برمنگھم جیسے بڑے شہر میں کیا گیا۔ اس شہر کی آبادی ۵ ہزار کے قریب تھی۔ جن میں ۴۰ فیصد حبشی تھے۔ جو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کا شکار تھے۔ اور یہ انسانی لوٹ کھسوٹ جنوبی ریاستوں کا خاصہ ہے۔ وہاں حبشی آبادی پر پول ٹیکس عائد ہے اور ان کا معیار زندگی اور تعلیم بہت ہی پست ہے البتہ یہ مہم کالے اور گورے دونوں قسم کے لوگوں کے لئے چلائی گئی۔

نشر و اشاعت میں سنسنی خیز طریقوں سے کام لیا گیا۔ بڑے بڑے بازاروں میں ہر کہیں بڑے بڑے اشتہار لگائے گئے کہ "پنسلین سب سے بڑے موذی، مفلوج اور بانجھ کر دینے والے مرض سوزاک کو چار گھنٹوں میں ختم کر دیتی ہے"۔

"پنسلین کے استعمال سے آتشک کا علاج ۹ دن میں ہو سکتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ نوٹس بورڈ، شوکارڈ، کاریں ہر آدھ گھنٹے کے بعد ریڈیائی اعلانات غرضیکہ تجارتی پروپیگنڈے کی طرح ہر طریقے اور ذریعے سے کام لیا گیا۔ امریکہ کے محکمۂ صحت عامہ اور افواج کے محکمۂ حفظان صحت نے پورے تعاون سے کام کیا۔ بڑے بڑے سفید افسروں نے مہم میں حصہ لیا جن کی مدد کے لئے ہزاروں رضاکار عورتیں، لڑکیاں اور مرد نکل آئے اور انہیں تجارتی چیمبروں، ٹریڈ یونینوں، عورتوں کے کلبوں حتیٰ کہ کلیساؤں تک نے بھرتی کیا۔

اس وقت لوگوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہی برمنگھم

جہاں چند سال پیشتر آتشک اور سوزاک کے الفاظ سن کر شریف شہریوں کی آنکھیں بھٹی کی بھٹی رہ جاتی تھیں وہاں ان بیماریوں کے خلاف اس طرح جہاد شروع ہوا۔ گویا یہ ایک مدت سے معاشرے کا جزو بن چکی تھیں، اخباروں نے اس نعرے کو خاص طور سے اچھالا کہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے معائنہ گاہ میں ملئے۔

یہ مہم وسط مئی سے جون کے آخر تک جاری رہی اور یہ دنیا کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی مہم تھی اس سے پہلے خون کے معائنے کا بندوبست اس وسیع پیمانے پر نہ کیا گیا تھا۔ ہل مین میونسپل اسپتال میں ایک خاص ڈسپنسری کھولی گئی وہاں کے سابقہ کفن گودام میں معائنہ خون کی دنیا بھر میں سب سے بڑی تجربہ گاہ قائم ہوئی۔

یہ تجربہ گاہ جلد ہی "WILLOW RUN" (ولوران) کے نام سے مشہور ہو گئی اس کا سبب کام کی تیز رفتاری تھی کیونکہ اس میں سول اور فوجی ماہرین ایک دن میں دس ہزار اشخاص کے خون کا معائنہ کر ڈالتے تھے۔ بیالیس دن کے عرصے میں تین لاکھ اشخاص کا معائنہ کیا گیا۔ خون مختلف مقامات پر حاصل کیا جاتا تھا اور اس کے بے شمار نمونے کرائے کی گاڑیوں میں مذکورہ تجربہ گاہ میں روزانہ لائے جاتے تھے۔ معائنہ میز بنی کے طریق خوردبینی پر کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ سو فیصدی کامیاب نہ سہی لیکن اس وقت کے حالات میں موزوں ترین تھا کیونکہ اس میں بہت کم وقت صرف ہوتا تھا اور تفصیلی معائنے کا طریق قابلِ عمل نہ تھا۔ رضاکار عورتوں کو ایک دن میں ۲ ہزار نالیوں اور ۱۲ ہزار نلکیوں کو گرم پانی میں جوش دے کر جراثیم سے پاک کرنا پڑتا تھا۔

ظاہر ہے کہ خون کے نمونے کے تعین کا کام بہت زیادہ تھا۔ ہر معائنہ گاہ گویا الیکشن بوتھ تھا۔ ایک کلرک ہر شہری کا نام، پتہ، عمر، فون نمبر درج کرتا تھا اور اس کے بعد اسے ایک

شیشے کی نالی اور ایک سفید کارڈ دے دیتا تھا۔ ان دونوں پر ایک ہی نمبر لکھا جاتا تھا، تاکہ دوسروں کی نالیوں اور کارڈوں میں مل نہ جائیں۔ نالی خون کے معائنے کے کام آتی تھی اور کارڈ معائنے کا ثبوت تھا۔ چند دوسرے کلرک اسی قسم کے رنگین کارڈ تیار کرتے تھے، جن پر وہی اندراج کئے جاتے تھے اور ایسے اشخاص کی مزید پیروی کے کام آتے تھے جن کے خون میں بیماری کے جراثیم نکلتے۔

ہر شخص کے خون کے معائنہ کی تصدیق کے لئے سختی سے تحقیقات کی جاتی تھی، جو شخص پہلے سے بیمار ہوتے ان کے لئے حکم تھا کہ وہ اپنے پرائیویٹ ڈاکٹروں سے اپنے گھروں پر یا سرکاری ہسپتالوں میں معائنہ ضرور کرائیں۔ تمام شہری آبادی کے خون کے معائنے کی تصدیق کے لئے مذکورہ بالا کارڈوں کا راشننگ دفتر کے ریکارڈ سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ گویا معائنے سے بہت کم لوگوں کے بچ نکلنے کا امکان تھا اور جان بوجھ کر معائنہ سے بھاگنے والوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔

تجربہ گاہ کی رپورٹ معائنے سے ۴۸ گھنٹوں کے اندر مرکزی دفتر میں پہنچ جاتی تھی جس کسی شخص کا خون صاف ہوتا اس کا ریکارڈ بند کر دیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کو معائنے سے تین دن بعد تک محکمہ صحت کی طرف سے کوئی مراسلہ موصول نہ ہوتا وہ جان جاتے تھے کہ ان کا خون صاف ہے۔ لیکن تجربہ گاہ سے مثبت رپورٹ موصول ہوتی تو مریض کی پیروی خاص ماہرین کرتے تھے اور اس شخص کو خاص معائنہ کرانا پڑتا تھا۔

اس مہم کے دوران میں جتنے لوگوں کا معائنہ کیا گیا ان میں ۲ لاکھ ۹۰ ہزار کی عمر قانون کی مقرر کردہ حدود کے درمیان تھی۔ بعد میں اندازہ لگایا گیا کہ کل ۳ لاکھ اشخاص کا معائنہ کیا گیا جن میں مشکوک قسم کے لوگ اور ایسے اشخاص بھی شامل تھے جن کا دوبارہ معائنہ ہوا

اور نوے فیصد اشخاص رضاکارانہ طور پر معائنے کے لئے آئے۔

ان نتائج سے آتشک سے متعلق ان شماریات کی تصدیق ہو گئی جنہیں ڈاکٹر لوگ کئی نسلوں سے پیش کرتے آئے تھے۔ ۲ لاکھ ۹۰ ہزار میں سے تقریباً ۴۰ ہزار یا ۱۳٫۷ فیصد اشخاص آتشک کے مریض نکلے۔

ان دنوں علاج کے طریقے بھی تشخیص کے طریقوں کی طرح زیادہ موثر نہ تھے مثبت رپورٹ والے اشخاص کو بعض دوسرے مرکزوں میں جانا پڑتا تھا اور جب بیماری کی تصدیق ہو جاتی تو ان پر علاج اسی صورت میں واجب تھا جب ان کا مرض نام نہاد ابتدائی یا درمیانی منزل میں ہوتا لیکن سوزاک کے مریض کی کوئی تشخیص یا معائنہ نہ ہوتا تھا۔ آتشک کے مریضوں کے دوسرے معائنے کے دوران میں کوئی شخص سوزاک میں بھی مبتلا پایا جاتا تو اسے پنسلین کے ٹیکے لگائے جاتے۔ یہ علاج مفت تھا اور اس کی مدت چار گھنٹے تھی۔ شادی شدہ افراد کی صورت میں، بیوی اور خاوند دونوں کو پنسلین کے ٹیکے لگائے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں سہ افرادی طریق علاج بھی رائج تھا۔ تیسرے فرد کا علاج بیوی اور خاوند سے علیحدہ مگر اسی دن کیا جاتا تھا۔ آتشک کا علاج زود اثر طلب مگر پیچیدہ تھا، حالانکہ ۳۵ ہزار پرانے مریض ابھی علاج کے لیے منتظر بیٹھے تھے، لیکن سب سے پہلے پرانے مرض والوں کا علاج خاص مرکزوں میں کیا گیا۔ ان مرکزوں میں پنسلین، آرسینی کلز (ARCENICALS) اور بسموتھ BISMOUTH کی دوا استعمال کی جاتی تھی اور علاج کی مدت نو دن تھی۔

لیکن کچھ عرصے تک یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا یہ مہم کہاں تک کامیاب رہی۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ جنسی بیماری کسی خاص علاقے میں ایک دن کے لئے بھی محدود نہیں رہ سکتی۔ چونکہ ایلاباما میں ہر سال بہت تھوڑے اشخاص کی تشخیص اور علاج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہر علاقے میں الگ الگ مہم چلانا پڑے گی۔ عین ممکن ہے کہ

طحقہ علاقوں سے برمنگھم میں بہت سے مریض گھس آئیں اور وہاں دوبارہ بیماری پھیل جائے آج تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ آتشک کس تیز رفتاری سے پھیلتا ہے۔ توقع ہے کہ یہ مہم آئندہ سال تک اس سوال کا جواب بھی بہم پہنچا دے گی۔

جو تجربہ ایلاباما میں کیا جا رہا ہے اس سے نہ صرف جنسی بیماری کا علاج ہوا ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہ فائدہ ہوا ہے کہ اس برعظیم (امریکہ) میں لوگوں کو جنسی بیماری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ تعلیمی افادے کے پیش نظر دوسرے مقامات پر بھی اس تجربے کی تقلید ہونے لگی ہے۔

سوناح (جارجیا) میں جہاں ایلاباما کی طرح کوئی جبری قانون رائج نہیں، ماہ اکتوبر اور نومبر ۱۹۴۳ء میں سماجی بیماری پر اس سے بھی زیادہ دلچسپ حملہ کیا گیا، یہ مہم رضاکارانہ تھی اور صحت عامہ کی تاریخ میں بے مثال تھی کیونکہ اس میں آتشک اور تپدق دونوں مہلک بیماریوں کا بیک وقت ڈاکٹری معائنہ شامل تھا اور خون کے معائنے کے علاوہ ہر شخص کے سینے کا عکس ریز بھی کیا جاتا تھا۔

خیال ہے کہ یہ مہم برمنگھم والی مہم سے زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔ نشر و اشاعت سے یہ مہم عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ بازاروں میں جو اشتہار لگائے گئے ان میں لکھا تھا کہ

"تپدق کا علاج مرض کے ابتدائی درجوں میں ہی ممکن ہے آج کا عکس ریز کل کا محافظِ زندگی ہے۔"

اس مہم کے عروج کے دنوں میں بڑے بڑے مرکزوں میں مردوں اور عورتوں کی لمبی لمبی قطاریں معائنے کے لئے اپنی اپنی باری کی منتظر نظر آتی تھیں۔ جنسی بیماری اور تپدق کا علاج مفت تھا۔

امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل میں اکتوبر ۱۹۴۳ء میں جنسی بیماری کے خلاف ایک اور نئی مہم کی خبر چھپی جو آجکل تجربتہً جاری ہو چکی ہے۔ آجکل ان مہموں پر پریس میں عام تنقید ہونے لگی ہے اور نئی تجویزیں پیش کی جانے لگی ہیں۔ اس مہم کی تجویز کو پیش کئے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ حاملہ عورتوں کے خون کا معائنہ کر کے دیکھا جائے کہ وہ آتشک سے متاثر تو نہیں اور جو ہوں ان کا باقاعدہ علاج کیا جائے۔

اس تجویز پر الینائس میں ۱۹۳۹ء سے عمل ہو رہا ہے جبکہ وہاں حاملہ عورتوں کے تحفظ کے قانون کا نفاذ ہوا۔ پانچ سال کے عرصے میں کوئی ایک ہزار چار سو انچاس عورتیں آتشک کی مریض نکلیں، ان کا علاج ایک ہزار شناسی ڈاکٹروں نے کیا۔ قانون کی رُو سے ہر ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ ہر حاملہ عورت کے معائنہ خون کی رپورٹ مرکز کو بھیجے۔ خون کا معائنہ لازمی ہے۔ خواہ سرکاری تجربہ گاہ میں ہو یا منظور شدہ پرائیویٹ تجربہ گاہ میں۔ مثبت معائنے کی صورت میں رپورٹ کی ایک نقل تجربہ گاہ سے جنسی بیماری کے انسداد کے محکمے میں بھیجی جاتی ہے۔ اس محکمے کی سنٹرل رجسٹری (جہاں سارے محکمے کی ڈاک کی وصولی اور ترسیل کا کام ہوتا ہے) ہر تجربہ گاہ سے باقاعدہ رپورٹ وصول کرنے کی ذمہ دار ہے۔ کسی تجربہ گاہ سے رپورٹ موصول نہ ہو تو یاددہانی کرائی جاتی ہے۔ رپورٹ ملنے پر متعینہ ڈاکٹر کے پاس آتشک کے علاج کی دوائیں اور محکمہ صحت کا رسالہ دستور العمل بھیجا جاتا ہے۔

الینائس پلان کے آغاز کے وقت سلفونامائیڈز SULFONAMIDES اور پنسلین کا استعمال ابھی شروع نہ ہوا تھا اس لئے عام طور سے جو دوائیں استعمال کی جاتی تھیں، وہ گوشت میں سوئی کے ذریعے داخل کئے جانے والے بسموتھ کے مرکبات اور نسوں

میں داخل کئے جانے والے آرسینی کلز کے مرکبات تھے۔ حاملہ عورتوں کے آرسینی کلز کے ٹیکے آخری ایام میں لگائے جاتے تھے۔

اس قانون کی بڑی خامی اس کا جبری نہ ہونا ہے کوئی آتشک زدہ حاملہ عورت انکار کر دے تو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ میڈیکل سائنس ثابت کر چکی ہے کہ آتشک زدہ حاملہ عورت کا بچے کی پیدائش سے پہلے علاج نہ کرانا بچے کی موت یا اسے بری طرح اپاہج بنانے کے برابر ہے لہٰذا مذکورہ رعایت بہت بڑی غلطی ہے۔

اس کے باوجود یہ قانون بے حد کامیاب رہا۔ ساڑھے پانچسو مریض حاملہ عورتوں میں سے علاج کے بعد ۹۴ فیصد نے تندرست بچے جنے۔ مریض ماں کا علاج جتنی جلدی شروع ہوا اتنا ہی کامیاب رہا۔ اور اتنا ہی زیادہ تندرست بچہ پیدا ہوا۔ اس کے برعکس علاج سے بھاگنے والی ۳۵۵ عورتوں میں سے صرف ۲۶ فیصد نے تندرست بچے جنے۔

الینائس کے محکمہ صحت کے ڈاکٹر مسٹر ہرمین ایم سولیوڈے کا بیان ہے کہ

"مشاہدے میں آیا ہے کہ اکثر حاملہ عورتیں بہت دیر سے یا بچے کی پیدائش سے چند ہی روز پیشتر علاج کی درخواست کرتی ہیں"۔ قدرتاً اس سے یہ قانون اور بھی کمزور پڑ جاتا ہے تاہم علاج معالجے کے جدید ترین طریقوں کا استعمال کیا جائے تو اس قانون میں تبدیلی ضروری بھی نہیں رہتی۔ حالانکہ الینائس پلان کے تحت بیشمار مصیبتوں کا ازالہ ہوا ہے لیکن خاطر خواہ نشر و اشاعت نہ ہونے کے سبب اس سکیم کی کامیابی کے باوجود دوسرے شہروں اور ریاستوں میں اس کی تقلید کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔

فوری علاج کے مرکزوں میں حالیہ کامیابی کے سبب بہت سے شہروں میں ترغیب پیدا ہو گی اور وہاں بھی آتشک زدہ لوگوں کے علاج کی زبردست کوششیں

کی جائیں گی لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا ضرور ہوگا۔ ۱۹۴۵ء کے آغاز میں محکمہ صحت عامہ نے بتایا تھا کہ امریکہ میں فوری علاج کے چھپن مرکز تھے ان میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ مریض علاج کے لئے آتے تھے۔ ان میں سے تقریباً نصف کے قریب آتشک اور نصف سے زیادہ سوزاک میں مبتلا تھے اور کل تعداد کا ۲۰ فیصد دونوں بیماریوں میں مبتلا تھے اگرچہ ۱۹۴۳ء کے مقابلے میں زیر علاج عورتوں کی تعداد گنی سے بھی زیادہ تھی لیکن ان مریضوں کی تعداد کا ایک اونی سا جزو تھی جن کو ہر سال جنسی بیماریاں لگتی تھیں۔

سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ جنگ کے دنوں میں امریکہ میں ہر سال دس لاکھ افراد کو آتشک اور اس سے کئی گنا زیادہ کو سوزاک کا مرض لگتا ہے اور ہر سال کم از کم ۳۰ ہزار بچے آتشک کی بیماری ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

کیا پنسلین اور دوسری طبی ایجادیں اس صورت حال کی اصلاح کر سکیں گی جنسی بیماری کی صورت حال پر دو بڑے متضاد محرکات اثر انداز ہو رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ فوری علاج کے مرکزوں کے قیام سے علاج کا زمانہ گھٹ کر ایک چوتھائی اور علاج کا خرچ آدھا رہ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقامی منتظمین بھی مرکز کی امداد کے بغیر جنسی بیماری کے انسداد کا کام شروع کر سکیں گے۔

دوسرا یہ کہ فوج اور بحریہ کی خاص مساعی کی بدولت جنسی بیماریاں ۱۹۴۱ء سے متعدی صورت اختیار نہیں کر سکیں۔ لڑائی ختم ہوتے ہی عام سپاہیوں کو معطل کر دیا جائیگا تو اس صورت حال کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اس کے علاوہ جو اتحادی فوجیں یورپ میں لڑ رہی ہیں ان میں جنسی بیماری اس قدر پھیل رہی ہے کہ ماہرین طب پریشان نظر آتے ہیں مثال کے طور پر کناڈا کی افواج میں جنسی بیماری کو تقریباً ختم کر دیا گیا تھا لیکن ۱۹۴۵ء کے وسط سے

یورپ میں مقیم یا کناڈا واپس آنیوالی افواج میں آتشک اور سوزاک کی شرح اچانک بڑھ گئی اور اتنی ہی تیزی سے جنسی بیماری کناڈا کے شہروں میں پھیلنے لگی۔

اگرچہ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا فضول ہے لیکن جنگ کے دوران میں جو تحقیقات افواج میں کی گئی اس کی روشنی میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جنسی بیماری کا مسئلہ زمانہ امن میں نازک صورت اختیار کر جائے گا۔ اس تحقیقات کو ڈاکٹر جی ڈبلیو لاری مور اور ٹی ایچ سٹرن برگ نے ۱۹۴۵ء میں امریکی رسالہ صحت عامہ میں مختصراً بیان کیا ہے امریکی افواج کے ۸۰ لاکھ سے زیادہ سپاہیوں پر جنسی بیماری کے انسداد اور علاج کا تجربہ کیا گیا۔ فوجی منتظمین کو غیر معمولی اختیارات، بیحد روپیہ اور سہولتیں حاصل تھیں۔ آتشک اور سوزاک کے انسداد میں ہر معلوم حربے کو استعمال کیا گیا۔ یہ مہم شہری آبادی میں اس کامیابی سے نہ چلائی جاسکتی تھی، جس کامیابی سے فوج میں چلی۔

۱۹۴۳ء میں فوج میں ڈیڑھ کروڑ کتابیں تقسیم کی گئیں جن کا موضوع جنسی بیماری اور جنسی مسائل تھا۔ ان سپاہیوں کی تعداد جن میں لٹریچر تقسیم کیا گیا امریکہ کی کل آبادی کا تقریباً پندرھواں حصہ تھی۔ یہ لٹریچر نہایت اعلیٰ اور دلکش تھا۔ تحریر میں پرانے انداز کے طبی لیکچروں کی بجائے پروپیگنڈے کا عمدہ اسلوب اختیار کیا گیا تھا۔ اس لٹریچر کے اثر کو دوبالا کرنے کی غرض سے بیشمار فلمیں دکھائی گئیں جنہیں ایک کروڑ سپاہیوں نے دیکھا۔

ڈاکٹر لاری مور اور سٹرن برگ جنسی بیماری کے خاتمے کی جدوجہد میں مندرجہ ذیل اسباب کو بہت زیادہ اہم بتاتے ہیں۔

(۱) خوف (۲) شعور (۳) غرور (۴) حبِّ وطن

ان کے خیال میں افواج میں طبی اور تعلیمی سہ گرہیوں کی ناکامی کے مندرجہ ذیل بڑے

اسباب تھے۔

(۱) جنسی ترغیب (۲) جنسی فلموں، مزاحیہ ڈراموں، ملازمت پیشہ لڑکیوں اور تجارتی اشتہاروں کا خواہش انگیز اثر (۳) جنگ کے سبب گھرانوں کا انتشار (۴) علاج کے نئے طریقے جن کے طفیل مردوں میں خیال پیدا ہو گیا کہ جنسی بیماری اتنی خطرناک نہیں۔ (۵) شراب نوشی (۶) عام اخلاقی معیار

ان اسباب کا افواج کی تعلیمی فہم پر کیا ردِ عمل ہوا؟

میں نے اس سلسلے میں سرجن جنرل کے دفتر کے محکمہ انسداد امراض جنسیہ کے افسر اعلیٰ لفٹیننٹ کرنل ٹامس سٹرن برگ سے ٹیلیفون پر بات کی۔ اس نے بتایا

"اس سال ماہِ نومبر میں گزشتہ سال کے مقابلے میں جنسی بیماری کی شرح تقریباً دوگنی تھی۔ پچھلے سال ۳۰ فی ہزار اور اس سال ۶۰ فی ہزار تھی۔ ۱۹۴۴ء میں اوسط شرح ۳۲ فی ہزار تھی۔ یوں تو فوجوں میں ہر کہیں جنسی بیماری کی شرح بڑھ رہی ہے لیکن مختلف علاقوں میں اوسط شرح بھی مختلف ہے۔ جو فوجیں جزائر فلپائن اور جنوبی بحرالکاہل میں لڑ رہی ہیں ان میں بیماری کی شرح ۸۰ تا ۱۰۰ فی ہزار ہے۔ جو فوجیں یورپ کے میدان جنگ میں ہیں ان میں یوم فتح کی تقریب کے بعد سے بہت زیادہ بیماری پھیل رہی ہے اور وہاں بیماری کی اوسط شرح باقی تمام علاقوں سے زیادہ ہے۔ لڑائی ختم ہونے سے پہلے یورپ میں اوسط شرح ۴۰ فی ہزار تھی اور اب ۱۷۰ فی ہزار ہے۔ گویا ۳۲۵ فی صد حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے"

میں نے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں اس روز افزوں اضافے کا کیا سبب ہے کرنل صاحب نے جواب دیا کہ "یہ اضافہ حیران کن نہیں ہے کیونکہ ہر جنگ کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ جنگ کے خاتمے پر عام اخلاقی معیار گر جاتا ہے۔ سپاہیوں کے پاس فرصت کا

کافی ہوتا ہے جن سپاہیوں کو سمندر پار جانا ہوتا ہے انہیں کافی عرصہ تک کشتیوں اور جہازوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے وہ بندرگاہ میں بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں اور اپنی دلچسپی اور دل بہلاوے کے دوسرے طریقے ڈھونڈ نکالتے ہیں وہ شہروں میں زیادہ آزادی سے گھومنے پھرنے لگتے ہیں اور بہت جلد جنسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں"۔

میں نے کرنل صاحب سے پھر سوال کیا کہ آپ کے خیال میں سب سے زیادہ خطرناک محرّک کون سا ہے؟

کرنل صاحب نے فرمایا کہ "جواب صاف ہے سب سے زیادہ خطرناک سبب ہے حرام کاری"۔

میجر جارجز ایک لوک کناڈوی افواج میں اسی قسم کے منصب دار ہیں۔ انہوں نے کناڈوی افواج کے متعلق بھی چونکا دینے والی اطلاعات بہم پہنچائیں۔ میں نے امریکہ اور کناڈا کے چند سول افسروں سے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنے نام کے اظہار سے تو انکار کیا لیکن جو حقائق اور اعداد و شمار ان سے حاصل ہوئے وہ سب ایک سے تھے انہوں نے کہا "جب سے لڑائی ختم ہوئی ہے جنسی بیماریاں بہت تیزی سے پھیل رہی ہیں یہاں تک کہ اس برِعظیم میں ان کے وبائی صورت اختیار کر جانے کا اندیشہ ہے۔ فوج سے معطل کئے ہوئے سپاہی آتشک اور سوزاک کی طرف سے بالکل لاپروا ہیں اور اپنی تعلیم کو سرے سے بھلا چکے ہیں۔ ان میں معائنے اور علاج وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں پائی جاتی۔

صورت حال اس قدر نازک ہے کہ نیویارک سٹیٹ میڈیکل جرنل میں تمام ماہرین اور منتظمین کو متنبہ کیا گیا کہ میدان سے واپس آنے والے سپاہیوں کے گھروں میں آتشک اور سوزاک کی ہولناک مصیبت ڈیرا جما رہی ہے۔

گورڈن بٹیس جو کناڈا کی مشہور ہیلتھ لیگ کے ڈائرکٹر ہیں اور کئی سال سے جنسی بیماری کے ماہر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :۔

" ظاہر ہے کہ بعض ایسے لوگ جنہیں زیادہ باخبر اور ہوشیار رہنا چاہئے۔ یہ خیال کرتے ہیں کہ جنسی بیماری کے حقائق کی تعلیم، تشخیص اور علاج کی سہولتیں ہی اس مرض پر قابو پانے کے لئے کافی ہیں۔ ایک دوسرا گروہ جنس کے جسمانی حقائق سے باخبر ہونے پر اسی طرح زور دیتا ہے کہ گویا انہی حقائق کی تعلیم سے آتشک اور سوزاک پر قابو پا لیا جائے گا۔ اگر اس جنسی بیماری کے انسداد کے کام کو محض ہدایات دینے تک محدود رکھنا ہے تو تعلیم اور موثر طریقہ علاج، دونوں کی بدولت سرعتہ علالت کو قدرے گھٹایا جا سکتا ہے۔ معاشی اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دیا گیا تو کثرت اختلاط کے ساتھ مریضوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر بٹیس اور بھی واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ " جنسی بیماری پر محض اخلاقی نقطۂ نظر سے بحث کرنا قدامت پسندی کی دلیل ہے لیکن اصل اخلاقیات کے بغیر جن کا تعلق کردار اور سماج سے ہے، جنسی بیماری پر قابو پانا بھی محال ہے۔"

" ظاہر ہے کہ یہ رائے ہمارے فوجی ڈاکٹروں کی رائے سے بالکل متضاد ہے۔ ہم امریکی افواج میں جنسی بیماری کی انسدادی مہم کے متعلق ڈاکٹر لاری مور اور سٹرن برگ کی رپورٹ کا ذکر کر چکے ہیں انہوں نے اخلاقی دلائل کو محض غیر موثر کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ فوج میں جنسی بیماری کے تدارک کی مہم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہتھیار خواہ کسی قسم کے ہوں، مقصد صرف جنسی وباؤں کی روک تھام ہے۔ نتیجتہً ڈاکٹر لاری مور اور سٹرن برگ نے خیال کیا کہ فوج میں طبی نقطہ نظر سے جو مہم چلائی گئی تھی، وہ کامیاب رہی۔ یعنی اس

ہیں وہ کامیابی ہوئی جس کا ڈھنڈورا لڑائی کے خاتمے سے تھوڑا عرصہ پہلے پیٹا گیا تھا۔ جب کہ جنسی بیماری نے ہولناک وبا کی صورت اختیار نہ کی تھی اور ان ذلیل طریقوں، آلوں اور دواؤں کی مقدار اور تعداد کو پیش نظر رکھا جائے جو سپاہیوں نے بدفعلی کے وقت بطور حفاظت استعمال کیں تو اس نام نہاد "کامیابی" کی قلعی کھل جاتی ہے۔

چونکہ ہم اس مسئلے کے مطالعے کو صرف طبی امور تک محدود کرنا نہیں چاہتے اس لئے ہمیں اس حفاظتی ساز و سامان سے آزادانہ نمٹنا پڑے گا۔

شاید یہاں اس امر کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ فوجی منتظمین وقتاً فوقتاً اور مختلف مقامات میں جنسی بیماری کے خلاف اپنی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگاتے رہے ہیں کہ سپاہیوں نے کس قدر حفاظتی دوائیں اور کتنے آلے وغیرہ استعمال کئے۔ لہٰذا یہ اعداد و شمار اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے، کہ سپاہیوں نے کتنی مرتبہ بدفعلی کی اور مانع امراض دواؤں کے طفیل بیماری سے محفوظ رہے۔

بہت سے قاری اصل شماریت پر حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ مذکورہ بالا چیزوں کی تعداد اور مقدار بے اندازہ اور ناقابل یقین ہے۔ ۱۹۴۵ء کے شروع میں امریکی فوج میں فی کس فی چیز کے حساب سے ایک مہینے میں ۵ کروڑ حفاظتی چیزوں کی کھپت تھی۔

یہ ہے فوج کے منتظمین کی کامیابی کا پیمانہ۔ ہمارے سپاہیوں کی تعداد ۸۰ لاکھ ہے۔ انہوں نے ہر ماہ ۵ کروڑ حفاظتی چیزیں استعمال کیں۔ اب بدفعلی کے ارتکاب کا حساب لگایا جائے تو جو نتیجہ حاصل ہوگا اس پر شاید اوچھے نکتہ چین

بھی جو پادریوں اور اخلاق پرستوں پہ ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی قوم نے اس قدر وسیع پیمانے پر زنا کاری کو بے ضرر بنا دینے کی کامیابی پر شیخی گھاری ہو۔ یعنی ایک مہینے میں ۵ کروڑ مرتبہ۔

# گناہ کے خاتمے کا پنجسالہ منصوبہ

اب ہم بدکاری اور بد اخلاقی کے انسداد کی اشتراکی جد و جہد کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہیں۔ یہ جد و جہد ۱۹۲۹ء کے موسم گرما میں آخری اور نازک مرحلے پر پہنچ گئی۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی حکومت کی ایک آدھ وزارت نہیں بلکہ پوری آٹھ وزارتیں اس جد و جہد میں شریک تھیں جو مشترکہ سائنسی منصوبے پر چل رہی تھیں۔

جو بن بیاہی لڑکیاں صحت گاہوں میں علاج کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کر کے گریجوایٹ بن گئی تھیں، انہیں ملازمت دلانے کی ذمہ داری وزارتِ محنت نے اپنے ذمے لی۔ سماجی تحفظ کی عوامی وزارت نے عورتوں کی تربیت گاہوں اور ورک شاپوں کو ملک بھر میں قائم کرنے کا کام شروع کیا۔ اور ایسی عورتوں کو محفوظ اور عمدہ رہائشی مکانات مہیا کرنے کا فریضہ سنبھالا۔ جن کے متعلق خدشہ تھا کہ وہ بُری صحبت کے اثر سے بدکاری میں دوبارہ مبتلا ہو جائیں گی۔

وزارتِ صحت عامہ نے صحت گاہوں کو وسیع کیا۔ جنسی بیماریوں کے زیادہ سے زیادہ ماہرین کی تربیت اور بے کس ماؤں کی امداد کا وسیع منصوبہ تیار کیا۔ اور تحفظِ زچہ و بچہ کے بے شمار مرکز کھولے۔

وزارتِ انصاف اس وقت تک پولیس یعنی قومی رضاکاروں کو نئے سرے سے منظم کر چکی تھی۔ اور بے حد فعال، ہمدرد انسانیت اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار پولیس تیار کر چکی تھی۔ اب اس نے منظم بدکاری اور عصمت کی تجارت کے باقیات پر آخری بھرپور حملہ کر دیا۔ گذشتہ پانچ برس کے عرصے میں جن تاجرانِ عصمت نے اپنا ذلیل کاروبار نہ چھوڑا تھا وہ روپوش ہو گئے تھے، اب وہ ناقص العقل لڑکیوں اور عورتوں کو اپنے جال میں پھنسانے میں مصروف تھے۔ اس اثنا میں وزارتِ انصاف اور وزارتِ امورِ داخلہ نے باہمی تعاون سے خفیہ چکلوں کا کھوج لگانے کے لیے خاص سراغرساں پیدا کر لیے تھے۔ چنانچہ خفیہ چکلوں کے مالکوں کو ڈھونڈ کر سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ چکلہ داروں کے خلاف عام لوگ حکومت کی پوری مدد کرتے تھے۔

وزارتِ تعلقاتِ عامہ نے مرد و زن میں ان کی ذاتی اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کیا اور عوام میں ایسے لوگوں کو سختی سے ہدفِ تنقید بنانے کا جذبہ پیدا کیا جو نابالغوں اور نوجوانوں کو جرائم پر اُبھارتے تھے۔

آخری کام، یعنی تمام تنظیموں، اداروں، شفاخانوں، ورکشاپوں اور زچہ و بچہ کی حفاظت گاہوں کو ہر ممکن مالی امداد دینے کی ذمہ داری وزارتِ تجارت اور وزارتِ مالیات کے سپرد کی گئی۔

ظاہر ہے اب انسدادِ عصمت فروشی کی مہم نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ یہ جدوجہد ابتدائی مرحلے سے نکل کر ایک نئی منزل میں داخل ہو گئی۔ اب اس کا دائرۂ عمل وسیع ہو گیا،

چنانچہ جرائم اور بداخلاقی کا نام و نشان تک مٹانے کے لیے وسیع قومی جہاد شروع ہو گیا۔

اب حالات کا تقاضا تھا کہ جرائم، بدکاری اور بداخلاقی پر خصوصی سائنٹفک حملہ کیا جائے۔ بے کاری ختم ہو جانے سے غریب اور مفلس عورتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر پہنچ گئی تھی، عصمت فروشی کا معاشی محرک ختم ہو گیا تھا اور اب عورتوں کے سامنے یہ سوال نہ تھا کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے پیشہ اختیار کریں یا نہ کریں۔ سوال صرف ان عورتوں کی بحالی کا تھا جو حالات اور افلاس سے مجبور ہو کر طویل مدت سے پیشہ اختیار کیے ہوئے تھیں، اس کی عادی ہو گئی تھیں اور اپنے آپ کو کسی باعزت کام کے اہل نہ پاتی تھیں۔ ظاہر ہے عورتوں کے اس گروہ کے ساتھ ان کے "مربیوں" کا وجود لازمی تھا۔ اس ناپسندیدہ اقلیت کو ختم نہ کیا جاتا تو یہ لوگ نابالغ، نوجوان اور غیر مستقل مزاج عورتوں کی کشش کا دائمی محرک بنی رہتیں اور رفتہ رفتہ عصمت فروش عورتوں کی صفوں میں اضافہ ہوتا رہتا۔

اصولاً عصمت کے تاجروں کے اس "ہراول دستے" کی گرفتاری، ان کے ساتھ ناقابل اصلاح سماجی عناصر کا سا سلوک اور ان کی سماج سے علیحدگی جائز تھی۔ لیکن اشتراکی حکومت نے اس اقدام پر غور تک کرنے سے انکار کر دیا۔ اشتراکی منتظمین آخر تک اپنے قائم کردہ سائنٹفک اصول پر قائم رہے کہ "طوائف معاشی اور سماجی طاقتوں کی شکار ہے، وہ ایک انسان ہے۔ لیکن سماجی طاقتوں کی غلام اور مظلوم ہے۔ اس کی سماجی بحالی صرف ایک نئے، مثبت اور صحت مند ماحول ہی میں ممکن ہے۔" شہریوں کی جو کمیٹیاں بدکاری کے خاتمے کی مہم میں حکومت کا ہاتھ بٹاتی آئی تھیں، ان سے طویل بحث اور تبادلۂ خیال کے بعد اشتراکی ماہرینِ نفسیات نے شفاخانوں اور درکشاپوں کے

نظام میں انقلابی تبدیلیاں کر کے جرائم اور بدکاری کو قطعی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

نئی صورت حال اسی انقلابی تبدیلی کی متقاضی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں شفاخانوں میں زیر علاج عورتوں کی صرف ایک چوتھائی تعداد نے مختلف پیشے سیکھے تھے اور ۱۹۳۴ء تک تین چوتھائی عورتیں مختلف فنون میں تربیت حاصل کر چکی تھیں۔

اس لیے اس وقت تک بہت سے رہائشی شفاخانے بند ہو چکے تھے باقی ماندہ مریض عورتوں میں نفسانی عدم صحت کی علامات پائی جاتی تھیں امراضِ نفس کے ماہرین کی نظر میں اس کا سبب طویل عرصے کا پست اور ذلیل طریق زندگی تھا۔ اس لیے وہ ان کے علاج کی طرف باقاعدہ اور منظم طریقے سے متوجہ ہوئے۔ انھوں نے امراضِ نفس کے علاج کے تقریباً وہی طریقے اختیار کیے جس کی زبانی وکالت ہمارے ہاں کے ماہرین کرتے رہتے ہیں۔ عورت کے انفرادی، روحانی طریق علاج پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اشتراکی ڈاکٹروں نے اپنی تمام تر کوششیں اس سماجی اور معاشی ماحول کو بدلنے کے لیے وقف کر دیں۔ جس میں وہ رہتی تھیں۔ انھوں نے اس ماحول کو ایسا بنا دیا کہ عورت کے لیے با اخلاق طریقے سے زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔

یہ طریقے اس قدر منطقی، عقلی اور سادہ تھے، کہ ۱۹۳۴ء تک رہائشی شفاخانوں کی نوعیت عام کھلے مرکزوں کی سی نہ رہی تھی۔ عورتوں کو اب بھی ان میں داخل ہونے پر مجبور نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جو عورت علاج کے لیے راضی ہو جاتی تھی، اس کے لیے دو سال تک وہاں رہنا ضروری تھا، ان شفاخانوں کا روزانہ

معمول بالکل بدل دیا گیا۔

پہلے پہل ان میں زندگی کا وہی معمول تھا جو عام شفاخانوں میں ہوتا ہے یعنی صبح سویرے اُٹھنا، وقت پر کھانا اور آرام کرنا، سہل کام، مقررہ وقت پر علاج معالجہ، تفریح اور تعلیم اور وقت پر جلدی سو جانا وغیرہ، اِس قسم کی زندگی عورتوں اور لڑکیوں کی اکثریت کے مزاج کے تو موافق تھی، لیکن جو عورتیں عرصے سے بازاری زندگی کی عادی ہو چکی تھیں۔ اُن کے لیے یہ طرزِ زندگی ایک بوجھ اور وبال ثابت ہُوا۔ یہ عورتیں سالہا سال سے شام کے وقت سے اپنا دھندا شروع کرنے کی عادی تھیں۔ ان کے لیے شام کے وقت سونا دشوار تھا۔ اور وُہ بستر پر لیٹے لیٹے جاگنے اور کروٹیں بدلتے رہنے سے بہت جلد اُکتا جاتی تھیں۔ لہٰذا نتیجہ مقصد کے برعکس نکلا، وہ شفاخانوں سے نفرت کرنے لگیں۔ اور اِن میں رات کی تاریکی میں بازاروں میں آوارہ گردی کرنے، ہوٹلوں اور شراب خانوں کے طواف کی عادت عود کر آئی۔

چنانچہ رات کو دِن میں بدل دیا گیا۔ اب شفاخانے کی ورکشاپ میں تیسرے پہر کام شروع کیا جاتا جو ساری رات جاری رہتا۔ سونے کا وقت صبح کاذب اور جاگنے کا اگلی دوپہر کا مقرر ہُوا۔ اسی طرح دوسری سرگرمیوں اور کاروبار کا وقت بھی بدل دیا گیا۔ لہٰذا شفاخانے میں داخل ہونے والی طوائف کے لیے اپنے روزانہ کے معمول میں کوئی فرق نہ رہا۔ طوائف کا علاج رات کو عین اس وقت شروع کیا جاتا جب کہ اُس کی پرانی عادت اسے مردوں کی تلاش کے لیے شفاخانہ چھوڑنے پر مجبور کرتی اِس طریق علاج کا نفسیاتی اصول بالکل واضح ہے

مثالی قسم کی مریض عورت دو طاقتور مشروط انعکاسات میں مبتلا تھی (انعکاس مشروط میں کوئی خاص عادت اپنے اصلی سبب سے ہٹ کر کسی دوسرے سبب سے پیوستہ ہو جاتی ہے) پہلا اسے رات کے وقت سرگرم رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور دوسرا کسی مفید کام کے بجائے رنگ رلیوں پر ابھارتا تھا۔ ان دونوں عادتوں کو بہ یک وقت ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسی کوشش کا نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ اس لیے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ نمٹا گیا۔ اور سب سے پہلے عورتوں کے کام کی نوعیت بدل گئی۔

لہٰذا شفاخانوں میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ وزارتِ صنعت نے ورکشاپوں کی نئی تنظیم کا منصوبہ بنایا۔ تجربے کے طور پر کیف کے شفاخانے میں ایک خاص اور اہم صنعت شروع کی گئی۔ ان میں خاص برقی آلاتِ طب تیار کیے جانے لگے جن کی سوویت یونین کے ڈاکٹروں کو بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اس صنعت کا عورتوں پر حیرت انگیز مفید اثر پڑا۔ اس سے پہلے وہ پارچات یا عام استعمال کی چیزیں تیار کیا کرتی تھیں۔ یہ کام ان کے لیے کسی خاص دلچسپی کا موجب نہ تھا۔ اب انھیں ایک ایسا دلچسپ کام دیا گیا جو قوم کے لیے بے حد مفید تھا۔ ان میں خدمتِ قوم کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور وہ بڑے شوق سے محنت کرنے لگیں۔ اس نئے کام کی اہمیت کا شعور پیدا ہوتے ہی ان عورتوں کے کردار اور سیرت میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی جنھیں دماغی اعتبار سے ناکارہ خیال کیا جاتا تھا۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ گئیں کہ جو سامان وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی ہیں، ان کے ہموطنوں کی زندگی بچانے کے لیے اس کی سخت اور فوری ضرورت ہے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ ان سے کام لینا مقصود نہیں بلکہ وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے محنت کر رہی ہیں۔

یہ تجربہ غیر متوقع طور پر اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی

تقلید شروع ہوگئی۔ جن عورتوں میں قدرے صلاحیت کی کمی تھی۔ ان کے لیے ماسکو کے قریب ایک اجتماعی زراعتی فارم قائم کیا گیا۔ اس میں محکمہ زراعت کے لیے فصلیں اگانے اور مویشی پالنے کا کام شروع کیا گیا۔ اس کام میں بھی عورتوں کی سماجی ذمہ داری اور قومی خدمت پر زور دیا گیا۔

ان تجربوں کے دوران میں عورتوں نے خاص فنون اور پیشوں میں مہارت پیدا کر لی، وہ قوم کی اقتصادی زندگی میں نہایت مفید ثابت ہوئیں۔ اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئیں۔ بدول قسم کی عورتوں نے بھی اس موقع غنیمت سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس بے تابی اور شوق کا مظاہرہ کیا اس سے وہ ماہرین امراض نفس بھی بے حد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جو قدرے مایوس ہو گئے تھے۔ اب ماہرین نے مزدوروں اور کسانوں کی کمیٹیوں سے فوراً مشورہ کیا اور اس سلسلے میں جو کانفرنسیں ہوئیں، ان میں فیصلہ کیا گیا کہ بحالیات کے کام کو تیز تر کر دیا جائے۔

ادھر طبی ماہرین نے نہ صرف جنسی بیماریوں کے علاج بلکہ عورتوں کی بد وضعی کو دور کرنے کے لیے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔ ہر شفاخانے میں ایک ایک پلاسٹک سرجن مقرر کیا گیا۔ جو بد نصیب عورتیں آتشک کے ہاتھوں بدشکل ہو گئی تھیں، انھیں سماج میں رہنے کے قابل بنانے کے لیے ان سرجنوں نے ناک اور دوسرے نازک اعضا کے خطرناک آپریشن کرنے شروع کر دیئے۔

امراض زناں کے ماہرین ایسی عورتوں کے علاج میں شریک ہوئے جنھیں ازدواجی زندگی اور تولید کے قابل بنایا جا سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک وسیع تہذیبی اور ثقافتی پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ مشہور فن کار اور اداکار ہر شفاخانے میں تہذیبی ڈرامے پیش کرنے لگے۔ زیر علاج عورتوں کے لیے خاص اخبار

جاری کیے گئے اور انھوں نے خود بہت سے اخبار نکالنے شروع کر دیئے۔

یہ شفاخانے قومی زندگی سے کٹے ہوئے نہ تھے۔ مریضوں کو اپنا ماضی بھول جانے کی بھی ہدایت نہ کی جاتی تھی۔ بلکہ ہر عورت کو اس طویل المیعاد اور قدیم بدعت کے خاتمے کی جدوجہد میں، جو دوسرے ملکوں میں ناکام رہی تھی، اس کی ذاتی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اس کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی تھی کہ اپنے گھناؤنے ماضی پر اس کی ذاتی فتح ایک نتیجہ خیز سماجی تجربے کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی اور یہ کہ وہ اصلاح انسانی کی اصلاح و ترمیم کی جنگ میں سب سے اگلی صف میں ہے۔

شفاخانوں کے کام میں خاطر خواہ کامیابی کی توقعات کے باوجود بعض اشتراکی ماہرین کا خیال تھا کہ "ہراول دستے" میں لڑنے والی ان عورتوں کے لیے بدکاری کا شکار ہوئے بغیر سماج میں دوبارہ داخل ہونا ممکن نہیں۔ یہ عورتیں خود اس خطرے سے آگاہ تھیں، لہٰذا ان کی سماجی بحالی کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ ہر زیر علاج عورت کو شفاخانے سے اس وقت خارج کیا جاتا جب کسی معزز برادری میں اس کی قبولیت کا خاطر خواہ بندوبست ہو جاتا۔ چند معزز شہریوں کے سوا جن سے شفاخانے کی زندگی کے آخری ایام میں اس کی خط و کتابت ہوتی، باقی سب لوگوں کے لیے اس کی ماضی کی زندگی صیغۂ راز میں رکھی جاتی۔ یہ رضاکار پہلے سے اس کے لیے ملازمت یعنی اس کام کا بندوبست کرتے جس کی تربیت وہ خاص طور پر حاصل کر چکی ہوتی۔ وہ اس کے لیے ایک شریف اور معزز گھرانے کی تلاش کرتے۔ عورت کی آمد کے سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط کی جاتی تھی تاکہ کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو سکے۔

۲۔ وارثین کا ایک منتخب گروہ طویل عرصے تک اس کی امداد کا ضامن بنتا۔ ملازمت کے دوران میں اس عورت کی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ لیکن نگرانی کا یہ طریقہ ہمارے ہاں کے عارضی اور تجربی دورِ ملازمت سے بہت مختلف تھا، کیونکہ اس کی بنیاد نگران اور ماتحت، ہمدرد کی ذاتی دوستی پر تھی۔ یہ بات خاص طور سے ملحوظ خاطر رکھی جاتی کہ سابقہ مریض عورت اپنی موجودہ ملازمت میں پوری طرح کامیاب اور اس کے اہل ثابت ہو۔ عورت کے ساتھ کم از کم ایک وارث بھی وہی ملازمت کیا کرتا تھا۔

۳۔ ہر ضلع میں وارثین کے مختلف گروہوں کو امدادی انجمنوں میں منظم کیا گیا۔ یہ لوگ مہینے میں تین مرتبہ اکٹھے ہوتے اور ڈاکٹروں، ماہرین نفسیات اور فیکٹری کے منیجروں سے ملاقات کرتے۔ کسی عورت کو اپنے کام میں کوئی مشکل پیش آتی تو اسے تجربہ کار مددگار مہیا کیے جاتے۔ سابقہ مریض عورتیں پوری طرح بحال اور آباد ہو جاتیں تو وہ اپنی خدمات مذکورہ انجمنوں کی رضاکارانہ امداد کے لیے پیش کر دیتیں۔

۴۔ شادی، ملازمت، اُجرت، کرایہ وغیرہ کی مشکلات اور جھگڑوں میں امداد بہم پہنچانے کے لیے یہ انجمنیں عورتوں کے لیے وکالت کا خاص انتظام کرتی تھیں۔

۵۔ شفایاب عورتوں کو تاکید تھی، کہ وہ زیر علاج سہیلیوں سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم رکھیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ تاکہ وہ عام گرہستی اور برادری کی زندگی میں جلد از جلد داخل ہو جائیں۔

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے سوویت یونین میں عصمت فروشی کو ختم کرنے کے لئے جو جدوجہد شروع کی گئی تھی۔ ہم اس کی تمام حکمت عملی اور طریق کار کا جائزہ لے چکے ہیں اس جدوجہد کو ترک کئے ایک مدت ہو چکی ہے اور اب وہ محض قصہ ماضی ہے۔ یہ جدوجہد ان لڑائیوں کی طرح فتح پر ختم ہوئی جو سٹالن گراد، کیف سیوستوپول وغیرہ کے ناموں کے ساتھ ہمیشہ یاد رہیں گی اور جو دشمن کی مکمل شکست اور تباہی پر ختم ہوئیں۔ آج دنیا بھر کے مبصرین گواہی دیتے ہیں کہ سوویت یونین کے شہروں اور دیہات سے عصمت فروشی کو نابود کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں زار شاہی پولیس کے نامکمل اعداد و شمار کے مطابق اکیلے شہر لینن گراد (سابقہ سینٹ پیٹرزبرگ) میں ساٹھ ہزار رجسٹرڈ اور کئی ہزار ایسی طوائفیں تھیں جو لائسنس کے بغیر چوری چھپے پیشہ کرتی تھیں۔

۱۹۲۸ء میں یعنی انسدادی جدوجہد کے آغاز سے پانچویں سال بعد شوقیہ زنا کاری عملاً ختم ہو چکی تھی اور پانچ ہزار پیشہ ور عورتیں علاج و تربیت کے بعد معزز شہری بننے کے لئے تیار تھیں لیکن تین ہزار عورتیں ابھی تک عصمت فروشی پر گزارہ کرتی تھیں۔

ڈاکٹر جے اے سکاٹ کی رپورٹ کے مطابق جو مارچ ۱۹۳۵ء کے برطانوی رسالہ امراض جنسیہ میں چھپی اور جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ ۱۹۳۰ء تک ماسکو شہر میں طوائفوں کی تعداد گھٹ کر تقریباً آٹھ سو رہ گئی تھی، دوسرے شہروں کی صورت حال بھی اسی طرح حوصلہ افزا اور خوشگوار تھی۔ بعد میں قومی پیمانے پر اخلاقی بحالیات کی جو مہم چلی وہ انہی باقی ماندہ عورتوں کے لئے شروع کی گئی تھی۔

اس جدوجہد کے نتائج؟

ان مریض عورتوں میں سے تقریباً اسی فیصد نے شفاخانوں میں تعلیم و تربیت حاصل

کر کے ملک کے صنعتی کارخانوں اور زراعتی فارموں میں ملازمت اختیار کی اور پانچ سال سے زائد عرصے کے لئے اپنے کام کو بڑی خوبی سے سرانجام دیتی ہیں۔

چالیس فیصد سے زیادہ "شاک بریگیڈوں" یعنی سب سے اعلیٰ اور تیز کارکردگی کے دستوں کی رکن نہیں یا اعلیٰ اور شاندار قومی خدمات کے لئے منتخب ہوئیں۔ اکثر نے شادی کر کے کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔

انیس فی صد سے کم مریض عورتیں ایسی نکلیں جو علاج اور تربیت کے بعد بھی اپنے آپ کو نئے سماجی ماحول کے مطابق نہ ڈھال سکیں۔ لہٰذا انہیں مزید تربیت کے لئے دوبارہ تربیت گاہوں میں آنا پڑا۔ باقی ماندہ تعداد ایسی عورتوں پر مشتمل تھی جو جنسی بیماریوں اور دماغی نقائص کے سبب اس قدر ناکارہ ہو چکی تھیں کہ وہ نئے سماج میں اپنے لئے کوئی مقام پیدا کرنے سے قاصر رہیں۔

لہٰذا سوویت یونین میں عصمت فروشی کے خاتمے کی جدوجہد کو غلاموں اور مظلوموں کی جدوجہد میں بدل دیا گیا اور اشتراکی سماج سے عصمت کی تجارت کا صدیوں پرانا روگ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی جنسی بیماری بھی ناپید ہو گئی۔ روسیوں کی موجودہ نسل نے اپنی زندگی میں کسی طوائف کی شکل تک نہیں دیکھی۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں نے روس کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تو حالت پھر خراب ہو گئی۔ ۱۹۴۴ء میں جرمنوں کو روس سے نکال باہر کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جو علاقے ان کے قبضے میں رہ چکے تھے۔ ان میں ہر قسم کی وباؤں کا دور دورہ ہے۔ نازی سپاہیوں نے ہزاروں روسی عورتوں اور لڑکیوں سے جبراً زنا کیا تھا۔ اس لئے ایک بڑی تعداد آتشک اور سوزاک کے عارضے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ تادمِ تحریر اعداد و شمار جمع نہیں

ہو سکے ہیں اور علاج معالجے کے لئے جو اقدام کئے گئے ہیں۔ ان کی نوعیت ہنگامی ہے۔ لیکن یوکرین کی اشتراکی جمہوریت کے حالات کے مطالعے سے اصل صورت حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یوکرینی قوم کو سب سے زیادہ جنگ کی تباہی کا شکار ہونا پڑا۔ جنگ کے دوران میں یوکرین کی صحت عامہ کا کیا حال ہوا اور مریضوں کی تندرستی کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے، اس کی اطلاع براہ راست یوکرین کے وزیر صحت مسٹر الارین کو نونیکو سے حاصل کی گئی ہے۔

ان کے بیان کے مطابق نازیوں کے حملے سے پہلے یوکرین کے لوگ اپنے ہاں کے اعلیٰ نظام صحت پر فخر کیا کرتے تھے۔ یوکرین کی جمہوریت میں نو میڈیکل اور دو فارمیسی کالج تھے، جہاں سے تقریباً ساڑھے تین ہزار طلبا ہر سال گریجویٹ بن کر نکلتے تھے۔ یہ طبی ماہرین ہمارے ہاں کے تربیت یافتہ طبی کارکنوں کے برابر ہیں۔ سوویت یونین میں ایسے تربیت یافتہ مرد اور عورتیں عام لوگوں کی کما حقہ خدمت کرتے ہیں اور اختیارات میں ہمارے ہاں کے ڈاکٹروں اور رجسٹرڈ نرسوں کے ہاہم ہیں۔

۱۹۴۱ء میں یوکرین میں ۹۳۲ ہسپتال تھے۔ جن میں ۱۲۹۰۰۰ مریضوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ دیہات میں ۲۴۴۵ طبی مرکز تھے۔ بڑی ڈسپنسریوں اور رہائشی شفاخانوں کی تعداد چھ ہزار کے لگ بھگ تھی اور چھوٹی ڈسپنسریاں دس ہزار تھیں، ٹریڈ یونینوں اور اجتماعی کمیتوں کی تنظیموں کے اپنے چار سو سینی ٹوریم اور ۱۷۳ آرام و تفریح گاہیں تھیں جن میں ۱۰ لاکھ سے زائد بالغ افراد اور بچے رہائش اختیار کیا کرتے تھے۔

صحت عامہ کی اس شاندار تنظیم کی بدولت جنسی بیماریوں کو ختم کرنے میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ ۱۹۴۱ء تک آتشک کے نوے فیصد مریض صحت یاب ہو چکے تھے اور

باقی ماندہ مریض زیادہ تر پرانے بیمار تھے۔ اس وقت تک جنسی ناسور کا مرض معدوم ہو چکا تھا اور سوزاک خاتمے کے قریب تھا۔ اس کے ساتھ ہی سوزاک کی شرح تیزی سے گھٹ رہی تھی۔

اس کام میں عورتوں کے ہسپتال جن میں ۳۱ ہزار عورتوں کی رہائش کا انتظام تھا اور ۱۹۴۷ انسدادی صحت گاہیں جو حاملہ اور شیر خوار بچوں کی ماؤں کے لئے مخصوص تھیں خاص طور سے ممد ثابت ہوئیں۔

یوکرین پر نازیوں کے قبضہ کے دوران میں صحت عامہ کا یہ شاندار ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ ہسپتال، رہائشی شفاخانے، کالج اور طبی ادارے جان بوجھ کر تباہ کئے گئے جو باقی رکھے گئے ان میں عوام کا داخلہ منع تھا اور وہاں جرمن سپاہ کے لئے چکلے جاری کئے گئے۔ جرمن سپاہیوں اور افسروں کے لئے باقاعدہ چکلوں کے قیام سے جنسی بیماری میں ہولناک اضافہ ہوا لیکن اس حادثے کے اعداد و شمار شاید کبھی جمع نہ کئے جا سکیں۔ کیونکہ لاکھوں بالغ افراد اور بچے یوکرین سے جبراً نکال دیئے گئے۔ ان میں سے بہت سے ہلاک ہو گئے اور جو باقی بچے وہ طویل عرصے تک وقتاً فوقتاً یوکرین کو واپس لوٹتے رہے۔ اس لئے میڈیکل ریکارڈ کا صحیح رکھنا ناممکن ہو گیا۔

یوکرین کی آزادی کے بعد علاج معالجے اور انسداد امراض کا کام فوراً شروع کیا گیا مئی ۱۹۴۵ء تک چھوت کی بیماریوں کے انسداد کے لئے تقریباً ۷۶۶ مرکز کھولے جا چکے تھے۔ چھ ہزار کے قریب عورتوں کے ہسپتال اور ابتدائی طبی امداد کے مرکز قائم ہو چکے تھے۔

مایوس اور قریب المرگ قسم کے مریضوں کی طرف فوری توجہ دینے کے لئے ۴½ ہزار

مرکز قائم کئے گئے اور میڈیکل کالجوں میں طلباء کی تعداد جنگ سے پہلے کے طلبا کی تعداد کے نصف تک جا پہنچی۔

جنسی بیماریوں کے خلاف الگ سے کوئی مہم نہ چلائی گئی۔ یوکرین کی صحت عامہ کو جنگ سے پہلے کے معیار پر لانے کے لئے وسیع جدوجہد جاری ہے۔ خصوصاً تپ دق چھوت کی بیماریوں مثلاً چیچک اور گلے کے امراض وغیرہ کے انسداد کے لئے بے حد کوششیں جاری ہیں۔ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ نے آتشک اور سوزاک کے علاج کے لئے جو نئے طریقے رائج کئے ہیں، ان کا مطالعہ کرنے کے لئے اشتراکی ماہرین امریکہ کا دورہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے سریع الاثر علاج کے مرکزوں کا خاص طور سے مشاہدہ کیا۔ سوویت یونین میں پنسلین کو رائج کیا جا رہا ہے۔ لیکن یوکرین کے ماہرین طب کا خیال ہے کہ جنسی بیماری کے ازالے کے لئے ان کی جنگ سے پہلے کے زمانے کی ایجاد گلوکوز ٹریپٹو سائیڈ ہی کافی ہے۔

جو علاقے جرمنوں سے آزاد کرائے گئے ہیں، ان میں یوکرین کو مثالی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں صحت کا مسئلہ بہت نازک ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہمارے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے کہ یوکرین کی حکومت کے اس امر پر زور دینے کے باوجود کہ جرمنی کے تسلط کے دنوں میں وہاں کی صحت عامہ بے حد تباہ ہو گئی اور جنسی بیماریوں کا مسئلہ ہنگامی صورت اختیار کر گیا، یوکرین میں عصمت فروشی کے خلاف خاص جدوجہد کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اگرچہ یہ سماجی علت دوبارہ نمودار ہو گئی ہے۔ لیکن اکا دکا واردات تک محدود ہے۔

آج اشتراکی اخبارات اپنے ملک کی از سر نو تعمیر کے زمانے میں نااہل منتظمین کی

بے رحمانہ تنقید اور جمالیات کے مسائل کے کھلے اعتراف نزاکت سے بھرپور ہیں۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ جنسی بیماری کے مسئلے پر کوئی خاص زور نہیں دیتے۔ کیونکہ اب وہاں اس مرض کو تپ دق اور جلد کی بعض دبائی بیماریوں سے کم خطرناک تصور کیا جاتا ہے اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سوویت یونین دو تین سال کے عرصے میں آتشک اور سوزاک کی بیماریوں کو اتفاقی امراض کی سطح پر لے آئے گا۔

# قتل ـــــ صیغۂ راز

سوویت یونین نے بدمعاشی، بدکاری اور بیماری پر فتح پائی، اسے معاشرتی اصلاح کے ایک قابل دید مگر الگ مظہر کی حیثیت سے دیکھنا سخت غلطی ہوگی۔ ہم پوری طرح بتا چکے ہیں کہ وہاں کس طرح بدکاری اور بیماری کے انسداد کی کوشش میں نمایاں کامیابی ہوئی، لیکن ہم نے جو کچھ اب تک بیان کیا ہے وہ اس وقت تک بے معنی ہوگا۔ جب تک ہم اشتراکی خلاقیات کے وسیع تصور یعنی "نئی نوع انسان کی سائنسی اصولوں کے مطابق اصلاح" کی بیرانہ جد وجہد میں اسے موزوں مقام پر رکھ کر نہیں دیکھتے۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ انقلاب کے فوراً بعد جو سوالنامہ روسی عورتوں میں پھرایا گیا ں کے جواب میں جو کچھ انہوں نے بیان کیا اس سے اشتراکی سائنس دانوں اور سیاسی نماؤں کو یقین ہو گیا کہ بدکاری اور گناہ کا بنیادی سبب معاشی ہے۔ یعنی اس کا محرک لاس اور بے روزگاری ہے۔ تاہم انہیں معلوم تھا کہ صرف بے روزگاری کو ختم کر دینے سے، جیسا کہ ۱۹۲۹ء کے بعد کیا بھی گیا۔ منظم بدمعاشی اور تجارتی بدکاری خود بخود ختم نہ ہو شے گی، بلکہ برعکس نتیجہ نکلنے کا امکان ہے۔ اگر معاشی منصوبہ ہر خواہشمند عورت کو مستقل مت نہ دلا سکتا، تو یہ جد وجہد بے کار ثابت ہوتی، پانچ سالہ تاریخی منصوبوں کو عملی جامہ انے سے جو عظیم الشان صنعتی ترقی ہوئی، اس سے نہ صرف موجودہ جنگ (دوسری جنگ عظیم)

میں سرخ فوج کی شاندار فتوحات کی بنیاد پڑ گئی بلکہ روس کے ہر باشندے کی زندگی پر بھی نہایت خوشگوار اثر پڑا۔

اب تک بعض قاریوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گیا ہو گا کہ طوائف نے اپنا پیشہ چھوڑ کر باعزت ذریعہ معاش اختیار کر لیا، تو اس کے بعد سوویت یونین کی عام اخلاقی حالت کا کیا ہوا؟ یا زیادہ واضح الفاظ میں سوویت یونین کے مردوں، عورتوں اور نوجوانوں کے جنسی تعلقات کا کیا ہوا؟ کیا جنسی بیماری اور عصمت فروشی کے خاتمے سے معزز شہریوں کے اخلاق گر گئے؟

ہم اس سوال کو اور بھی واضح اور کھلے الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ آیا آزاد محبت کے اس نام نہاد نئے رجحان کے پردے میں، جس کی گورکی اور لینن نے سختی سے مخالفت کی تھی، طوائفوں کا کام عام روسی عورتوں نے سنبھال لیا؟

نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا، اسے چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہاں نہ صرف عصمت فروشی ختم ہو گئی، بلکہ بد اخلاقی کے ہر مظہر مثلاً نام نہاد آزاد محبت اور زنا وغیرہ پر جس کامیابی سے قابو پایا گیا، اس کی مثال ہمارے ملکوں کی تاریخ میں قطعاً ناپید ہے اور اخلاقی اصلاح کا یہ سلسلہ آج تک کامیابی سے جاری ہے۔ اشتراکی سائنس دانوں نے جس انقلابی تبدیلی کی پیش گوئی کی تھی۔ وہ حرف بحرف پوری ہوئی، کیونکہ سماجی اور اقتصادی منصوبہ بندی کی بدولت اکثریت کے لئے محبت کی شادی اور اس کے ذریعے ذاتی تسکین کی اعلیٰ ترین صورتوں کا حصول ممکن ہو گیا۔

کہاں محبت اور شادی اور کہاں سائنسی اور اقتصادی منصوبہ بندی! ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں؟ اکثر قاریوں کے نزدیک یہ بیان مہمل ہو گا، لیکن یہ حقیقت ہے اور

اس کے حق میں اس قدر فلسفیانہ دلائل دیئے جا سکتے ہیں کہ اس کتاب میں کئی بابوں کا اضافہ ہو جائے، لیکن ہم اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے، کیونکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس دلچسپ موضوع پر اشتراکی اخباروں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بے حد طویل اور ضخیم ہے۔ گزشتہ واقعات پر ایک سرسری نظر دوڑانے سے معلوم ہو گا کہ اس سلسلے میں سوویت یونین میں جو بحث چلی وہ دو متضاد نظریوں پر مشتمل تھی۔

ایک طرف ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ جہاں تک جنسی معاملات کا تعلق ہے انسانی تجربے کے ٹھوس حقائق شاہد ہیں کہ فطرت انسانی میں تبدیلی اور اصلاح کی کوئی امید نہیں اور اگر عصمت فروشی اور بدکاری کو عارضی طور پر ختم بھی کر دیا جائے مرد و عورت زنا و بد اخلاقی کو پھر بھی ترک نہیں کریں گے۔

دوسری طرف وہ سائنس دان اور ماہرین سیاست تھے جو اس بات پر مصر تھے کہ تاریخ میں آج تک انسانیت کو با اخلاق طریقے سے زندگی گزارنے اور محبت کرنے کے عملی مواقع بہم ہی نہیں پہنچائے گئے اور انہوں نے اشتراکی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسے اٹھارہ کروڑ انسانوں کو ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں۔

جیت دوسرے گروہ کی ہوئی اور سوویت یونین اپنے تمام سماجی تجربوں میں سب سے زیادہ غیر معمولی تجربے یعنی اخلاقی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا۔ اور اس منصوبہ بندی کے مطابق پہلا قدم اٹھتے ہی جو واویلا مچایا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ روس سے باہر کی دنیا کو اشتراکی مقاصد کا ذرہ برابر علم نہ تھا اور مسلسل بیس برس تک ان مقاصد کو سمجھنے سے دانستہ انکار کیا گیا۔ دراصل پہلی نظر میں لگا بھی یوں کہ اخلاقی اصلاح کا ابتدائی قدم الٹی طرف اٹھا ہے۔ یعنی وہاں اخلاق کی اصلاح

کے بجائے ان کی مکمل تباہی مقصود ہے اور وہ اقدام یہ ہے کہ سوویت یونین نے ایک تاریخی قانون کے ذریعے اسقاط حمل کو جائز قرار دے دیا اور ہر خواہش مند عورت کو حمل گرانے کی آزادی دے دی۔

اسقاط حمل ..... پیدائش سے پہلے ہی انسانی زندگی کی ہلاکت۔ یہ حرکت مہذب سماج میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔ لوگ حمل گرانے کو قتل ہی کی ایک صورت تصور کرنے میں حق بجانب ہیں، کیونکہ ہونے والے ماں باپ اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے ناز ائیدہ بچے کا خون کرتے ہیں لیکن سوویت یونین کے دشمن اور دوست اس روشن حقیقت کو نہ دیکھ سکے کہ اشتراکی سائنس دان اور سیاسی رہنما بھی انہی کی طرح اسقاط حمل کو انسانی قتل اور بداخلاقی تصور کرتے ہیں اور اس فعل کو فرد اور قوم دونوں کی بہتری کے خلاف جانتے ہیں

پھر سوویت حکومت نے اس غیر مہذب فعل کو کیونکر قانوناً جائز تسلیم کر لیا؟

اس سلسلے میں جو طویل نظری بحث ہوئی، اس کی تفصیل میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمارے ملکوں میں اسقاطِ حمل کے خلاف یا حمایت میں بے شمار مذہبی اور علمی چیزیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ دراصل اتنا پراسرار اور ناقابل فہم نہیں سوویت یونین میں اسقاط حمل کو عصمت فروشی کی طرح ایک سماجی جرم مانا جاتا ہے۔ جس کا بنیادی سبب انسانوں کا عام افلاس ہے۔

اس مسئلے کے متعلق جو الجھاؤ پایا جاتا ہے اسے جدلیات کی مدد سے فوراً دور کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب روس کے وقت کی بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ لیجئے۔ اس وقت دوسرے مہذب ممالک کی طرح زار شاہی روس میں بھی حمل

گرانا قانوناً جرم تھا اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے سخت سزا مقرر تھی۔ اس کے باوجود تمام ممالک میں اس مذموم فعل کا ارتکاب وسیع پیمانے پر ہوتا تھا عام طور سے حمل گرانے کا کام ڈاکٹر انجام نہ دیتے تھے۔ بلکہ اس کے ذمہ دار ایسے جرائم پیشہ لوگ تھے جنہیں شاید ہی کبھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہوگا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جرمنی میں ہر سال دس ہزار عورتوں کی موت خلاف قانون اسقاط حمل سے واقع ہوتی تھی۔ اس سے کئی گنا عورتیں آپریشن کے دوران میں عمر بھر کے لئے زخمی اور بیمار ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہ تعداد وہ ہے جو حکومت کے علم میں آئی اور یہ ایسے واقعات کا ایک ادنیٰ سا حصہ ہے جو حکومت کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

شمالی امریکہ میں نامکمل شماریات سے اندازہ لگایا گیا کہ وہاں ہر سال لاکھوں حمل گرائے گئے۔ زار شاہی روس میں ہر سال پچیس ہزار عورتیں اسقاطِ حمل کے سبب مرتی تھیں۔

یہ حالت اس وقت تھی۔ جب کہ ہر ملک میں اسقاط حمل کے خلاف سخت قانون رائج تھے۔

اب موجودہ حقائق کو لیجئے۔ اشتراکی تجربہ آج سے بیس سال پہلے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ سوویت یونین میں دوسرے ملکوں کی طرح اسقاطِ حمل کے خلاف پھر سے قانون موجود ہے اور کئی سال سے اسقاط حمل کو ایک جرم تصور کیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس قانون کو ۱۹۴۴ء میں پہلے سے بھی زیادہ سخت بنا دیا گیا۔ آخر کیوں؟ کیا اشتراکی تجربہ ناکام رہا؟ نہیں! یہ تجربہ ناکام نہیں رہا۔ بلکہ

حقیقت یہ ہے کہ عصمت فروشی کی طرح روس میں اسقاطِ حمل بھی ناپید ہے۔ دوسرے ملکوں میں زبردست مذہبی اور قانونی مخالفت اور طبی سہولتوں کے فقدان کے باوجود اس جرم کی شرح بڑھتی ہی جارہی ہے اور ہر سال بے شمار عورتیں ہلاک ہوجاتی ہیں۔ یا تکلم میں زخم آجانے کی وجہ سے سدا بیمار ہوجاتی ہیں۔

اب اپنے برعظیم (امریکہ) کی صورت حال کو لیجئے، بہت سے ڈاکٹروں نے حال ہی میں تفتیش فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر نفسانی امراض کے معالج اسے اے برل نے نیویارک کی اکادمی ادویہ کے اس اجتماع کے سامنے جو اسقاطِ حمل کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، یہ بیان دیا کہ "اسقاطِ حمل ایک لاینحل سماجی مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہمیں اس کی نسلی پیچیدگیوں کا صحیح علم نہیں"۔

اور "نسلی پیچیدگیوں" سے ان کا مطلب کیا ہے؟ ان کی مراد "ان تبدیلیوں سے ہے جو ارتقاد کے دوران میں رونما ہوئیں"۔

آگے چل کر ڈاکٹر برل ذرا صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ "اسقاط حمل ثقافتی ناہمواری کی علامت ہے"..... حاصل کلام یہ کہ فطرت، انسان کو افزائش نسل پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن تہذیب اسے اس فعل سے باز رکھنے یا صرف خاص قوانین کے تحت ایسا کرنے کی اجازت دینا بہتر خیال کرتی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر برل سفارش کرتے ہیں کہ "ہمیں چاہیئے کہ ہم ایماندار ڈاکٹروں کو مستحق افراد کی خواہش اسقاط حمل پوری کرنے کی اجازت دیدیں اور اس طرح عام حمل گرانے والوں کی حوصلہ شکنی کریں"۔

گویا اخلاقیات کو ڈاکٹروں کی تحویل اور حفاظت میں دے دیا جائے۔

اور یہ فیصلہ ڈاکٹر کے دفتر میں ہو کہ کسی عورت یا نا زائیدہ بچے کو جینے کا حق ہے یا نہیں۔ یعنی ہر ڈاکٹر بیک وقت سلیمان بھی ہو اور جلاد بھی۔

لیکن امراض نفسانی کے اس ماہر کی رپورٹ میں نہ اس سوال کا کوئی جواب ملتا ہے کہ اسقاطِ حمل کی کہاں تک آزادی ہونی چاہیئے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ صورت حال کیا ہے؟

حال ہی میں ڈاکٹر آسلون، لامبن، متیوس اور مشل نے ایک موقر جریدے میں اسقاطِ حمل کے مسئلے کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے ان حقائق کو فاش کر دیا ہے۔ جنہیں محکمہ صحت عامہ اور پریس عوام کے سامنے لانے کی جرأت نہ کرتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسقاطِ حمل کے جتنے واقعات کی پڑتال کی ہے ان میں تیس فیصد کے مجرم بازاری ڈاکٹر ہیں اور ۳۵ فیصد سے زیادہ کی ذمہ داری دائیوں پر ہیں اوسطاً پچاس فی صد حمل ایسی عورتوں نے ضائع کرائے جو کنواری تھیں یا پھر مطلقہ اور بیوہ۔

یہ مشہور حقیقت پسند ڈاکٹر فرماتے ہیں کہ گزشتہ بیس تیس سال سے حمل گرانے کے واردات میں ہولناک اضافہ ہوا ہے۔ یہ حقیقت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ حمل گرانے کا مسئلہ دن بدن زیادہ اہم اور نازک ہوتا جا رہا ہے۔"

ہو سکتا ہے وہ قدرے مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں صرف ۱۹۴۱ء میں ۷ لاکھ ۸۰ ہزار حمل ضائع کئے گئے اور جدید ترین حفاظتی طریقوں کے استعمال کے باوجود امریکہ میں ہر سال آٹھ ہزار عورتیں اس مجرمانہ اقدام سے موت کی نذر ہو جاتی ہیں ان ڈاکٹروں نے اسقاطِ حمل کی بڑھتی ہوئی تعداد کا سبب تلاش کرتے وقت

کسی نسلی پیچیدگی" کے پراسرار بہانے کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ انہوں نے مندرجہ ذیل ٹھوس سماجی اسباب بیان کئے ہیں۔

حرام کی اولاد جننے پر رسوائی، والدین بننے کی ذمہ داریوں سے گریز، عام افلاس اور گزشتہ دس برس کا مسلسل اقتصادی بحران، کنبے کی تعداد کم سے کم رکھ کر معاشی معیار بلند کرنے کی خواہش، پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نظریات کا لامذہبیت کیطرف عام جھکاؤ

وہ اس مسئلے کو ہنگامی قرار دیتے ہیں۔ کیا وہ جھوٹ کہتے ہیں؟

ذرا خیال کیجئے کہ امریکہ میں ہر سال چھ لاکھ اسی ہزار بچوں کو پیدائش سے پہلے ہی ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ آپ اس کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں ادراد ھر ہمارے برعظیم میں نا زائیدہ زندگیوں کا قتل عام جاری ہے۔ فی منٹ فی جان کے حساب سے۔

دوسرے جمہوری ملکوں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے، عوام اس صورت حال سے تاریکی میں ہیں۔ منظم مزدور بے حس ہے، طبی اور قانونی ادارے اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ پادری اپنے منبروں پر خاموش ہیں ادراد ھر اس اخلاقی جنگ میں جو ہمارے بے اخلاق معاشرے میں جاری ہے۔ لاکھوں جانیں تلف ہو رہی ہیں۔

ہمارے ہاں ایسے ڈاکٹروں کی بھرمار ہے جو برٹل کی طرح کہتے ہیں کہ" اسقاطِ حمل ایک لاینحل مسئلہ ہے، کیونکہ ہمیں ان نسلی پیچیدگیوں کا صحیح علم نہیں جو ارتقاء کے دوران میں رونما ہوئیں"

ان حضرات کو چاہیئے کہ وہ ایک مرتبہ سوویت یونین ہو آئیں۔ کیونکہ سائنس وہاں "نسلی پیچیدگیوں" کے خاتمے اور ثقافتی ناہمواریوں" کے سلسلے میں بہت کچھ کر گزری ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہاں کیا تبدیلیاں آئیں۔

انقلاب کے فوراً بعد اشتراکی سائنس دان اس فیصلے پر پہنچے کہ اسقاطِ حمل کا مسئلہ فوری توجہ کا طالب ہے، لہٰذا انہوں نے سوویت حکومت کو اس بات کا یقین دلایا کہ اسقاطِ حمل کی روک تھام نہ قوانین امتناعی کے ذریعے ہو سکتی ہے اور نہ ڈاکٹروں کو اندھا دھند انسانی زندگی تلف کرنے کی اجازت دینے سے انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ اسقاطِ حمل ایک سماجی مسئلہ ہے، جس کا تعلق معاش اور اخلاق سے ہے۔ اس کے خلاف خفیہ جہاد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ تمام قوم کو اس کے اسباب دور کرنے اور نئے قومی اخلاق کی تدریج تعمیر کے لئے وسیع پیمانے پر جدوجہد کرنی پڑے گی۔

لہٰذا سوویت حکومت نے عارضی طور پر اسقاطِ حمل کو قانوناً جائز قرار دیدیا لیکن ساتھ ہی اس پر سخت سماجی پابندیاں لگا دیں تاکہ رفتہ رفتہ اسے ختم کیا جا سکے۔

اگرچہ اس میں دو متضاد باتیں کہی گئی ہیں، لیکن حقیقت بالکل برعکس اور عام فہم ہے، ہوا یوں کہ سوویت یونین میں اس قانون کے اجراء کے ساتھ ہی خاص ہسپتال کھولے گئے۔ جن میں نہ صرف ہر قسم کی طبی سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی بلکہ ان میں مشورت کے لئے مشاورتی بورڈ بھی بٹھائے گئے جو عورتیں یا لڑکیاں حرام کا بچہ نہ جننا چاہتیں انہیں ہدایت دی جاتی کہ ان ہسپتالوں میں جائیں اور خفیہ مدد لیں۔

سوویت یونین کے بدخواہوں کے پراپیگنڈے اور مذہبی لوگوں کے خیال کے برعکس ان ہسپتالوں کا کام "خفیہ قتل" نہ تھا، بلکہ عورتوں کو عمل جراحی یعنی آپریشن سے باز رکھنے کی کوشش کرنا تھا۔ اشتراکی حکومت کے ابتدائی ایام میں تمام ملک میں افلاس اور تباہی کا عمل تھا۔ اس کے باوجود مشاورتی بورڈ ۵۰ فیصد سے زائد عورتوں کو حمل ضائع کرنے سے باز رہنے اور مائیں بننے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے

اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ محض مشاورتی بورڈوں کے قیام سے روس میں حمل گرانے کی واردات کی شرح پہلے سے آدھی رہ گئی تھی۔ اس کا سبب؟ جن لڑکیوں کو ناجائز حمل ٹھہر جاتا ہے۔ ان کی اکثریت پریشان اور خوفزدہ ہوتی ہے، کیونکہ انہیں کوئی ذمہ دار اور خیر خواہ مشیر نہیں ملتا جس سے وہ مشورہ کر سکیں۔ حمل کے ضائع کرنے کے متعلق ان کا علم سنی سنائی باتوں تک محدود ہوتا ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فوراً ایسا کر گزریں۔ تاکہ ان کا راز فاش نہ ہو اور وہ رسوائی سے بچ جائیں۔ اس قسم کی لڑکیوں کو اگر ہمارے ملکوں میں تجربہ کار اور ہمدرد مشیر مل جائیں، انہیں گرفتاری کا خوف نہ رہے اور بچوں کو جنم دینے کا فیصلہ کرنے پر انہیں ایام زچگی میں مفت طبی امداد اور بعد ازاں مستقل ملازمت کا یقین دلا دیا جائے تو نہ جانے کتنی اس حرکت سے باز رہنے کا فیصلہ کر لیں۔

روس میں ٹھیک اکیاون فیصد لڑکیوں اور عورتوں نے یہی فیصلہ کیا۔ باقی کے اصرار پر آپریشن کر دیئے گئے۔ آخر سرکاری ہسپتالوں میں یہ حرکت کیونکر گوارا کی گئی؟ وجہ صاف ہے، اگر انہیں وہاں سے مایوس لوٹنا پڑتا تو وہ سیدھی جرائم پیشہ لوگوں اور ناتجربہ کار ڈاکٹروں کے پاس پہنچتیں اور عمر بھر کے لئے روگی ہو بیٹھتیں۔ لیکن سرکاری ہسپتالوں میں ان کے آپریشن امراض زنانہ کے ماہرین نے بڑی احتیاط اور بے ضرر آلات کے ذریعے کئے اور کوئی موت واقع نہ ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر آپریشن کرے تو عورت کے لئے جان لیوا ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ روس میں اسقاط حمل سے واقع ہونے والی اموات کی شرح یک لخت صفر کے برابر جا پہنچی، دوسرے ملکوں میں جو خلاف قانون آپریشن ہوتے ہیں یا جو آپریشن جرائم پیشہ لوگ اور عام ڈاکٹر ضروری

آلات کے بغیر کرتے ہیں۔ ان سے واقع ہونے والی اموات کے اعداد و شمار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشتراکی ڈاکٹروں نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے بارہ سال کے عرصے میں تقریباً تین لاکھ عورتوں کی جانیں بچائیں، چونکہ حکومت کی طرف سے محفوظ اور خفیہ آپریشن کا بندوبست کر دیا گیا اور گھبراہٹ میں ناتجربہ کار اور جرائم پیشہ لوگوں سے مہنگے آپریشن کرانے کی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے بارہ سال کے عرصے میں چند اموات کی اطلاع ملی۔ جن کا موجب خلاف قانون آپریشن تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں آپریشن کو قانونی قرار دینے کے ساتھ ہی سوویت حکومت نے ایک اور قانون کے ذریعے خلاف قانون آپریشن کے لئے سخت سزا مقرر کر دی۔

اس اثنا میں اس مہم نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ عورتیں آخر یہ آپریشن کراتی کیوں ہیں؟ اس لئے کہ وہ اتنی بدکردار ہیں کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں یہ جواب بالکل مضحکہ خیز ہے۔ اس مسئلے کو اجتماعی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ یہ اقدام اس لئے کرتی ہیں کہ ان میں اولاد کی پرورش کی طاقت نہیں ہوتی۔ بے شمار عورتوں اور لڑکیوں سے دریافت کرنے کے بعد اشتراکی سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید سماج میں اولاد والی ماں کی تعریف اور قدر زبانی تو بہت ہوتی ہے لیکن عملاً اکثر عورتوں کے لئے بچے کی پیدائش اور پرورش سخت سزا کے برابر ہے۔ حاملہ عورت سے ملازمت چھن جاتی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کا حاملہ ہو جانا بہت بڑی ذلت اور رسوائی ہے۔ اولاد والی عورت کے لئے زیادہ بچے جننا خود اپنے آپ، اپنے شوہر اور پہلے بچوں کو معاشی مصیبت میں مبتلا کرنے کے برابر ہے۔ اگر عورت حمل اور زچگی کے دوران میں طبی امداد حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تو اس کے لئے بچے کی پیدائش خطرناک جسمانی

عذاب سے کم نہیں، جو اس کی ہلاکت کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں سوویت حکومت نے جو اقدام کئے انہیں بہت سے سماجی اور طبی ماہرین نے تفصیلاً بیان کیا ہے، مختصراً یہ اقدام ایسے قوانین پر مشتمل ہیں، جن میں ہر کنواری یا شادی شدہ عورت کو ایام حمل میں مفت طبی امداد چھ سے بارہ ہفتے تک رخصت باتنخواہ صحت یاب ہونے کے بعد ملازمت پر واپس آنے کا حق، مقام ملازمت میں دو مہینے سے پانچ سال کی عمر تک بچے کی مفت پرورش اور نگہداشت، چھاتی سے دودھ پلانے والی ماؤں کو روزانہ کئی گھنٹے کی چھٹی اور مالی و معاشی امداد کی ضمانت دی گئی ہے۔

ان قوانین کے نفاذ کے ساتھ ہی وسیع پیمانے پر تعلیمی مہم چلائی گئی اور عام شہریوں کو ذہن نشین کرایا گیا کہ حکومت اولاد والی عورتوں کے لئے تمام سماجی اور معاشی مصیبتوں اور سزاؤں کو دور کر رہی ہے اور ہر عورت کے لئے ماں کے فرائض با اخلاق طریقہ سے سرانجام دینا ممکن ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ نئے سماج کے ایک محنتی فرد کی طرح قابل احترام حیثیت سے زندگی بسر کر سکے گی۔

اس تجربے کا تعلق اخلاقیات یعنی انسانی فطرت کی اصلاح سے تھا اور یہ تجربہ ایک ایسے ملک میں کیا گیا، جہاں بچوں کی شرح اموات اتنی زیادہ تھی، جتنی آج کل ہندوستان یا کیوبک میں ہے اور آج سوویت یونین میں بچوں اور ماؤں کی شرح اموات دنیا کے تمام ملکوں کے مقابلے میں سب سے کم ہے، وہاں ہر سال ۶۰ لاکھ سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں ناجائز بچوں کی تعداد صفر کے برابر ہے، حمل کو ضائع کرنا نہ صرف خلاف قانون ہے بلکہ اب یہ فعل بد فی الواقعہ ختم ہو گیا ہے۔

نئے جنسی اخلاق کی تعمیر کے متعلق اس تاریخی تجربے کے آخری حصے کا جائزہ لینا

باقی ہے۔ جس کا تعلق شادی اور خاندان سے ہے۔

ماں بننے والی عورتوں کے راستے سے تمام معاشی رکاوٹوں کو دور کر دینے سے سوویت یونین کے عام باشندوں پر نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ ماں اور بچے سے متعلق قوانین عین اس وقت جاری کئے گئے جبکہ ملک بھر میں عصمت فروشی کے انسداد کی مہم جاری تھی۔ اس لئے عورتوں کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانے کی جدوجہد اپنے آخری مرحلے پر پہنچ گئی اور مذکورہ قوانین کی بدولت مرد و عورت میں اصلی مساوات قائم ہو گئی شادی کی راہ میں جتنی معاشی اور مالی رکاوٹیں تھیں وہ دور ہو گئیں اور تاریخ میں پہلی مرتبہ شرمندہ تعبیر ہوا کہ "جوڑا بھی مجرد فرد جیسی زندگی گزار سکتا ہے"۔ نوجوان عشاق کے لئے شادی کرنا اور والدین بننا ممکن اور آسان ہو گیا، کیونکہ طلبہ تک کو وظائف ملتے تھے اور انہیں بھی دوسرے افراد کی طرح سماجی تحفظ حاصل تھا۔ اس سے نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح پر بہت گہرا اثر پڑا، شادی میں تاخیر کی مصیبت کا خاتمہ ہو گیا اور نوجوان اپنی زندگیوں کی تشکیل کے نازک مرحلے میں محبت کی شادی اور والدین بننے کے مفید تجربے سے مستفیض ہوئے، نتائج نے ثابت کر دیا کہ اشتراکی سائنس دان ٹھیک کہتے تھے کہ بداخلاقی اور جنسی بے راہروی کی محرک انسان کی "فطرت" نہیں بلکہ بداخلاق اور گھٹیا قسم کی زندگی کے غیر فطری طریقے ہیں۔ غیر اخلاقی سماج اور معاشی نظام مردوں اور عورتوں کو بدی کی طرف دھکیلتا ہے۔ کیونکہ اس میں شادی اور ازدواجی زندگی وبال اور بھاری بوجھ ہے اور ہر دو اصناف یعنی مرد و عورت برابر کے مظلوم ہیں۔ سوویت یونین سے ۲۰ سال کے عرصہ میں اخلاقی دوعملی ختم ہو گئی۔ مردوں نے محسوس کیا کہ شادی اور ازدواجی زندگی کے راستے سے رکاوٹیں دور کرنے اور عورتوں کو سماجی اور معاشی مساوات دینے سے نہ صرف عورتوں کو

اوپر اٹھایا جا رہا ہے بلکہ انہیں بھی اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا جا رہا ہے

سوویت یونین کے مشہور قوانین طلاق آزادی نسواں کی مہم کا ایک اہم جزو تھے۔ وہ ہمارے ہاں کے قوانین سے بالکل مختلف تھے اور ان کا مقصد ہرگز وہ نہ تھا جو سوویت یونین کے بدخواہ دانستہ طور پر بتایا کرتے تھے۔

طلاق سے متعلق اشتراکی پالیسی کا مقصد انجام کار شادی اور خاندان کو تقویت بخشنا تھا اس کی بنیاد محبت اور شادی کے اس تاریخی تجزیے پر تھی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ سوویت یونین کے ابتدائی قوانین طلاق بہت نرم تھے۔ ان کے مطابق طلاق کے طالب مرد یا عورت کا رجسٹریشن آفس کی معرفت فریق مخالف کو اتنا لکھ بھیجنا کافی تھا کہ شادی ختم ہوئی۔ بچوں کی حفاظت اور پرورش کے بندوبست کے علاوہ کوئی اور عدالتی کارروائی نہ تھی اور رجسٹریشن آفس کی فیس سینما کے ٹکٹ کی قیمت سے بھی کم تھی۔ سوویت یونین کے قانون سازوں نے ایسی ہر ایک شادی کو توڑ دینے کے حق کو تسلیم کیا، جس کی بنیاد محبت پر نہ ہو اور وہ اپنی اس منطق پر آخر تک قائم رہے کہ صرف دائمی محبت ہی شادی کا ثبوت ہے۔ مرد و عورت میں کسی وجہ سے محبت ختم ہو جائے تو شادی کو بھی ختم ہی سمجھنا چاہیئے اس لئے انہوں نے وہ تمام قانونی اور معاشی پابندیاں ہٹا دیں جو طلاق کی راہ میں حائل تھیں وجہ صرف یہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اگر شادی شدہ جوڑے میں سے کوئی فریق کسی غیر مرد یا عورت سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کرے، یعنی زنا یا عصمت فروشی کے ذریعے جذبات کی تسکین کرنا چاہے تو سمجھنا چاہیئے کہ ان کی شادی محبت پر مبنی نہیں اور ان کی زندگی سوگوار ہے۔

مطلب یہ کہ سوویت یونین میں قوانین طلاق کو بے میل اور جبر کی شادیوں کو ختم کرنے یا ایسی شادی کو توڑنے کے لئے استعمال کیا گیا جنہیں خلاف اخلاق تصور کیا جاتا تھا۔ زار شاہی

روس میں ایسے بے شمار رشتے ناطے لاکھوں تھے۔ لہٰذا غیر مشروط طلاق کے ذریعے بے جوڑ شادیوں کی شکست اور محبت کی شادیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

ظاہر ہے اس قسم کے قوانین اور دلائل آفاقی نہیں ہو سکتے۔ ان کا اطلاق محدود ہے۔ بہت سے لوگ اس صورت حال کا تصور کرتے ہی جو طلاق کے نرم قوانین کے ہمہ گیر نفاذ پر ہماری جمہوریتوں میں پیدا ہو سکتی ہے ان کی سخت تردید اور مخالفت کرنے لگیں گے۔ ہمارے ہاں ایسا قانون نافذ کر دیا جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی کہ تقریباً تمام شادیاں فوراً ہی ٹوٹ جائیں گی۔ کیونکہ ہمارے ہاں اکثر رشتے ناطے طلاق کی قانونی اور مالی مشکلات کے طفیل قائم ہیں۔ یہ حقیقت بھیانک ضرور ہے لیکن قابل تردید نہیں۔ انقلاب کے بعد مسلسل کئی سال تک روس میں بھی یہی صورت حال برپا رہی۔ لیکن آٹھ دس سال کے عرصے سے سوویت یونین میں طلاق کے واقعات کی تعداد متواتر گر رہی ہے۔ اس کا مقابلہ دوسرے ملکوں سے کیا جائے تو طلاق کی واردات کی کثرت اور سہل قوانین طلاق کی تحریک کی شدت پر آدمی چونک جاتا ہے۔ حالانکہ مذہبی لوگ اس کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس سوویت یونین میں طلاق کو سخت تر بنایا جا رہا ہے۔ نئے سماجی اخلاق کی بدولت شادی پائیدار ہو گئی ہے جو لوگ پے در پے طلاق دے کر نت نئی شادیاں کرتے ہیں، ان کی مذمت کی جاتی ہے۔ انسانی محبت کی شائستگی، حقیقی محبت کی پائیداری اور اس حیاتی و نفسانی حقیقت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ انسانوں میں جنسی تعلقات کی اعلیٰ ترین صورت دو افراد یعنی ایک مرد اور ایک عورت کا ایک دوسرے کے لئے وقف ہو جانا ہے اور جنسی تعلقات کی مکمل تسکین محض اس شادی میں ممکن ہے۔ جو مرتے دم تک ٹوٹے باہمی محبت پر قائم رہے اور جو مشرف بہ اولاد ہو۔ ۱۹۴۴ کے موسم گرما میں ماسکو سے شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق سلسلہ قوانین کا اعلان کیا گیا تو جمہوریت

پسند دنیا نے بہت زیادہ دلچسپی ظاہر کی۔ ان قوانین پر کئی تبصرے لکھے گئے اور سوویت یونین کے بعض نام نہاد دوست یہ جان کر عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گئے کہ وہاں کوئی شخص طلاق خرید نہ سکے گا۔ گویا طلاق نہ ہوئی ڈاک کا ٹکٹ ہوا لیکن عام ناقد مطمئن نظر آتے ہیں اور بعض مبصر شالن کی طرف اخلاق آموز انگلی اٹھائے ہوئے ہیں کہ روس ہمارے طرز زندگی کی طرف مائل ہے کتنی شرمناک سہل انگاری ہے۔

ہمارے ملکوں میں عصمت فروشی عام ہے۔ نابالغوں میں جرائم کا دور دورہ ہے۔ جنسی بیماری کسی انسدادی کوشش سے متاثر نہیں ہوتی، شراب نوشی عام ہے۔ حمل گرانے کے واقعات پہلے سے دگنے چوگنے ہیں اور طلاق کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں ایسے مبصر پائے جاتے ہیں جو یہ کہہ کر ہمیں تسلی دیتے ہیں کہ روس ہماری طرف مائل ہے۔ گویا بداخلاقی میں وہ ہماری تقلید کر رہا ہے۔

سیدھی بات ہے کہ نئی دنیا، ازدواجی زندگی، طلاق اور اسقاط حمل کے متعلق سوویت یونین کے حالیہ قوانین نئے اخلاق کی تعمیر کی مسلسل اور سائنٹیفک منصوبہ بندی کی ایک کڑی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہاں اس منزل مقصود کی طرف ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا ہے۔ جس کی طرف ہم اس کتاب میں مسلسل اشارہ کرتے چلے آرہے ہیں۔

سوویت یونین میں شادی کا نظام اخلاقی محبت کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے جس طرح وہاں اسقاط حمل کے اسباب ختم ہو جانے پر چند سال سے اس کے خلاف سخت قوانین دوبارہ نافذ کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح اب وہاں اس امر کی ضرورت اور امکان پیدا ہو گیا ہے کہ قوانین طلاق کو سخت کر دیا جائے، کیونکہ آزاد اور آسان طلاق کی ضرورت جو وہاں پہلے محسوس کی جاتی تھی، اب باقی نہیں رہی۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ وہاں شادی کی ناکامی کے معاشی اخلاقی اور سماجی اسباب بڑی حد تک ختم ہو گئے ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ صورتحال

کا کھلا اعتراف قومی ضابطہ قانون میں کرنا ضروری ہے۔ یہ ہیں قوانین طلاق کی ترمیم کے سادہ اور منطقی اسباب۔ لیکن ہمیں اس کے برعکس بتایا جاتا تھا کہ سوویت حکومت نے ابتدا میں قوانین طلاق اس لئے نہ بنائے کہ سوشلزم بداخلاقی کا پرچار کرتا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ یہ قانون محض ایک عارضی اقدام تھے اور ان کا مقصد بداخلاقی پھیلانے کی بجائے طلاق میں بداخلاقی کو سرے سے ختم نہیں تو اس کی تعداد میں ہر ممکن کمی کرنا تھا۔

سوویت حکومت نے ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو دو انقلابی قانون منظور کیے۔ پہلا قانون شادی، پیدائش بچوں، اور موت کے اندراج کے متعلق تھا اور دوسرے کو قانون شادی و طلاق کہتے ہیں چونکہ یہ قانون بالکل نئے تھے، اس لئے دنیا بھر میں ان کے خلاف غلط اور جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا۔ ایک قیامت برپا کر دی گئی۔ لیکن آج یہ قوانین حالات و واقعات اور نئے قوانین کے نفاذ سے بیکار ہو گئے ہیں۔ تو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ سب لوگ خاموش ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس تبدیلی کی خبر تک نہیں۔

آیئے ہم چند لمحوں کے لئے ان قوانین سے آگاہی حاصل کریں۔

میں نے مندرجہ ذیل رپورٹ سوویت یونین کی ایک مشہور وکیل عورت بتیسوفہ سے حاصل کی ہے۔ جہاں تک حقائق کے قابل اعتبار ہونے کا تعلق ہے۔ ہم یہ فیصلہ قاری کی اپنی عقل سلیم پر چھوڑتے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں۔

سوویت یونین کے قوانین شادی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عورت کو قانونی اعتبار سے آزاد کر دیا۔ اسے مردوں کے برابر حقوق دیئے اور عدم مساوات کے آخری قلعے میں شگاف ڈال دیا یعنی خاندان میں مساوات پیدا کی۔ جہاں صدیوں پرانے رواج کے مطابق عورتوں کی مظلومیت کو قانونی درجہ مل چکا تھا اور عورتوں پر ظلم و تشدد روزانہ کا معمول اور ایک امر مسلمہ تھا۔ عورتوں

کی مظلومی اور غلامی پر مردانہ قبائلی نظام کے سماجی رشتوں کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

"لیکن محض نئے قوانین بنا دینے سے سوویت حکومت کو پرانی شادیوں کے بارے میں جو زار شاہی قوانین کے ماتحت ہوئی تھیں۔ خود بخود کوئی اختیار حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان شادیوں کو ناجائز قرار دینے کے لئے صرف یہ کہنا کافی نہ تھا کہ زار شاہی عہد میں اکثر شادیاں ایسی عورتوں کے ساتھ طے پائی تھیں جن کو شادی جیسے اہم معاملے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ذرائع حاصل تھے، نہ طاقت اور آزادی۔ جن بنیادوں پر زار شاہی روس کے خاندان قائم تھے۔ اشتراکی ضابطہ قانون انہیں جائز قرار نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن انہیں محض اس بنا پر توڑا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ انقلاب سے پہلے جتنی شادیاں ہوئیں وہ بے لوث محبت اور باہمی احترام کے جذبات پر مبنی نہ تھیں۔ بلکہ مادی مفاد اور بارسوخ رشتہ داروں کے حصول کے پیچیدہ نظام پر قائم تھیں۔

"چونکہ انقلاب اکتوبر کا مقصد انسانوں کے درمیان ہر قسم کے عدم مساوات یعنی انسان کی انسان کے ہاتھوں ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنا تھا۔ اس لئے خاندان جیسے اہم حلقہ رشتہ داری کو جوں کا توں کس طرح رہنے دیا جاتا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء کے قوانین شادی نے خاندان کے متعلق ایک نیا اصول قائم کیا۔ وہ اصول آزاد انتخاب کا اصول تھا۔ اس اصول کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ آج سے سوویت یونین کا ہر کنبہ محبت، باہمی احترام اور مرد و عورت کی مساوات پر قائم کیا جائے گا۔

"ظاہر ہے ایسا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اشتراکی قانون وہ پابندیاں ہمیشہ کے لئے اٹھا دے جو طلاق کے رستے میں حائل تھیں، کیونکہ زار شاہی روس میں صرف کلیسا کی مداخلت پر ہی طلاق حاصل کی جا سکتی تھی اور کلیسا نے اس پر نہایت ہی اخلاق سوز پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جن پابندیوں کو روس کی نئی عورت اخلاق سوز کہتی ہے، وہ ہو بہو ویسی ہی ہیں جیسی کہ آج روس کے باہر اکثر ملکوں میں عائد ہیں۔ قصہ کوتاہ ہمارے ہاں کے اکثر قوانین طلاق کی

طرح زارشاہی کے زمانے کے قوانین طلاق کی رو سے بھی طلاق صرف اسی صورت میں دی جاتی تھی جب کہ گواہ یہ ثابت کر دیں کہ مرد یا عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اپنی دلیل کے ثبوت میں بیلسوفہ نے ان المیوں کا حوالہ دیا جنہیں طالسطائی نے اپنے ناول "انا کرنینا" اور "زندہ لاش" میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ کہ قانون کی تلاش کے نتیجے انسانی تعلقات اور احساسات بری طرح پامال اور مردہ ہوتے جا رہے تھے۔"

۱۹۱۷ء کے قانونِ طلاق کی پہلی دفعہ کے مطابق ایک فریق یا دونوں فریقوں کی درخواست پر شادی منسوخ کی جا سکتی ہے۔ دوسری دفعہ بھی اسی طرح انقلاب پسندانہ تھی۔ اس کے مطابق تنسیخ شادی (طلاق) کسی عدالتی کارروائی کے بغیر محض رجسٹرار کے دفتر میں درخواست دینے سے حاصل کی جا سکتی تھی۔

تاہم موصوفہ اس بات کا اعتراف کرتی ہیں۔ کہ "اس میں شک نہیں کہ اس قانونی رعایت کا ناجائز استعمال بھی ہوا۔ بعض ایسے لوگ جو اخلاق سے قطعاً عاری تھے انہوں نے محض ہوس پرستی کے لئے متعدد عورتوں سے نکاح کئے اور سوویت یونین کے قوانین طلاق کے جمہوریت دوست اصولوں کو نام نہاد "آزاد محبت" کے نظریے کے حامیوں نے غلط معنی پہنائے، انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ قانون ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہیں کہ خاندان غیر ضروری چیز ہے کیونکہ یہ انفرادی آزادی کو ختم کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۱۷ء کے قانون طلاق کی اشد ضرورت تھی اور وہ بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس نے رشتہ شادی کو عورت کی غلامی اور خاندان میں عدم مساوات کا ذریعہ بنانے کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔"

ہم ان اقدامات کا ذکر کر چکے ہیں، جن کے ذریعے روسی عورت کو معاشی اور سماجی آزادی دلائی گئی۔ بیلسوفہ آزادیٔ نسواں کے ثبوت میں کہتی ہیں کہ:۔

"آج سوویت یونین کے کالجوں اور سکولوں میں بے شمار عورتیں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور بہت سی مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ ابتدائی قانونِ طلاق کی برکتیں خاص طور سے وسط ایشیا اور ٹرانس کاکیشیا کی اشتراکی جمہوریتوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ان قوانین کی بدولت عورتیں عوامی وزارتوں میں نظر آتی ہیں۔ عورتیں اجتماعی زرعی فارموں کی صدر ہیں اور خوشگوار صورت حال ان ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں ابھی کل تک شوہر اپنی بیوی کو محض برقع پہننے سے انکار کرنے پر قتل کر دیتا تھا۔

اشتراکی حکومت کے آغاز میں زندگی بہت کٹھن تھی۔ بلیسوف کے قول کے مطابق ان حالات میں روسی عورت کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ یا وہ اپنی پرانی دنیا کی طرف لوٹ جاتی اور چار دیواری اور رسوئی میں کھو جاتی، یا وہ زندگی کی شاہراہ پر چل نکلتی۔ تعلیم پاتی، کسی فن میں مہارت حاصل کرتی اور مادرِ وطن کی خیر خواہ بہادر بیٹی بنتی اور ترقی پسند خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں انسانیت کا ہاتھ بٹاتی۔ عورت صرف دوسرے راستے پر چل کر ہی مرد کے لئے ایک مفید ساتھی اور دوست ثابت ہو سکتی تھی، جب تک خاندان میں نیا درجہ نہ پا لیتی اس کے لئے ان دونو مقامات کا چولی دامن کا ساتھ تھا"

ظاہر ہے، کوئی قانون خواہ کتنا بھی انقلابی کیوں نہ ہو، سماجی رشتوں کو خود بخود نہیں بدل سکتا تھا۔ روسی عورت کو حصولِ حقوق کی جدوجہد میں ہر موڑ پر نئی دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عورتوں کی اکثریت صدیوں پرانی عادتوں اور رسموں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اپنے لئے پرانے ازدواجی تعلقات کو موزوں خیال کرتی تھیں۔ نئے قوانین نے سماجی اور اخلاقی ترقی کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ لیکن اس کے حصول کے لئے عورتوں کو سخت جدوجہد کی ضرورت تھی۔ انہیں معمر عورتوں اور ایسے مردوں کی شیطانی مخالفت کو توڑنا

پڑا جو تحریک آزادئ نسواں کو سازشی چالوں کے ذریعے ناکام بنانا چاہتے تھے۔

لہٰذا روسی عورت کے ساتھ کیا بیتی؟ اس کے جواب میں سیلیسو فرکا بیان بہت دلچسپ ہے وہ عورتوں کی آزادی کی تحریک کے ابتدائی ایام کے متعلق کہتی ہیں۔

عورت کو اپنی قوتوں پر اعتماد پیدا کرنا تھا۔ ہر قسم کی مشکلات پر قابو پانا تھا اور تمام رکاوٹوں کو پھاند جانے کا پکا ارادہ کرنا تھا۔ یہ جدوجہد ایک مشکل اور پیچیدہ ترین نفسیاتی جدوجہد تھی اور یہ اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی دشوار تھی کہ روسی عورت کے سامنے کوئی مثال نہ تھی۔ جس سے اسے کچھ مدد ملتی۔

" دنیا میں ایسی کوئی مثالی عورت موجود نہ تھی جس میں وہ تمام شخصی اور سماجی خوبیاں موجود ہوں، جن کی بدولت وہ مرد کے ہم پلہ بھی ہو اور اپنے فطری اوصاف، اپنی نسوانیت، اپنے وقار اور مادرانہ شفقت کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہو۔ کیونکہ یہ اوصاف عورت کی فطرت کا لازمی جزو ہیں۔ انسانیت کا ماضی نسوانی سیرت کے ایک پہلو کے ارتقاء کی مثال پیش کرتا تھا اور قدرتاً وہ کسی ایسی عورت کو پیش کرنے سے قاصر تھا۔ جس کا توازن اور ہمہ گیر ارتقا ہوا ہو۔ ایسی مثال ماضی کے بجائے مستقبل ہی پیدا کر سکتا تھا۔"

یہ قانون دان خاتون اس عہد کے ابتدائی دنوں کی تصویر نہایت بے باکی اور وضاحت سے پیش کرتی ہیں۔ جبکہ عورتوں نے نئے قوانین طلاق کو ذہنی طور پر قبول کر کے اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ یعنی جس زمانے میں روس میں طلاق اس قدر عام تھی کہ ہمارے ملکوں میں اسے طنزاً ربڑ کی مہر والی طلاق" کہا جاتا تھا۔ اس وقت جو صورت حال تھی اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

" حالات ایسے تھے کہ عورت کو نئے سماجی مقام تک اٹھانے کے لئے نئے سودیت

معاشرے کو صرف اپنے ہی ذرائع سے کام لینا تھا اور اشتراکی تحقیق محض نظریے تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اسے زندگی کے تجربے سے عملاً نتائج اخذ کرنا تھے۔ اس لئے بعض اوقات غلطیوں کی صورت میں مردوں اور عورتوں کے لئے ناقابل برداشت ذاتی مصائب پیدا ہو جاتے تھے خاندانی تعلقات کے بگڑنے اور گھریلو جھگڑے سے پیدا ہو جانے سے یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ اور دشوار بن جاتا تھا۔

لیکن پنجسالہ معاشی منصوبوں پر عملدرآمد کے زمانے میں نہایت ہی خوشگوار تغیر رونما ہوا لاکھوں عورتوں نے صنعت، ہوا بازی، سائنس، انجینئرنگ اور آرٹ میں مہارت حاصل کر کے اپنا معاشی اور ثقافتی معیار بلند کر لیا اور اس عہد میں سب سے زیادہ جہاد نفس عورتوں نے کیا۔

چنانچہ بلیسوف فرماتی ہیں :-

"عورت کے لئے سب سے زیادہ مشکل قربانی یہ تھی کہ اسے اپنے خاندان اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا اور اسے اپنے گھر اور خاوند کی طرف کم از کم توجہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لہٰذا یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ عورت کو اپنے لباس بالوں، چہرے وغیرہ کی آرائش کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔"

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے دوران میں ہمارے ہاں کے بہت سے "ناقدین" نے حصول منفعت کی غرض سے سوویت یونین کی سیاحت کی، لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اشتراکی لڑکیوں کے ظاہری فقدان کشش کی وجہ سمجھنے کی کوشش کی اور کتنوں نے یہ محسوس کیا کہ اشتراکی عورت نے کچھ عرصے کے لئے بناؤ سنگھار، بالوں کی آرائش، ناخنوں کی سجاوٹ، نیشنی جوتوں اور دوسرے سامان آرائش کو تمام انسانیت کے بہبود کی مشترکہ جدوجہد پر قربان کر دیا تھا۔

محترمہ بلیسوفہ فرماتی ہیں۔

"روسی عورتوں نے اکثر ضروریات زندگی کو ترک کر کے، خوبصورت لباس اور دوسرے آرائشی سامان کی قدرتی نسوانی خواہش کی کم از کم تکمیل اور وقت میں کفایت کر کے بے غرض مشقت کے ذریعے ہزار ہا سال کی ارتقائی کمی کو پورا کیا اور حقیقی مساوات کی شاہراہ پر گامزن ہو گئیں"۔

حالانکہ ہمارے ہاں اکثر ناقدین سوویت زندگی کو بہت قریب سے دیکھ آئے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس بے ہودہ رائے کا اظہار کرنے سے نہیں شرماتے کہ

"اشتراکی لڑکیوں کو معلوم ہی نہیں کہ انہیں کیا دوکا رہے"

محترمہ بلیسوفہ جواب دیتی ہیں:-

"ہر اشتراکی عورت اس عارضی مگر ضروری محرومی سے باخبر تھی۔ اس نے خوشحال اور مضبوط گھرانے کی خواہش، ماں بننے کی مسرت، محبت کے انسانی جذبات اور شوہر کے ساتھ رفیقانہ تعلقات، آرام اور نسوانی تمناؤں کو کبھی فراموش نہ کیا"۔

تاہم عارضی طور پر ایک عجیب اور غلط رجحان ضرور پیدا ہوا۔ بعض عورتیں انتہا پسند ہو گئیں۔ انہوں نے حقیقی مساوات اور ظاہری یکسانیت میں تمیز نہ کی اور عادات و اطوار اور لباس میں مردوں کی تقلید کرنے لگیں۔ لوگوں نے ایسی عورتوں کو ایک خاص نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔ جس کا انقلابی عہد کے ابتدائی دشوار ایام میں خوب شہرہ تھا۔ یعنی انہیں مذاقاً فوجی اشتراکیت کے نمونے کہنے لگے۔ ظاہر ہے ایسی عورتیں عام مجالس میں زیادہ نمایاں ہوتی تھیں اور غیر ملکیوں کی نظریں تو خاص طور سے سیدھی انہی پر پڑتی تھیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔ پنجسالہ معاشی منصوبے پر کامیاب عملدرآمد کے دوران سوویت یونین کا

عام معیار زندگی بہت بلند ہوا اور عورتوں کی حیثیت میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ اب اسے اس سوال سے نجات مل گئی کہ وہ گھر کا کام کاج کرے یا ملازمت، اطمینان سے انفرادی زندگی گزارے یا سماج کی گراں قدر خدمت سرانجام دے؟ اب وہ حسب منشا زندگی بسر کر سکتی تھی۔ بیلسوفہ کا قول ہے۔

"جس عورت نے اپنی فعالیت اور عملی جدوجہد سے رائے عامہ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ بھی ایک کامیاب انجینئر، ہوا باز، ڈاکٹر، سائنسدان، زرعی فارم کی صدر یا انعامی کارگر بن سکتی ہے اب اس کے سامنے ذاتی فلاح، بچوں کی پرورش اور تربیت کے بیشمار مواقع تھے اب اس کی حیثیت مرد کے برابر ہو گئی اور نیا اشتراکی خاندان سن بلوغ کو پہنچ گیا"

بیلسوفہ کی زبانی اس نئے دور کی خصوصیات یہ ہیں۔

"آج سوویت یونین کی ہر عورت شادی کے فیصلے میں آزاد ہے۔ اس پر مادی منفعت کا کوئی خیال یا کوئی قانونی یا دوسری ناہمواری اثر انداز نہیں ہو سکتی وہ اشتراکی برادری کی باوقار اور معزز رکن ہے۔ وہ اپنی خانہ آبادی اور خاندانی مسرتوں کے انتخاب میں بالکل آزاد ہے۔ عورت سے متعلق مرد کے زاویہ نگاہ میں بھی مادی تغیر واقع ہو چکا ہے۔ عورت کا تمسخر و عجز اور مرد کی خود پسندی یہ دونوں چیزیں جو نئے کنبے کو قدیم زار شاہی سے ورثے میں ملی تھیں، اب ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی ہیں۔ نئے اشتراکی گھرانے کی تعمیر بالکل اچھوتی بنیادوں پر ہو رہی ہے خاندان کی نئی ساخت اس وقت تک ناممکن تھی۔ جب تک عورت کو پوری آزادی یعنی مساوات حاصل نہ ہو جاتی۔ چنانچہ بیلسوفہ کہتی ہیں۔

"آج سوویت یونین میں ایسے تمام قانونی اور عملی لوازمات پیدا کئے جا چکے ہیں۔ جن کے بغیر ایسے خاندان کی تعمیر مشکل ہے۔ جس کی بنیاد مرد و عورت کے درمیان پر خلوص احساسات

محبت، دوستی اور احترام باہم خیالی اور مزاج کی ہم آہنگی ہو۔"

انسانی خاندان میں اس انقلابی ترقی کے بعد ۱۹۱۷ء کے قوانین بیکار ہو گئے۔ جنگ عظیم سے پہلے نہ صرف زار شاہی روس بلکہ ہمارے ملکوں میں بھی خاندان کی تباہی کا دور شروع ہو چکا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے ہاں تو آج تک جاری ہے اور بے شمار گھریلو مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سوویت یونین میں ان تمام مسائل کو پوری طرح حل کر لیا گیا اور وہاں کے باشندے اب اپنی توجہ بڑے بڑے معاملات کی طرف مبذول کرنے کے قابل ہو گئے۔

اب وہ اپنے مستقبل کو شاندار بنانے اور اپنی آنے والی نسلوں کی بہتری کے لئے کوشاں ہو گئے، سوویت حکومت پر شروع سے یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ انسانی خاندان کی تباہی کی خواہاں ہے اور تمام بچوں کو ریاست کے محافظین کی حیثیت سے پالنا چاہتی ہے لیکن واقعات نے اس الزام کی تردید کر دی۔ سوویت یونین نے گزشتہ بیس برس میں خاندانی زندگی کا جو نیا اور بلند معیار قائم کیا وہ مرد و عورت، زن و شوہر کے تعلقات میں انقلابی تبدیلی کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ سوویت یونین کے نئے قوانین شادی و خاندان کا مقصد اسی معیار کو پائیدار بنانا ہے

وہاں ۸ جولائی ۱۹۴۴ء کو جو نئے قوانین پاس ہوئے، ان کے نفاذ پر ہمارے ہاں کے اخباروں میں بڑی سرعت سے سخت قسم کی تبصرہ بازی شروع ہو گئی، لیکن حیرانی کی بات ہے کہ نام نہاد تبصرہ نگاروں نے ان انقلابی تغیرات کی طرف اشارہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی جو اس سے پہلے سوویت خاندان میں رونما ہو چکے تھے۔

ان قوانین کا اعلان کیا گیا تو روس کے باہر ہر کہیں اودھم مچایا گیا کہ روس نے اپنی ابتدائی پالیسی کو اچانک اور حیران کن طریقے سے منسوخ کر دیا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ۱۹۲۷ء میں سوویت یونین کی بڑی بڑی وفاقی جمہوریتوں میں جنہیں سوشلسٹ فیڈریشن آف سوویت ری پبلکن کہتے

ہیں۔ نہایت ہی اہم قانونی تغیرات رونما ہوئے۔ یہ نئے قوانین شادی کے متعلق تھے۔ آیئے ان کی نوعیت پر غور کریں۔

ان قوانین نے اس قسم کے انسانی تعلقات کو قانونی شکل دے دی، جیسے ہمارے ہاں قانوناً جائز ہیں۔ یعنی رسمی شادی کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۲۷ء سے پہلے سوویت روس میں صرف وہی شادیاں قانوناً جائز تھیں۔ جن کا اندراج سرکاری رجسٹرار خود کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۷ء کے قوانین میں رسمی شادی کو ایک حد تک جائز تسلیم کر لیا گیا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ رسمی شادی کو رجسٹرڈ شادی کے برابر تسلیم کر لیا گیا۔ شادی کا رجسٹر ہونا اب بھی نکاح کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ لیکن سماجی اور معاشی بحران کے دور میں جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کا مزید قانونی تحفظ لازمی تھا۔ اس لئے نئے مجموعہ قانون میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ رسمی شادی کے بعد ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے والے مرد اور عورت کو رجسٹرڈ شادی کی شرائط سے بری الذمہ تصور نہیں کیا جائیگا۔

رسمی شادی کے مندرجہ ذیل عملی ثبوت ہیں۔

(۱) دونوں فریق اکٹھے رہتے ہوں۔

(۲) عام لوگ انہیں شوہر اور بیوی کی حیثیت سے جانتے ہوں۔

(۳) ان کے پاس مشترکہ گھر ہو۔

(۴) وہ ابھی تک یا پہلے سے ایک دوسرے کے روٹی کپڑے کا خرچ برداشت کرتے رہے ہوں اور دونوں اپنے بچوں کی پرورش کرتے رہے ہوں۔

ظاہر ہے اس قانون سے ایسے عورتوں کا تحفظ مقصود تھا جنہیں غیر ذمہ دار مرد رجسٹرڈ شادی کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے چھوڑ کر الگ ہو جاتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک مسلم حقیقت

ہے کہ طلاق اگرچہ قانوناً کسی بھی رجسٹریشن آفس سے نہایت ہی کم قیمت پر حاصل کی جاسکتی تھی لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ عام لوگ کسی معقول سماجی وجہ کے بغیر طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ عام لوگ ان سے سخت نفرت کرنے لگے تھے اور جن افراد کو کئی بار طلاق ہو جاتی تھی ان کے عزیز اور بزرگ ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے لگے تھے۔ لہٰذا ایسے ماحول میں بعض غیر ذمہ دار افراد میں ناجائز جنسی تعلقات پیدا کرنے کا رجحان پیدا ہونے لگا تھا اور اس کا تدارک لازمی تھا۔

۱۹۲۷ء کے قانون شادی کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں میاں بیوی کی نجی جائداد کا فیصلہ خاص طور سے کیا گیا ہے۔ آج بہت سے لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ سوویت حکومت شخصی جائداد کو ختم نہیں کرتی اور نہ وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن وہ ایسے اداروں کی شخصی ملکیت کو برداشت نہیں کرتی جو منافع اندوزی کی غرض سے دوسروں کی محنت کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ یعنی سوویت روس میں سرمایہ دارانہ ملکیت کو ختم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رسمی شادی کے قانون میں میاں بیوی کی تمام نجی جائداد کو دونوں کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اگر رسمی شادی ٹوٹ جائے تو میاں بیوی کی مشترکہ شخصی جائداد کی مساوی تقسیم اور بچوں کی پرورش کے انتظام کے لئے عدالتوں کے دروازے کھلے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی قرار پایا کہ اگر فریقین میں سے کوئی ایک کام کرنے کے ناقابل ہو تو دوسرا فریق ازدواجی تعلقات ختم ہو جانے کی صورت میں بھی اس کے روٹی کپڑے کا ذمہ دار ہوگا۔

ماسکو کے سرکاری وکیل، لیے براندوف کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۷ء کے قانون کے رو سے رسمی شادی صرف مذکورہ بالا دو شرائط کے اعتبار سے رجسٹرڈ شادی کے برابر ہے۔ اس قانون میں جائداد کے حق وراثت کو نظر انداز کر دیا گیا لیکن خاص صورتوں میں عدالت عالیہ وراثت کا فیصلہ بھی

کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ باقی دوسرے حقوق کو بھی چھوڑ دیا گیا جو رجسٹرڈ شادی میں واجب الادا ہوا کرتے تھے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سوویت یونین میں چونکہ ساٹھ چھوٹی بڑی قومیں آباد ہیں، اس لئے وہاں کوئی واحد قانون شادی یا دوسرے رسم و رواج سے متعلقہ مسائل کا بیک وقت احاطہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا بیاہ شادی اور رسم و رواج کے بارے میں قانون بنانے کا کام مختلف جمہوریتوں کے اختیار میں ہے۔ سولہ وفاقی ریاستوں میں سے ہر ایک اپنا الگ ضابطہ قانون رکھتی ہے۔ تاہم چند قانون ایسے بھی ہیں جن کا اطلاق ملک کے تمام علاقوں پر ہوتا ہے۔" وہ مثال میں جمہوریہ یوکرین کو پیش کرتے ہیں۔ جہاں ۱۹۲۷ء کا قانون شادی کبھی لاگو نہیں ہوا اور رجسٹرڈ شادی کے علاوہ کسی دوسری شادی کو قانوناً تسلیم نہیں کیا گیا۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ نہ صرف ۱۹۴۴ء کے قوانین کے نفاذ کے وقت سے بلکہ اس سے سترہ سال پہلے بھی سوویت یونین میں رسمی نکاح اور رجسٹرڈ شادی میں خاص امتیاز روا رکھا جاتا تھا یعنی رجسٹرڈ شادی کو رسمی نکاح پر ترجیح دی جاتی تھی اور اسے افضل مانا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں تمام سوویت یونین میں ۱۹۴۴ء میں ایک اور خاص قانونی تبدیلی رونما ہوئی جسے ہمارے ہاں کے مبصرین نظر انداز کر جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ رسمی نکاح کو اب کسی قسم کی قانونی حمایت حاصل نہیں۔ اس ترمیم کی وجہ بالکل عام فہم ہے۔ سوویت یونین میں شادی اور خاندان ترقی کرکے اس درجے تک پہنچ گئے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کے تحفظ کے لئے آفاقی، مسلمہ اور قانونی شادی کے علاوہ کسی دوسرے نکاح کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ یعنی سوویت سماج میں اتفاقی ہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ تمام معاشرہ ترقی کی ایک ہی سطح پر ہے اس لئے تمام سوویت یونین کے لئے اب ایک ہی قانون کافی ہے۔ پہلے کی طرح ایک سے زیادہ قوانین کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میں نے سوویت یونین کی اکادمی علوم کے ادارہ قانون کے ایک ممبر اور مصنف پروفیسر سے مارچ ۱۹۴۵ء میں اس سلسلے میں مزید اطلاعات حاصل کیں۔ انہوں نے مجھے بتایا۔

"سوویت یونین میں رسمی شادی کی تاریخ بڑی سبق آموز ہے۔ ۱۹۱۸ء میں قوانین شادی کا جو ضابطہ شائع کیا گیا۔ اس میں بے قاعدہ ازدواجی رشتوں کو قانونی تحفظ کی ضمانت نہ دی گئی۔ کیونکہ ایسا کرنے سے خاندان کی بنیادیں ہل جاتیں۔ حکومت نے پہلے دن سے ہی خاندان اور اس کے استحکام کی طرف خاص توجہ کی تاکہ پائیدار اور صحت مند خاندان کے قیام کے لئے راستہ ہموار ہو جائے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر موصوف کا یہ بیان درست ہے تو سوویت یونین نے رسمی شادی کو ۱۹۲۶ء میں یعنی آٹھ سال تک اسے تسلیم نہ کرنے کے بعد یکایک قانوناً جائز کیوں قرار دیدیا۔

پروفیسر سوردیوف فرماتے ہیں۔

"اشتراکی ریاست اور اس کے معاشی نظام کے ارتقاء کی ابتدائی منزل میں رسمی شادی کو قانوناً جائز قرار نہ دیا جاتا تو عورت کے مفاد کو شدید صدمہ پہنچتا۔ اس وقت عوام کا ثقافتی اور مادی معیار بلند نہ تھا۔ جنگ کی خوفناک تباہی کے بعد بحالیات کار دور آیا تو افلاس اور بیروزگاری کا مسئلہ بڑی شد و مد سے سامنے آیا۔ ان حالات میں مفلس اور بے کس عورتیں مادی اعتبار سے خوشحال مردوں کے ساتھ رسماً ازدواجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوئیں۔

"لہٰذا رسمی شادی میں ہر عورت کے لئے روٹی کپڑے کے ماہوار خرچ اور حق وراثت کا قانوناً تعین نہ کیا جاتا تو نقصان صرف عورتوں کا تھا۔ لہٰذا سوویت حکومت اس صورت حال کو عام نہ ہونے دے سکتی تھی۔"

یہ اشتراکی قانون دان مزید فرماتے ہیں: "اس کے بعد حالات پہلے سے زیادہ خوشگوار ہو گئے۔ بے روزگاری ختم ہو گئی۔ عورتوں کو تعلیم و تربیت اور ملازمت کے مواقع بہم پہنچائے گئے

لاکھوں عورتیں صنعت کار بن گئیں اور انہوں نے ملک کی معاشی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی جد و جہد میں کارہائے نمایاں کئے۔ روس پر جرمنی کے حملے سے ایک کروڑ ۱۰ لاکھ عورتیں کارخانوں یا دفتروں میں اور ایک کروڑ ۹۰ لاکھ زرعی فارموں میں کام کرتی تھیں۔ جنگ کے آغاز کے وقت کارخانوں میں کام کرنے والے افراد کی کل تعداد میں ۴۵ فیصد عورتیں تھیں۔

علاوہ ازیں عورتوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی حکومت نے ان کی مالی امداد بھی بڑھا دی۔ بچوں کے لئے نئے سکول، نرسریاں (جہاں نرسیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں) کنڈرگارٹن (جہاں عملی اسباق کھلونوں، کھیلوں وغیرہ کے ذریعے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے) اور کریشز (دودھ پیتے بچوں کی پرورش کے ادارے) کھولے گئے۔ ان کے علاوہ حکومت نے خاندان کی مادی بہبود کے مختلف اداروں میں اضافہ کیا۔ اس طرح ازدواجی زندگی کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

پروفیسر سوروکن مترمہ ہیلیوفیہ سے اتفاق کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس مادی بنیاد میں سے مرد و عورت، میاں بیوی کے درمیان تعلقات کا تعین کرنے والے نئے محرکات پیدا ہوئے۔ اب عورتوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے قانونی احکامات اور رسمی شادی کی حفاظت ضروری نہ رہی اب کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ رسمی نکاح کرتی تو لوگ اس کے رویے کو شادی اور خاندان کے لئے نقصان دہ تصور کرتے اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔"

تسلیم یہ ہمارے لئے واقعی حیرانی کی بات ہے کہ ازدواجی رشتوں کے استحکام اور خاندان کے تحفظ جیسے نازک مسائل کو قانون ساز لوگ حل کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہمارے ملکوں میں شادی، طلاق، روٹی، کپڑے کے خرچ وغیرہ کے قوانین میں تبدیلیاں کرانے کے لئے بے پناہ شور برپا ہے۔ البتہ اکثر مجوزہ تبدیلیاں قوانین طلاق کو نرم کرنے کے متعلق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ

تحریک نرم اور سہل طلاق کے لئے جاری ہے۔

شادی کے متعلق سوویت یونین اور ہمارے ہاں کے قانونی اقدامات میں جو فرق ہے اس کا تعین اتنا مشکل نہیں، سوویت یونین میں پے بہ پے قانونی تبدیلیاں اس لئے کی گئی ہیں کہ ازدواجی قوانین کو سوویت سماج کے عظیم معاشرتی اور معاشی تغیرات سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں قوانین شادی کی تجدید کے مطالبے کا بڑا محرک وہ خیالی نظریہ ہے۔ جسے "ترقی پسند" وکیل، جج، قانون ساز اور پادری تک "محبت اور اخلاق" کے متعلق "نئے زاویہ نگاہ" کا نام دیتے ہیں یعنی یہاں معاشی تبدیلی کے بغیر قانونی تبدیلی کی توقع کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں سوویت یونین میں عورت کی سماجی حیثیت کے تحفظ و استحکام اور انجام کار خود شادی کی پائیداری، یعنی میاں بیوی، بچوں اور تمام خاندانی رشتوں کی استواری کی خاطر قوانین شادی میں ترمیم کی گئی۔ لیکن ہمارے ہاں قوانین شادی میں ترمیم کا مطالبہ کرتے وقت ایسے مقاصد کا نام تک نہیں لیا جاتا اور اس کے برعکس قانون طلاق میں ترمیم کے مطالبے کی سخت مخالفت کی جاتی ہے اور مخالفت میں زیادہ تر ایسے لوگ پیش پیش ہیں جنہیں خدشہ ہے کہ قانون طلاق میں مزید ترمیم ہو گئی تو ازدواجی زندگی اور خاندان کی جڑیں اور بھی کمزور ہو جائیں گی۔" یہ حقیقت پسند حضرات" بار بار چلاتے ہیں کہ ازدواجی زندگی بہت زیادہ پست اور شادی سے پہلے سے زیادہ ناپائیدار ہو گئی ہے اور طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے۔ اس لئے قوانین طلاق پر نظر ثانی کی جائے اور خاندان کی تباہی کا جائزہ لیا جائے۔ اگر ہم سوویت یونین کے قوانین شادی و خاندان مجریہ ۱۹۴۴ء کے بنیادی نکات کو دیکھیں تو حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

اولاً جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ سوویت یونین میں اب رسمی شادی کو قانوناً تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں سوویت یونین نہ صرف قانون بنانے میں بہت سے ملکوں سے آگے ہے۔ بلکہ اس لئے بھی

اسے سب پر فوقیت حاصل ہے کہ وہاں رسمی شادی کیلئے کوئی معاشی اور سماجی وجہ جواز ہی نہیں رہی نتیجتاً سوویت یونین میں اب شادی پہلے کی طرح ایک عام اور سیدھا سادا طریق نکاح نہیں ہے۔ وہاں آج کل شادی کا خواہش مند جوڑا سب سے پہلے رجسٹرار کے سامنے پیش ہوتا ہے اور حلفیہ بیان دیتا ہے کہ ان کی شادی ہر قسم کے قانونی اعتراض سے مبرا ہے، لڑکا اور لڑکی دونوں شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی تندرستی سے باخبر ہیں اس کے بعد وہ اپنی تمام پہلی شادیوں دبشرطیکہ ان میں سے کسی نے کوئی کی ہو، کا ریکارڈ پیش کرتے ہیں۔ اس صورت میں رجسٹرار بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اگر پہلی شادی سے کچھ بچے ہوں تو رجسٹرار کا فرض ہے کہ ان کی پرورش کے انتظام کی تصدیق کرے ورنہ انکار کر دے کہ شادی نہیں ہو سکتی۔ سوویت یونین کے باشندے "حلفیہ بیان" کے سلسلے میں بہت محتاط ہیں وہ کبھی جھوٹی قسم نہیں کھاتے، اس لئے ان کی طرف سے غلط بیانی کا بہت کم امکان ہے۔ رجسٹرار کا فرض ہے کہ وہ درخواست دینے والوں کو شادی کا قانون اور غلط بیانی کی صورت میں سنگین سزا سے متعلق قانون پڑھ کر سنائے۔ یہ تمام شرطیں پوری ہو جائیں، تب کہیں جا کر درخواست دینے والے جوڑے کی شادی ہوتی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے قانون شادی کی ایک شق ہمارے ہاں کی بعض مذہبی قیود سے ملتی ہے۔

اگرچہ وہاں شادی کی درخواست کو سرعام پڑھنے کا رواج نہیں لیکن جس کسی مرد یا عورت کو شادی کے بارے میں کوئی اعتراض ہو اور اسے اس کا علم ہو جائے تو وہ رجسٹرار کے سامنے پیش ہو سکتا ہے اور شادی کو اس وقت تک رکوا سکتا ہے، جب تک اس کی شکایت رفع نہ ہو جائے۔

امریکہ، برطانیہ اور کناڈا کے لئے سوویت قانون طلاق شاید بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہے

کیونکہ ایک "دہریہ" قوم نے سہل طلاق کو ختم کر دیا ہے اور طلاق کے راستے میں بالکل نئی مشکلات حائل کر دی ہیں۔ دنیا میں صرف سوویت یونین ہی ایک ایسا ملک ہے جو طلاق کو روز بروز آسان بنانے کی بجائے مشکل تر بنا رہا ہے۔

سوویت یونین میں ۱۹۴۴ء سے پہلے کم سے کم خیالی اعتبار سے طلاق لینا اتنا سہل تھا کہ بس رجسٹرار کے نام درخواست لکھنا اور برائے نام فیس ادا کر دینا کافی تھا۔ مرد و عورت دونوں میں سے ہر ایک طلاق کی درخواست دے سکتا تھا۔ دوسرے فریق کو محض اطلاع پہنچا دی جاتی تھی کہ تمہارے ساتھی کو طلاق دے دی گئی ہے۔ کئی سال تک یہی قاعدہ رہا۔ لیکن گزشتہ دس سال کے عرصے میں سوویت یونین کے باشندے طلاق کو نہایت بری نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ بچوں کی تربیت اور عورت کے ماہوار خرچ کی ذمہ داری کے متعلق قانون پاس ہوئے تو غیر ذمہ دار قسم کے لوگ "ایک ٹرائی کے ٹکٹ سی سستی" طلاق سے دوسری کا ارادہ کرنے سے پہلے کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ باشندوں کا ثقافتی معیار بلند ہوا اور عورتوں کی حالت پہلے سے سدھر گئی تو طلاق کی شرح بھی رفتہ رفتہ گھٹ گئی۔

نئے قوانین طلاق کے ذریعے پہلے تمام قوانین کو منسوخ کر دیا گیا۔ اب طلاق لینے کے لئے مرد اور عورت دونوں کے لئے عدالت میں درخواست دینا لازمی ہے۔ اس درخواست پر تقریباً دو سو ڈالر خرچ اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی طلاق کی درخواست کا نوٹس اخباروں میں شائع کیا جاتا ہے تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے خبر نہ ہوئی۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ درخواست دینے والا جوڑا عوامی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جہاں ان وجوہات طلاق کا پوری طرح تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جو درخواست میں درج ہوتے ہیں اور ان پر جرح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کے قانون دان یہ جان کر حیران ہوں گے۔ کہ اشتراکی قانون طلاق

میں ایک بھی وجہ مذکور نہیں۔ لہٰذا بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ قانون محض ڈھکوسلا ہے یہ دفتر شاہی آمریت کا قانون ہے۔ جسے سٹالن نے اس لئے نافذ کیا ہے کہ آئندہ کوئی طلاق نہ ہو۔ تاہم اس قانون کی یہ تشریح غلط ثابت ہو چکی ہے۔ نئے قانون کے ماتحت ہزاروں شادیاں منسوخ ہو چکی ہیں یا ابھی زیر غور ہیں۔ لیکن طلاق کی شرح ۱۹۴۴ء کے پہلے زمانے سے بہت ہی کم ہو گئی ہے

سوویت یونین کے نئے قانون میں "طلاق کی کوئی وجہ" کیوں درج نہیں؟ جواب بالکل سیدھا سادا ہے، آخر یہ بات قانون سازوں پر کیوں چھوڑی جائے کہ وہ ہمیشہ کے لئے چند وجوہات گھڑ دیں کہ مرد یا عورت کے لئے ایک ساتھ زندگی گزارنا اس لئے دوبھر ہو جاتا ہے۔ شادی ٹوٹنے کے بے شمار وجوہات ہو سکتے ہیں۔ کوئی جھگڑا ایک شادی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن دوسری پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

مرد و عورت میں نااتفاقی کے تمام تر وجوہات قلمبند کرنے کی کوشش کرنا انتہائی مضحکہ خیز بات نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ معاملہ کوئی اتنا سہل نہیں کہ شمار کر کے بتا دیا جائے کہ ٹریفک رول کی اتنی مرتبہ خلاف ورزی کی گئی۔

سوویت قانون سے تو اس اصول کی تصدیق ہوتی ہے کہ صرف مرد اور عورت ہی جان سکتے ہیں کہ ان کے تعلقات کب اور کیوں قائم نہیں رہ سکتے؟ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ میاں بیوی خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی شادی کا منسوخ ہونا بہتر ہے یا نہیں، عوامی عدالت کا فرض ہے کہ وہ صورت حالات کا بغور جائزہ لے، نئے طریقہ طلاق میں یہ اصول کارفرما ہے کہ شادی محض ذاتی معاملہ نہیں، بلکہ اس سے خاندانی اور سماجی ذمہ داریاں بھی وابستہ ہیں۔ عدالت اسی اصول پر عمل کرتی ہے اور گواہوں کے بیانات کو خاص اہمیت دیتی ہے۔

سوویت یونین میں آج کل اس وقت تک طلاق نہیں مل سکتی۔ جب تک چند ایسے لوگ شہادت

نہ دیدیں جو فریقین کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔ پہلی یہ کہ حتی الوسع طلاق کو روکا جائے۔ اسے مشکل بنایا جائے، میاں بیوی پر ان کی سماجی ذمہ داریاں واضح کی جائیں اور دونوں کو راضی نامہ کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح عدالت پر مقدمے کی نوعیت اور حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور وہ اسی کے مطابق طریق کار اختیار کرتی ہے۔

لہٰذا اس قانون سے حتی الوسع طلاق کو روکنا مقصود ہے۔ طلاق سے پہلے میاں بیوی کے لئے عدالت کو یقین دلانا ضروری ہے کہ سمجھوتہ ناممکن ہے۔ فیصلہ کرتے وقت امثال و شرائط کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ مقدمے کی نوعیت و خصوصیت کو سختی سے پیش نظر رکھ کر اس پر غور کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے علامہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سوویت یونین کے قوانین طلاق ہمارے قوانین کی نقل ہیں۔ غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات سوویت یونین کے قانون طلاق کی اصلیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جس کا بنیادی مقصد فریقین میں سمجھوتے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہے دوسرے لفظوں میں طلاق کے مقدمات کی سماعت کرنیوالی سوویت عدالتیں ان مشاورتی بورڈوں سے ملتی جلتی ہیں۔ جو کبھی اسقاط حمل کے شفاخانوں میں قائم کئے گئے تھے یہ عدالتیں زیادہ تر طلاق کی روک تھام کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ بعض لوگ کہیں گے کہ ہمارے ہاں کے قوانین طلاق کا بھی یہی نشانہ ہیں! — لیکن صرف زبانی۔ عملاً ہمارے ہاں کے قوانین طلاق ایک ایسا مجموعہ شرائط ہیں۔ جنہوں نے طلاق کے حصول کو اس قدر محال اور مہنگا بنا دیا ہے کہ بہت تھوڑے لوگ ان سے مستفیض ہو سکتے ہیں، سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں کوئی ایسا قانون نہیں جس کے رو سے یہ لازمی ہو کہ مرد و عورت ازدواجی مشکلات میں گرفتار رہ جائیں تو طلاق سے پہلے کسی مشیر اور ثالث سے رجوع کریں۔ بعض ماہرین نفسیات، ڈاکٹروں اور پادریوں سے

بیاہ شادی کے لئے مشاورت خانے تو قائم کر رکھے ہیں مگر انہیں کوئی قانونی حمایت حاصل نہیں سوویت یونین کے نئے قوانین طلاق کے رو سے طلاق خواہ جوڑے کے لئے عوامی عدالت میں قطع تعلقات کے اسباب بیان کرنا لازمی ہے۔ اگر سمجھوتے کی کوشش ناکام رہے تو مقدمہ اعلیٰ عدالت کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ جسے صرف اس حالت میں شادی کو منسوخ کرنے کا اختیار ہے جبکہ ٹھوس ثبوت اور شہادتوں سے اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ رشتہ آئندہ کے لئے باہمی محبت کی بنا پر قائم نہیں رہ سکتا۔ بالآخر طلاق مل ہی جائے تو ایک سو سے لے کر چار سو ڈالر کی مالیت کے رقوم عدالت کی فیس کے طور پر ادا کرنا پڑتے ہیں۔

حاصل؟ ابھی تک اعداد و شمار شائع نہیں ہوئے۔ حال ہی میں ایک شماریہ انگریزی اخبار ماسکو کی خبریں، کے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے الیشوع میں چھپا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شادی اور طلاق کے نئے قوانین کے نفاذ سے لے کر اب تک جتنی شادیاں منسوخ ہوئیں۔ ان کی تعداد پہلے سے دو تہائی کم ہے یہ حقیقت کسی تبصرے سے بالا ہے۔ جس دن مذکورہ بالا شماریہ چھپا، اسی دن اطلانٹک شہر کے اخباروں میں پینسلوانیا سٹیٹ کالج کے محکمہ مشاورت شادی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کلفرڈ آر ایڈمنز کا بیان شائع ہوا۔ ڈاکٹر موصوف نے پیش گوئی کی کہ:۔

"۱۹۵۵ء تک امریکہ میں دس شادیوں میں سے چار کا انجام طلاق ہوگا۔ آج سے بیس تیس سال کے عرصے کے بعد ایسی عورتوں کی ایک نسل وجود میں آجائے گی جنہیں شادی کے لئے مرد نہیں ملیں گے۔ کیا یہ عورتیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں گی؟ ان میں اور شوہر دار عورتوں میں مردوں کے لئے زبردست مقابلے کی صورت پیدا ہو جائے گی"۔ ڈاکٹر ایڈمنز نے مزید کہا:۔

"امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ شادیاں اور طلاقیں ہوتی ہیں۔ ہر مہینے تقریباً ایک ہزار شادیاں منسوخ ہوتی ہیں اور یہ تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے

ڈاکٹر موصوف نے پیش گوئی کی :۔

آئندہ دس سالوں میں نابالغوں میں جرائم عام ہوں گے اور اخلاق اس قدر پست ہو جائیگا کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی "

اس کے ایک ہفتہ بعد شکاگو یونیورسٹی میں عمرانیات کے پروفیسر ڈاکٹر ارنسٹ نے بیان دیا۔

آئندہ چند سالوں میں عجلت کی شادی کا رجحان جو جنگ کے زمانے کا ایک خاصہ ہے۔ ملک کے لئے ایک حقیقی مصیبت بن جائے گا۔ معمولی شناسائی، مختصر کورٹ شپ اور اتفاقی ملاقاتوں پر ہی شادیاں ہونے لگیں گی کیونکہ اکثر نوجوان ازدواجی زندگی کی ان لذتوں کی کسر نکالنے کے لئے بے تاب ہونگے۔ جن کے حصول سے وہ لڑائی کے دنوں میں مجبوراً محروم رہے انہوں نے مزید کہا۔

" اکثر مردوں کی عمر شادی کے وقت بہت زیادہ پختہ ہو چکی ہو گی۔ کیونکہ انہیں جنگ کی وجہ سے کئی سال تک مجرد رہنا پڑا۔ اگر ایسے ہی طرز عمل کی تکرار ہوئی جیسا کہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد دیکھنے میں آیا تھا تو یہ مرد کمسن لڑکیوں کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ معمر عورتیں شادی کی منڈی میں اپنی ناقدری دیکھ کر مردوں کے فوری حصول کے لئے بلا سوچے سمجھے ہاتھ پاؤں ماریں گی، نتیجہ طلاق کی شرح میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہو گا "

چونکہ امریکہ میں جنگ سے پہلے طلاق کی اوسط ۱۶ فیصد سے قدرے زیادہ ہی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر موصوف نے اندازہ لگایا کہ مستقبل قریب میں یہ شرح ۲۵ فیصد ہو جائے گی۔ لیکن وہ ڈاکٹر ایڈمنز کے مقابلے میں قدامت پسند نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے پیش گوئی کی ہے کہ طلاق کی شرح اوسط ۴۰ فیصد ہو گی۔

شکاگو کے ماہر عمرانیات، یعنی ڈاکٹر ارنسٹ نے ذرا تفصیل میں جا کر بیان کیا۔

"میدان جنگ سے واپس آکر شادی کرنے والے پانچ سپاہیوں میں سے ایک سپاہی تو بالفرور عدالت طلاق کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ اگر انہیں تجربہ کار مشیر نہ ملے اور وہ غیر معمولی طور پر سخت جان ثابت نہ ہوئے تو باقی چار بھی زود یا بدیر یہی راستہ اختیار کریں گے۔

"مزید ۳۰ فی صد سپاہی پریشانیوں سے بھرپور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ دس میں سے صرف ایک سپاہی توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ شادی کرکے اطمینان کی زندگی گزارے گا۔"

اور یہ سوچا ہی نہیں جاتا کہ ایسی شادیوں سے جو بچے پیدا ہوں گے ان کا کیا کیا جائیگا۔ ہمیں سوویت یونین کو "ایک بداخلاق، مادہ پرست" قوم کا طعنہ دیتے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ اس دوران میں ہمارے ہاں ازدواجی زندگی جس قدر تباہ ہوئی ہے اور جس قدر اخلاق گرے ہیں۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن اس بھیانک صورت حال کے تدارک کے لئے کوئی منظم کوشش نہیں ہو رہی۔

ایک طرف تو ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ عیسائی تہذیب کی بنیاد ہی خاندان یا کنبے کے تقدس پر ہے اور دوسری طرف خاموشی سے بداخلاقی اور طلاق کے بے پناہ طوفانوں کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ادھر سوشلسٹ ریاست کا یہ حال ہے کہ وہ خاندان کو نئی اور بلند تر سطح پر لے جانے کی جدوجہد میں متواتر کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔

کتنے نکتہ چین ایسے ہیں جنہوں نے سوویت یونین کے نئے قوانین تحفظ مادر کا مقابلہ دوسرے ملکوں کے قوانین سے کیا ہے؟ یقیناً ایسے ناقدوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے۔ بعض نے یہ کہہ دینا ہی کافی سمجھا ہے کہ یہ قوانین ماں کو اس کا اصل مقام واپس دلاتے ہیں ہم بتا چکے ہیں کہ کس طرح سوویت یونین میں ایک طویل عرصے تک ماؤں کے حفاظتی مرکز

کھولے گئے اور وہاں عورتوں کی حالت سدھارنے کے لئے کس طرح انتھک کوششیں کی گئیں۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ بھی نہیں ہو رہا۔

ماؤں کے تحفظ کے قانون پاس کرنے سے پہلے سوویت یونین نے ان کے لئے ہمہ گیر سرکاری امداد کا بندوبست کیا۔ چنانچہ معصوم بچوں کے لباس اور خوراک کی سالانہ امداد کی مالیت پندرہ کروڑ ڈالر تھی۔ یہ کوئی زکاۃ نہ تھی، بلکہ اسے اسی طرح قبول کیا جاتا تھا۔ جیسے ہم اپنے پبلک سکولوں کی خدمات قبول کرتے ہیں۔

ماؤں کے تحفظ وظائف کی صورت میں بھی امداد دی جاتی تھی۔ ساڑھیں بچے کی پیدائش پر یہ وظیفہ چار سو ڈالر سالانہ کے قریب ہو جاتا تھا اور اس کے بعد ہر بچے کی پیدائش پر اس کی شرح ایک ہزار ڈالر سالانہ ہو جاتی تھی۔ اس منصوبے کے تحت لاکھوں خاندانوں کو وظیفے ملتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بڑے کنبے عام کنبوں سے مادی استفادے کے اعتبار سے خسارے میں نہ رہیں۔

نئے قوانین مزدار نقاہ کا پتہ دیتے ہیں لیکن ان میں بھی مسلمہ اشتراکی اصولوں سے سرمو انحراف نہیں کیا گیا۔ ان میں ماں کی افضلیت کا اعتراف تین عطیوں کی صورت میں کیا گیا ہے۔ یہ عطیے تمغوں کی شکل میں دیئے جائینگے۔ پہلے کا نام میٹرنٹی میڈل، دوسرے کا آرڈر آف مدرز گلوری اور تیسرے کا نام ہیروئن مدر ہے۔ پہلا تمغہ دریا نے کنبے کے لئے ہے۔ دوسرا اس سے بڑے کنبے کے لئے اور تیسرا سب سے بڑے کنبے کے لئے ہے

اعلان کیا گیا ہے کہ آئندہ تمام ماؤں کے وظیفے بڑھا دیئے جائیں گے۔ باقاعدہ مالی امداد اور مفت طبی امداد کے علاوہ ہر حاملہ عورت کو تیسرے بچے کی پیدائش پر اسی ڈالر وظیفہ ملا کرے گا۔ چوتھے بچے کی پیدائش پر ڈھائی سو ڈالر نقد اور سولہ ڈالر ماہوار اور پانچویں بچے

کی پیدائش پر تین سو چالیس ڈالر نقد اور چوبیس ڈالر ماہوار، غرضیکہ گیارہویں بچے کی پیدائش پر اس کی ماں کو ایک ہزار ڈالر نقد اور ساٹھ ڈالر ماہوار وظیفہ ملا کرے گا۔

صرف سنجیدہ اخلاقی نادیدہ نگاہ کے سبب بلکہ جنگ سے پیدا شدہ حل طلب مسائل کے پیش نظر بھی سوویت یونین کی بن بیاہی لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد دی جاتی ہے انہیں ہر ماہ سرکاری وظائف کی صورت میں خود بخود امداد پہنچنے لگتی ہے اور یہ وظیفے ۱۲ سال تک جاری رہتے ہیں اور فی بچہ ۲۰ سے ۴۰ ڈالر کی مالیت کے ہوتے ہیں۔ نرسریاں اور رہائشی سکول عام ہیں۔ جہاں ماں اپنے بچے کو جتنا عرصہ چاہے چھوڑ سکتی ہے، بچہ اسی کا رہتا ہے، اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔

تمام حاملہ عورتوں کو کام سے ۱۱ ہفتے کی تنخواہ رخصت ملتی ہے۔ پانچ ہفتے بچے کی پیدائش سے پہلے خانہ نشین ہونے کے لئے اور چھ ہفتے بچے کی پیدائش کے بعد تک۔ جنگ کے دوران میں انہیں دگنا راشن ملتا رہا۔ علاوہ ازیں تمام سوویت یونین میں وسیع پیمانے پر نئی نرسریاں اور کنڈرگارٹن کھولے جائیں گے۔

بداخلاقی کے انسداد کی جدوجہد اور انسانی فطرت کی اصلاح کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں سوویت یونین کی بے مثال کامیابیاں یہ ہیں:۔

(۱) سوویت یونین میں پہلے اسقاط حمل کو قانوناً جائز قرار دیا گیا اور اس کے بعد سائنسی انتظامات کے ذریعے اس علت کو یکسر ختم کر دیا۔

(۲) جب معاشی، سماجی اور اخلاقی ارتقاء نے اسقاط حمل کی حرکت کو ناقابل معافی بنا دیا تو اسے فرد اور سماج کے خلاف ایک جرم قرار دے دیا گیا۔

(۳) پہلے محض درخواست پر طلاق کی اجازت دے دی گئی، اس کے بعد بیس برس کے عرصے میں طلاق کے واقعات تقریباً ناپید ہو گئے۔

(۴) اب مصالحتی عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں۔ تاکہ طلاق کی مصیبت سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ملے۔

(۵) جنسی بیماریوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔

(۶) عصمت فروشی کو سماجی اتفاقات کی سطح تک پہنچا دیا گیا ہے۔

(۷) ماں کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں انہیں دور کر دیا گیا۔

(۸) مردوں اور عورتوں میں عملاً حقیقی مساوات قائم ہو چکی ہے۔

(۹) سوویت یونین انسانی محبت اور شادی کو ایک ایسی وحدت میں منتقل کرنا چاہتا ہے جو اخلاقیات کے نئے شریفانہ شعور پر مبنی ہو گی اور دنیاوی و روحانی جبر سے آزاد ہو گی

عرصہ ہوا کہ کارل مارکس کے زندگی بھر کے ساتھی، سوشلسٹ فلسفی فریڈرک اینگلس نے پیش گوئی کی تھی۔

" رفتہ رفتہ ایک نئی انسانی نسل معرض وجود میں آئے گی، یہ ایسے مردوں پر مشتمل ہو گی جنہیں زندگی بھر میں پتہ نہیں چلا ہو گا کہ روپے یا کسی دوسری سماجی طاقت کے ذریعے سے کسی عورت کی سپردگی خریدنے کے کیا معنی ہیں اور یہ نسل ایسی عورتوں پر مشتمل ہو گی جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ جانا ہو گا کہ محبت کے علاوہ کسی دوسرے خیال سے اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کرنے کے کیا معنی ہیں۔"

اور یہ پیش گوئی آج سچ ثابت ہو گئی ہے۔

---

# شراب کی ممانعت سنگینوں کے بل پر

اب تک ہماری بحث صرف ایسے مسائل تک محدود رہی ہے۔ جن کا تعلق جنسی بے رہروی سے براہ راست تھا۔ لیکن بداخلاقی کے اور بھی مظہر ہیں اور ہم نے ابتداء میں "سماج کے لئے مضر بدکرداریوں" کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود اکثر قاریوں کو ہماری خطرناک فروگذاشت کا احساس ہو گیا ہو گا۔ جس کی طرف ہم نے کہیں کہیں اشارہ کرنے پر کفایت کی ہے۔ ہماری وہ فروگذاشت نشہ بازی، بدکاری کا وہ محرک شراب ہے۔

نشہ بازی ایک سماجی مسئلہ ہے، شراب نوشی، بداخلاقی کا ایک جزو اور نشہ بازی کی عادت کی ایک صورت ہے۔ جسے کوئی گناہ تصور کرے یا نہ کرے اس کا نتیجہ سماج کے لئے ہمیشہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتا ہے۔ شراب کے حق میں .... یا اس کے خلاف ازل سے بحث چلی آتی ہے اور ہمارا ارادہ اس بحث میں نئی یا پرانی دلیلوں کا اعادہ کرنا نہیں ہے کیونکہ سوویت یونین میں دونوں قسم کی دلیلوں کا جواب سائنسی اور عملی طریقے سے دیا جا چکا ہے اور انہیں سچ ثابت کیا

جا چکا ہے۔ یا جھٹلایا جا چکا ہے۔ اور اب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہاں شراب کے مسئلے کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ اسے عصمت فروشی اور بدمعاشی کے ساتھ ہی حل کیا جا چکا ہے

لیکن پھر بھی کوئی صاحب سوال اٹھا سکتے ہیں کہ آیا شراب نوشی واقعی کوئی مسئلہ ہے۔ سوویت یونین میں بیس سال پہلے اور ہمارے ملکوں میں آج تک شراب نوشی ایک ایسا محرک تھا۔ اور ہے، جس کے ذریعے بدمعاشی اور جنسی بیماری پھیلتی ہے۔ ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہر ایماندار پادری، پولیس افسر، ڈاکٹر، محکمہ صحت عامہ کا افسر اور رضا کار کرے گا۔

گناہ کا سوال اٹھایا بھی نہ جائے، تو بھی یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ کہ اکثر مرد عورتیں اور نوجوان شراب کے نفسانی محرکات سے اثر پذیر ہوتے ہیں، جن سے ترغیب بدکاری کی قدرتی مزاحمت کا جذبہ بے حد کمزور پڑ جاتا ہے۔

وضاحت کے لئے یہ مثال دی جا سکتی ہے۔ کہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے کوئی سپاہی یا جہازی شاید ہی کسی طوائف کے پاس جانا پسند کرے گا۔ نابالغوں کے جرائم سے متعلق عدالتی کاغذات اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ بہت کم نوجوان نابالغ لڑکیاں پہلے شراب پیئے بغیر جنسی بدفعلی کی مرتکب ہوئی ہیں۔ فوجی ڈاکٹروں کا تلخ تجربہ ہے کہ متعدد بار شراب پینے کے بعد اکثر سپاہی اپنی قوت فیصلہ اور فرائض سے اس درجہ غافل اور عاری ہو جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف بُری سے بُری عورت کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ بلکہ جنسی بیماری سے بچاؤ کی دوا کو استعمال کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔

فعلیات (علم وظائف الاعضاء) اور نفسیات کے ماہر متفق ہیں۔ کہ شراب سے تمام قوت مزاحمت ہوا ہو جاتی ہے۔

تاہم شریفانہ طریقے پر بھی بہت زیادہ شراب پی جاتی ہے۔ اخلاقی اور سماجی اعتبار سے یہ بھی کوئی کم اہم مسئلہ نہیں۔ ہارورڈ میڈیکل سکول کے پروفیسر اور مساچوسٹس جنرل ہسپتال کے ماہر اعلیٰ امراضِ نفسیہ، ڈاکٹر سٹینلے کوب نے شراب نوشی کے اس پہلو پر بڑی صفائی سے روشنی ڈالی ہے۔ جس کا جنس اور جرائم سے کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر کوب کا قول ہے کہ اس برِعظیم میں ساٹھ لاکھ افراد ذہنی بیماریوں میں اس حد تک مبتلا ہیں کہ وہ ایک طرح "جنون کے لگ بھگ پہنچے ہوئے ہیں۔ ان میں پندرہ لاکھ ایسے ہیں۔ کہ وہ نہ شراب سے ہی نباہ کر سکتے ہیں اور نہ اس کے بغیر رہ سکتے ہیں"۔ دوسرے لفظوں میں آج کل ہمارے ہاں تقریباً پندرہ لاکھ افراد پکے شرابی ہیں۔

درست ہے۔ کہ ان میں سے ابھی تک جنسی اعتبار سے ناکارہ نہیں ہوئے۔ اور آتشک سے مبرا ہیں تاہم وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو ختم کر رہے ہیں۔ اپنے گھروں اور عزیزوں کا سکون و مسرت تباہ کر رہے ہیں۔ اور سماج پر برا اثر ڈال رہے ہیں۔ معاشرتی نقطہ نظر سے ہم ان کی عادت شراب خوری کو بلاخلاقی سے تعبیر کریں گے۔

سوویت یونین میں جو صورت حال ہے۔ اس کے متعلق ہمارے ہاں بے حد دلچسپی ظاہر کی گئی ہے۔

سوویت یونین میں شراب کے مسئلے کے بارے میں ہمارا علم صرف سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔ وہاں کے حالات کے بارے میں خبریں اکثر متضاد ہوتی ہیں۔ آج ہم یہ پڑھتے ہیں۔ کہ سرخ فوج کا ایک مشہور کمان افسر پکا صوفی ہے۔ وہ مطلقاً شراب نہیں پیتا۔ اس خبر کو تحریک امتناع کے علمبردار اور رضاکار خاص دلچسپی اور انہماک سے

پڑھتے ہیں۔ لینن دوسرے ہی دن یہ پڑھ کر: "چونک جاتے ہیں کہ اس سے بھی دو بڑے اور مشہور جرنیلوں نے اتحادیوں کی کامیابی کی خوشی میں شراب پی۔ اور یہ کہ دود کا (آتش ناک روسی برانڈی) اور شراب ویت یونین کی سرکاری دعوتوں کے موقعوں پر پیش کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ حضرات فرض کر لیتے ہیں۔ کہ وہاں شراب نوشی آداب معاشرت کا ایک ایسا مظہر ہے۔ جسے سوویت حکومت نے فرد کے ضمیر پر چھوڑ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے ہاں کے ماہرین نے، جو شراب نوشی کے مسئلے کے مطالعے میں بُری طرح کھوئے ہوئے ہیں۔ آج تک یہ دریافت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ کہ سوویت یونین میں شراب کے ساتھ آخر کیا بیتی۔

صورت حال یوں ہے۔ کہ اشتراکی سائنس دانوں نے بدکاری، عصمت فروشی اور جنسی بیماری کی انسدادی جدوجہد کے دوران میں محسوس کیا کہ جنسی مسائل اس وقت تک پوری طرح حل نہیں ہو سکتے۔ جب تک ان کے ساتھ ہی شراب کے مسئلے کو حل نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا وہ اسی طریقے پر میدانِ عمل میں کُود پڑے جو جنسی بداخلاقی کے خلاف ان کی کامیاب جدوجہد کا خاصہ تھا۔ سوویت یونین میں شراب کے انسداد کی جدوجہد سماجی تجربات کی تاریخ کا ایک دل چسپ باب ہے۔

اس جدوجہد کا آغاز تو ماضی بعید میں ہو چکا تھا۔ ہزارہا سال سے روس جانے والے سیاح گواہی دیتے آئے تھے۔ کہ سلطنت زار میں شراب نوشی کی بدعت عام ہے۔

ہمہ گیر شراب نوشی اور ہمہ گیر جرائم ——— زنا، عصمت دری، آتشزدگی، قتل منظم قتلِ عام، یہ جرائم شاہی محل سے لے کر کسان کے غلیظ جھونپڑے تک زار شاہی روس کے ہر طبقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

روس کے مشہور ناول نگار ترجنیف رقمطراز ہیں۔

"عام طور سے ایک شہری خود فراموشی تک کفایت کرتا ہے۔ لیکن ایک پادری کسی مقدس موقعہ پر خوب پیٹ بھر کر پیتا ہے۔"

روس کے کٹر مذہبی لوگ سال بھر میں بے شمار تہوار مناتے تھے۔ اور عیسائی اوتاروں کی یاد میں بے حد و حساب پیتے تھے۔ حتیٰ کہ کثرت شراب خوری مذہبی تہواروں کی ایک مستقل خصوصیت بن گئی تھی۔ لیکن انقلاب کے بعد صرف پندرہ سال کے عرصے میں یہ صورت حال یکسر بدل گئی اور امریکہ کے مشہور ڈاکٹر کنگس بری اور نیو شولم یہ اطلاع دینے کے قابل ہو گئے کہ ہم نے ایک تہوار کے دن بحیرہ سور سے دریائے والگا کے نشیب کی طرف دور تک سفر کیا۔ لیکن ہم نے بہت کم شراب نوشی ہوتے دیکھی، اور کسی فرد کو شراب کے نشے میں بے ہوش نہ پایا، حالانکہ خود جہاز میں اور ہر بندرگاہ پر بے روک ٹوک شراب بک رہی تھی۔

اب ہم اس ظاہری تضاد کی اصلیت بیان کریں گے۔ ہمارے ملکوں میں اصل حقائق کو ابھی تک خفیہ رکھا گیا ہے۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ کہ امتناعی قوانین سے بے نیاز رہتے ہوئے سائنسی اصولوں سے کام لے کر شراب نوشی کی لعنت کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ہمارے ملکوں میں امتناع کی تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ بھول کر بھی سوویت یونین کا حوالہ نہیں دیتے۔ شاید وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ کہ روس نے سو سال سے زیادہ عرصے تک شراب نوشی کے خلاف ہر ممکن طریقے سے وسیع پیمانے پر جد و جہد کی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک واحد عملی حل تلاش کر لیا گیا۔ اور اسے آزمایا گیا۔ یہ

آخری طریقہ پہلے تمام طریقوں سے اس لئے افضل ہے۔ کہ یہ کامیاب ہوا۔

روس میں شراب نوشی پر قابو پانے کی منظم کوششیں ۱۸۱۹ء سے شروع ہوئیں اس وقت تک روس میں ہر جگہ شراب فروشی ہوتی تھی۔ اور جس کا جی چاہتا تھا، یہ بیوپار شروع کر لیتا تھا۔ ان دنوں امریکہ اور انگلستان میں جو تجاویز پیش ہو رہی تھیں زار کی حکومت نے سب سے پہلے ان پر عمل کیا اور شراب کی بکری پر سرکاری اجارہ داری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ نظام اجارہ داری آٹھ سال تک قائم رہا اور حکومت کے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوا، لیکن شراب نوشی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ اس کی رفتار وہی رہی۔ علاوہ ازیں اس سسٹم کا نفاذ بہت دقت طلب تھا۔ اور رشوت ستانی کے سبب جلد ہی بدنام ہو گیا۔ آخر کار ۱۸۲۲ء میں زار روس نے شراب کی تقسیم کا انتظام پرائیویٹ کارپوریشنوں و بڑی کمپنیوں کے حوالے کر دیا۔ اور ساتھ ہی شراب کی بکری پر ٹیکس لگا دیا۔ اس طرح ایک ایسے نظام کی بنیاد پڑی جو اپنی ابتدائی شکل میں ٹیکس کی بھرمار کے باوجود شراب کی روز افزوں بکری کے موجودہ نظام سے مشابہ تھا۔ اور یہی طریقہ ابھی تک بہت سے ملکوں میں رائج ہے۔ مقصود یہ تھا کہ شراب کو اوسط درجے کے شہری کے لئے مہنگی اور ریاست کے لئے منفعت بخش بنا دیا جائے۔

زار شاہی روس میں شراب پر سرکاری کنٹرول حکومت کے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوا۔ ایسے لوگوں کی جیبوں سے بے شمار روپیہ کھینچا جو ورد کا کی مقدار میں کمی کرنے کی بجائے ضروریات زندگی کو قربان کرنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ لیکن ٹیکس کے بتدریج اضافے پر بھی شراب کی کھپت کم نہ ہوئی۔

کوئی تیس سال تک شراب نوشی ترقی پر اور سلطنت زار زوال پر رہی جب حالت بہت خراب ہو گئی۔ تو پادریوں نے وعظ و تلقین اور توبہ کا پرچار شروع کیا۔ سیاسی اصلاحات

کی جو تحریک انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی وہ ۱۸۵۹ء میں اپنے عروج پر پہنچی۔ تو کلیسائے زار کو شراب کی کشید کے تمام کارخانے بند کرنے پر راضی کر لیا۔ لیکن زار کی رعیت بھی آخر اسی طرح کے انسان تھے، جیسے دوسرے ملکوں کے لوگ۔ ان پر انسداد عمل ہوا۔ اور جو لوگ محض بیر (جو کی شراب جو ہلکی ہوتی ہے) پر کفایت کرتے آئے تھے۔ شراب کو ترک کرنے کے بجائے ووڈکا (تیز برانڈی) پینے لگے۔

تین سال بعد سرکاری کنٹرول کا نیا طریقہ رائج ہوا جس سے ہم سب اچھی طرح آگاہ ہیں یعنی لائسنس کا طریقہ جاری کر دیا گیا۔ اور شراب کی پرچون کی دوکانیں گھٹا دی گئیں زار نے یہ اقدام تحریک امتناع کے لیڈروں کو خوش کرنے کے لئے اٹھایا تھا۔

اس کے بعد تقریباً تیس سال کے عرصے میں زار کی حکومت شراب کی کشید کے سرکاری اور لائسنس یافتہ کارخانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن اس اثنا میں ووڈکا کی بکری پہلے سے بھی بڑھ گئی۔

۱۸۸۴ء میں ڈاکٹر پیٹر سیمونووچ الیگزیف امریکہ آئے۔ یہ انسان دوست ڈاکٹر مشہور مصنف اور فلسفی کونٹ طالسطائی کا گہرا دوست تھا۔ امریکہ میں ان دنوں جو امتناعی سرگرمیاں جاری تھیں، اسے ان سے روشناس کرایا گیا۔ اور وہ یہ جذبہ لے کر اپنے وطن واپس گیا کہ وہ روس کے عوام کو رضا کارانہ طور پر شراب چھوڑنے کی تلقین کرے گا۔ اس نے مشہور امتناع پسند جماعت انٹی سیلون لیگ کے انداز میں کئی کتابیں لکھیں۔ اس کی کوششوں کا صرف ایک نتیجہ نکلا کہ زار نے ایک قانون کے ذریعے اس قدیم رواج کو جرم قرار دے دیا جس کے مطابق کارخانہ دار اپنے مزدوروں کو تنخواہ کا ایک حصہ نقدی میں اور دوسرا حصہ ووڈکا کی صورت میں ادا کیا کرتے تھے۔

اس طرح روس کے صنعتی مرکز امریکہ کے قدیم کانوں کے مرکزوں کی طرح مغربیائے گئے۔ یعنی کارخانہ داروں نے اپنے کارخانوں کے قریب ہی شراب کی دوکانیں کھول لیں اور مزدور لوگ اپنی تنخواہ وصول کرتے ہی ان کی نذر کرنے لگے۔ لیکن بے روک آزاد شراب نوشی کے منفی اثرات صنعتوں سے منافع کی تخفیف کا موجب ثابت ہونے لگے اس وقت تک روس کے دیسی اور غیر ملکی سرمایہ داروں نے مل کر زار کی وسیع اور زرخیز سلطنت اور لاکھوں مزدوروں کو خوب لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے پیداوار کے جدید اصول رائج کئے مشینی صنعت کے فروغ کے ساتھ مزدوروں کے ہنر اور محنت کی لوٹ کھسوٹ بڑھی۔ ایک مزارع تو شراب کے نشے میں دھت ہوتے ہوئے بھی اپنے قدامت پرست جاگیردار کے کھیتوں میں اس کے حسب منشا کام جاری رکھ سکتا تھا۔ لیکن شراب کی عادت اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیاں کارخانہ داری کے نئے نظام کے لئے وبال بن گئیں۔ لہٰذا انیسویں صدی کے اختتام پر روس میں امتناع شراب کی طاقتور اور شدید تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک کا سرغنہ کلیسا تھا۔ نہ حکومت بلکہ اس کے پیچھے نئے صنعتی سرمایہ دار تھے۔

ان جدید سرمایہ داروں کو ڈاکٹر نکولائی گریگوریف جیسا قابل لیڈر مل گیا۔ اس نے ۱۸۹۴ء میں "مقاصد امتناع" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس کی مہم پوری طرح منظم تھی اس نے شراب کی تجارت میں حکومت کی کثرتِ شرکت کو بداخلاقی سے تعبیر کیا۔ اور بتدریج بڑھتے ہوئے ٹیکسوں کی سخت مخالفت کی۔ ڈاکٹر گریگوریف نے شراب پر "سرکاری کنٹرول" کا پردہ تار تار کر دیا۔ اس کی پروپیگنڈہ مہم کو نئے صنعتی سرمایہ داروں کی بے پناہ مالی امداد حاصل تھی۔

لیکن یہ مہم بری طرح ناکام رہی۔ اور حکومت کے ٹیکسوں کی سنگین دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ جب تک زار تخت شاہی پر براجمان رہا۔ اس کی آمدنی میں شراب کے ٹیکسوں کی بدولت بالکل اسی طرح اضافہ ہوتا رہا۔ جس طرح آج کل امریکہ کے ریاستی بجٹ یا مستعمرہ کناڈا کی آمدنی میں آئے

سال اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جہاں سرکاری کنٹرول اور ٹیکسوں کی بھرمار کی بدولت شراب کی کھپت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تاہم جو طوفان شراب کے خلاف اٹھا تھا۔ اسے دبایا نہ جا سکا۔ ۱۸۹۸ء میں زار کے اپنے حلقوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور زار کا ایک طاقتور چچازاد بھائی شہزادہ اسکندر اس قضیئے میں حکومت کا زبردست مخالف بن گیا۔ اس نے امیروں وزیروں کو اپنا حامی بنانا شروع کیا اس کے مقاصد کافی حقیقت پسندانہ تھے۔ وہ ایک امیر جاگیردار تھا۔ جس نے یہ دریافت کر لیا تھا کہ صوفی

مزدور کسان صوفی کسان بھی زیادہ مفید اور نفع بخش محنت کش ہے۔ دوسرے ملکوں میں جو اقتناعی مہمیں جاری تھیں، ان کے مطالعے کے بعد اس نے اپنا سارا زور روس میں اقتناعی تعلیم پھیلانے پر صرف کر دیا۔

سب سے پہلے اس نے تمام شراب دشمن گروہوں کو ایک جماعت یعنی انجمن اقتناع میں متحد کیا۔ اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے سرمائے سے انجمن کا خزانہ بھر دیا۔ جس میں نہ صرف ہزاروں بلکہ لاکھوں روبل اس وقت جمع ہو گئے جبکہ روبل کی قدر نصف ڈالر کے برابر تھی۔ اس کے بعد اس نے ہر طرف روپے کا چھٹا دے دیا۔

اس مہم کا سرچشمہ ماسکو میں ایکس محل اقتناع تھا۔ اس ہیڈ کوارٹر میں تربیت یافتہ کارکنوں کا ایک بہت بڑا عملہ تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلے اقتناعی تعلیم کے سائنسی مرکزوں کا منصوبہ بنایا اور تعلیمی مہم کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسری عمارت میں ہزاروں کتابوں پر مشتمل ایک کتب خانہ کھولا۔ کیمیائی اور وظائف اعضاء کے معائنے کی تجربہ گاہیں کھولیں۔ جن کا عملہ بہترین ماہرین فن پر مشتمل تھا۔ انہوں نے تنخواہ دار محقق، اہل قلم مقرر اور استاد رکھے۔ یہ تھا ہمارے ہاں کے جدید تحقیقاتی مرکزوں کا باوا۔ اس کی مثال ییل یونیورسٹی میں تجزیہ شراب کا سکول ہے جو حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ جس کا عملہ مشہور ڈاکٹروں

ماہرین نفسیات ونفسیات ماہرین عمرانیات، قانون دانوں اور پادریوں پر مشتمل ہے۔ جو برسہا برس سے انہماک سے یہ تحقیق کرنے میں مصروف ہیں کہ شراب انسانی دماغ، جسم اور سماجی تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا یہ پروفیسر صاحبان کسی شرابی باپ کے لڑکے سے تمام ضروری باتیں دریافت نہیں کر سکتے۔

شہزادہ اسکندر کی انجمن امتناع کے حقائق اور قیاسات دونوں قسم کے مواد کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا۔ اور اس نے وہ کچھ کر دکھایا جس کے متعلق بیل کا سکول ابھی تک منصوبہ ہی نہیں بنا سکا۔ یعنی اس نے یہ تمام چیزیں نہایت دل کش انداز میں لاکھوں عوام تک پہنچا دیں

شہزادے نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری رکھیں۔ اس نے اس مقصد کے لئے پارک، باغات، ہر عمر کے افراد کی تفریح گاہیں، عظیم الشان ریستوران۔ تماشا گاہیں۔ تھیٹر غرضیکہ ہر موقع اور مقام کو استعمال کیا۔ ان میں سے اکثر ادارے مفت چلائے گئے اور جب تک وہ چالو رہے نہایت مقبول عام رہے۔ حالانکہ وہ شراب کا قطرہ تک مہیا نہ کیا تھا۔ وہاں باقاعدہ وقفوں کے بعد شوقین اور کچھ سننے کے لئے بے قرار مجمع کو ہوشیار مقرر خطاب کرتے اور شراب نوشی کی اصلیت سے انہیں باخبر کرتے۔ ۱۹۰۳ء اس مہم کے عروج کا سال تھا۔ اس پر صرف ماسکو شہر میں پچیس لاکھ ڈالر صرف ہوئے۔ شہزادے کی انجمن امتناع روس کے طول وعرض میں تین سو ستر امتناعی تھیٹر چلاتی تھی۔ اب خرچ کا اندازہ لگا لیجئے۔ نتیجہ؟ وہی ڈھاک کے تین پات۔

امتناعی سرگرمیوں کی مخالفت ۱۹۰۵ء میں نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ اس سال جبکہ سیاسی دباؤ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ روس کا ایک مشہور ومعروف اور جابر رئیس، ڈیوک اعظم سرگش جو ماسکو کا گورنر جنرل اللہ زار وقت کا چچا تھا۔ انجمن امتناع میں شریک ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ شاہی

خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اس تحریک میں لایا۔ ان میں زار وقت کا ایک دوسرا چچا ڈیوک اعظم کونس ٹینین بھی تھا۔ اس نے ایک نام نہاد تنظیم، کل روس عیسائی مزدور یونین قائم کی اور اس کی صدارت خود سنبھالی۔ وہ شراب کی مکمل بندش کا حامی تھا۔ اس پروگرام سے زیادہ بااثر اور عمدہ پروگرام ذہن میں نہیں آسکتا۔

لیکن اس تحریک کا اور اس کے ساتھ ہی محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی لوٹ کھسوٹ کا عوامی ردعمل اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا، جبکہ کسی نے ڈیوک اعظم سرگس کی گود میں ایک اعلیٰ ساخت کا بم اٹھا پھینکا۔ تشدد کے اس توقع کے ساتھ ہی ڈیوک اور اس کی مہم تاریخ کے ہیپٹی ڈیمپٹی کرداروں (بچوں کی پوری کے کردار جن میں انڈے کا نام ہیپٹی ہے) کی گود میں جا سوئی۔ اور اس طرح دبی کہ دوبارہ ابھر نہ سکی۔ تمام واعظ اور وعظ اور شراب نوشی کے متعلق حقائق اور اعداد و شمار اس طرح منتشر ہوئے کہ ان کو پھر کبھی جمع نہ کیا جا سکا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل غور بات یہ ہے کہ کس طرح شراب کی اجارہ داری اس انتظامی مہم کی مکمل ناکامی کا باعث ہوئی۔ جب حکومت نے ۱۸۹۴ء میں شراب کی فروخت خود سنبھالی تھی تو پادریوں نے شراب کی نئی سرکاری دکانوں کی کامیابی کے لئے دعا کی تھی۔ اور سرکردہ امراء، وزراء اور صنعتی سرمایہ داروں نے یوم افتتاح پر شراب پی لانی کرنے کے ٹھیکے، شراب کی پرچون پر سرکاری اجارہ داری جو کناڈا کے رائج الوقت نظام سے مشابہ ہے۔ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قانونی طور پر جائز ووڈکا کی کھپت کروڑ چالیس لاکھ گیلن سالانہ سے پچیس کروڑ گیلن سالانہ ہو گئی۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۳ء کے درمیان شراب کی بکری سے حکومت کو پانچ ارب روبل منافع ہوا۔ بادی النظر میں یہ رقم معمولی ہے۔ لیکن اس کا حکومت کی کل آمدنی سے مقابلہ کیا

جائے تو اصلیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس اثنا میں حکومت کی کل آمدنی بیس ارب تھی۔ یعنی اکیلی شراب سے حاصل ہونے والا منافع کل آمدنی کا ایک چوتھائی تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر بھی زار کی حکومت کو اپنی کل آمدنی کا چوتھا حصہ صرف شراب کی بکری کے منافع سے حاصل ہوتا تھا۔ اس صورت حال کا موازنہ کناڈا سے کیا جا سکتا ہے جس کے بعض صوبے کئی سال سے اپنے بجٹوں کو زیادہ تر مختلف قسم کی شراب کی بکری سے حاصل شدہ منافعوں کے بل پر متوازن بنا رہے ہیں۔

روس میں اتنا سستی تعلیم کی وسیع مہم اور شراب پر سرکاری کنٹرول کے وقت سے لے کر ۱۹۱۴ء تک ووڈکا کی کھپت پہلے سے پانچ گنا سے بھی زیادہ ہو گئی۔ شراب نوشی کے طفیل معاشی مشکلات اور دباؤ میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ اور شراب پینے والوں کی جیبوں سے ٹیکس میں جانے والی رقم دن بدن بڑھتی گئی۔

لیکن شراب کے خلاف جدوجہد جاری رہی۔ اس اثنا میں ایک نئی تنظیم یعنی سکولوں میں امتناع شراب کی جدوجہد کرنے والی انجمن کی بنیاد پڑی۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جس شدت سے روس شراب نوشی کی مصیبت میں مبتلا تھا۔ اس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہ ملتی تھی۔ اس سوسائٹی نے سلطنت کے طول و عرض کا دورہ کیا اور اصل صورت حال کے متعلق اعداد و شمار جمع کئے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ ایسے حقائق شائع کرنے میں کامیاب ہو گئی جن کی اجازت زار شاہی کے محکمہ احتساب (سنسر) نے دی مثال کے طور پر اسی فی صدی سے زیادہ نوجوان روسی طلبہ اور ساٹھ فی صد سے زیادہ روسی لڑکیاں ووڈکا کی عادی تھیں۔ ایک تعلیمی ضلع میں طلبہ کی کل تعداد پانچ ہزار سات سو تھی۔ سوسائٹی کے کارکن اس ضلع میں حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے گئے اور ڈھائی ہزار ایسے طلبہ سے ہمکلام ہوئے

جو شراب کے نشے میں دھت تھے یا جنہوں نے اعتدال سے پی رکھی تھی۔ کارخانہ داروں کے دباؤ پر ماسکو کی بلدیہ نے تحقیقات کی اور معلوم ہوا کہ ماسکو کے بالغ باشندوں میں نوّے فیصد نہایت تیز شراب پینے کے عادی تھے۔

نوبت رفتہ رفتہ ہی یہاں تک پہنچی تھی۔ شاہی مشیر نکولس ڈی کریمر کو امتناعی مہم کا کھوکھلا پن پہلے ہی نظر آگیا تھا اس نے ۱۹۰۶ء میں زار کے سامنے جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں کہہ دیا تھا کہ یہ خیال غلط ہے کہ لوگ تفریحی سرگرمیوں کی بدولت شراب پینا چھوڑ دیں گے۔ یا تھیٹروں اور پارکوں میں ڈرامے اور تقریریں کرنے سے شراب نوشی کا انسداد ممکن ہے۔ لیکن خود ڈیمی کریمر کی تجاویز بے معنی اور ناکارہ سی تھیں اس کے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی کہ انجمن امتناع کے وسیع پراپیگنڈائی ادب کو ہمارے ملک کی طرح صرف وہی لوگ پڑھتے اور اثر لیتے تھے جو خود شراب نہیں پیتے اور پکے پرہیزگار تھے شراب نوش حضرات ایسے ادب کو ہاتھ نہ لگاتے تھے اور وہ شہزادہ اسکندر کی تفریح گاہوں میں مفت جی بہلاتے تھے اسطرح جو روپیہ بچاتے اس سے ووڈکا خرید کر پیتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں نوبت یہاں تک پہنچگئی کہ امتناعی مہم کی خیر و برکت سے شراب کی کھپت اور بڑھ گئی اور اس مہم کی جتنی کمیٹیاں تھیں ان میں سے فی کمیٹی نوکے حساب سے سرکاری ٹھیکے چل نکلے تاہم ناکامی اور مایوسی کے باوجود امتناعی تنظیمیں اس بدعت کے خاتمے پر غور کرنے کے لئے ایک کل روس اجتماع بلانے میں کامیاب ہوگئیں اس اجتماع میں ٹریڈ یونینوں نے بھی شرکت کی اور انہوں نے شراب نوشی سے پیدا ہونے والے سماجی اور معاشی مسائل اٹھائے۔ انہوں نے ڈوما زار روس کی پارلیمنٹ میں دباؤ ڈالا کہ سرکاری ٹھیکوں کے اوقات فروخت کو قانوناً محدود کیا جائے لیکن اس کانگرس کے انعقاد سے جو نتیجہ نکلا وہ صرف یہ تھا کہ پارلیمان میں ایک بل پیش ہوا جس میں ووڈکا میں نشے کی نسبت پچاس سے سینتیس فیصد کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ لیکن یہ بل بھی قانون نہ بن سکا۔

اس کے چار سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں زار شاہی ریاست کے لئے شراب کا مسئلہ ہنگامی صورت اختیار کر گیا۔ شاہی حکومت نے انگلستان اور فرانس کے ساتھ فوجی اتحاد کی پالیسی مرتب کی تھی۔ لہٰذا لاکھوں سپاہیوں کو جدید ترین اسلحہ جنگ سے لیس کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا اور زار روس کو صنعتی سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کئے بغیر نہ بن پڑی۔

لیکن شراب کے سلسلہ میں سرمایہ دار اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے انکا مطالبہ تھا کہ حکومت شراب پر ٹیکس کم کر کے کسی اور ذریعے سے بجٹ کو متوازن بنائے اور ودکا کی کھپت کو حتی الوسع گھٹائے لہٰذا ۱۹۱۴ء میں زار نے اعلان کیا کہ شراب پر مزید ٹیکس نہیں لگائے جائیں گے اور ان مقدار میں اضافہ بھی نہ کیا جائے گا اسی سال مشرقی محاذ پر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مورچوں میں شراب نوشی جاری رہنے سے کوئی نقصان نہ تھا۔ لیکن کارخانوں اور دیہات میں اسکا بہت برا نتیجہ نکلا کیونکہ پیداوار خاطر خواہ نہ ہو سکی اس لئے سرمایہ داروں نے زار روس کو الٹی میٹم دیدیا۔

آخر کار شراب کی خرابی کا آخری لمحہ آپہنچا۔ زار نے ڈرامائی اور جابرانہ انداز سے تمام روس میں شراب کی جبری اور مکمل بندش کا اعلان کر دیا شہنشاہ معظم نے فرمایا کہ یکم جولائی ۱۹۱۶ء کی صبح سے ودکا یا بیر کی کشید اور فروخت کو مابدولت کی ذات اقدس کے خلاف سنگین جرم تصور کیا جائے گا لیکن شراب کی فروخت کے معاملے کو ہر علاقے کے مقامی حکمران کی مرضی اور فیصلے پر چھوڑ دیا گیا۔

اس فرمان کا اجراء اس قدر خلاف توقع تھا اور اس پر اس قدر شدت اور تکمیل سے عملدرآمد ہوا کہ ساری قوم سکتے میں آگئی پہلے سے کوئی پراپیگنڈا اور کوئی رسم افتتاح ادا نہ کی گئی تھی۔ لہٰذا عوام اس سخت اقدام کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے سے قاصر رہے وہ دم بخود تماشائی بنے رہے ادھر دہشت آفرین خفیہ پولیس کی رہنمائی میں مسلح

سپاہیوں کے دستے ایک ٹھیکے سے دوسرے ٹھیکے پر چھاپہ مارتے۔ شراب کے تمام ذخیرے کو بدرروؤں میں بہا دیتے اور دکان پر تالا چڑھا دیتے جہاں تک کشید گاہوں کا تعلق ہے وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ بڑے سے بڑے رئیس یا وزیر کی جرأت نہ تھی کہ شاہی فرمان کی مخالفت کرے۔ مسلح سپاہیوں کے دستوں نے شراب کی ہر بھٹی اور ہر کشید گاہ پر حملہ کیا۔ تمام دودکا اور بیرکو دریاؤں میں بہا دیا اور اسکے بعد آلات کشید کو اسطرح تباہ کر دیا کہ دوبارہ مرمت کے قابل نہ رہے چند ہفتوں کے اندر زار شاہی میں شراب کی پیداوار پوری طرح بند ہو گئی۔

تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ شراب کا قطعی امتناع اس طریق پر عمل کیا گیا۔ عوام پر اس کارروائی کا جو ردعمل ہوا ہوگا وہ کبھی سامنے نہ آسکا شراب نوشی کے مخالف اور شرابی دونوں زار کے اس ہنگامی جبری اور مکمل اقدام پر دم بخود تھے، سولہ کروڑ باشندے خاموش، حیران اور مبہوت رہے زار روس نے قلم کے ایک ہی جھٹکے سے اپنے مقبوضات میں شراب اور شراب خوری کا صفایا کر دیا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر امریکہ میں اٹھارھویں ترمیم کے لئے زبردست تحریک پیدا ہوئی روس کی بدرروؤں میں لاکھوں، کروڑوں گیلن "شیطانی رم" یعنی شراب کے بہاؤ کے تصور پر بعض مبصرین خوشی سے دیوانے ہو گئے انہیں پراپیگنڈے کے لئے زبردست مواد مل گیا زار روس نے کوئی امتناعی قانون پاس نہ کیا تھا۔ اس نے چٹکی بجاتے میں شراب کی جڑ مار دی تھی اس کی تمام رعایا ڈر کے مارے چپ رہی۔ ۱۹۱۶ء کے نصف آخر اور ۱۹۱۷ء کے ابتدائی مہینوں میں روس کے باشندوں کو شراب کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ لاکھوں نابالغ لڑکے جو روزانہ چالیس فیصد الکحل آمیز شراب کے پیمانے پر پیمانے خالی کرنیکے عادی تھے وہ نالی کے راستے دودکا کے غائب ہو جانے پر کافی صحت مند نظر آنے لگے۔ گویا یہ امتناع قدرے کامیاب رہے۔

اور یہ امتناع دراصل کل نو مہینے تک کامیاب رہا۔

جو عادت عارضی طور پر دب گئی تھی۔ وہ نو مہینے کے بعد اچانک لاوے کی طرح پھر اچانک پھوٹ پڑی روس کے لاکھوں انسانوں میں ناقابل برداشت پیاس بھڑک اٹھی ادھر میدانِ جنگ میں روسی فوجوں کے ٹکڑے اڑ رہے تھے ادھر روس پر بھوک اور بیماری کے بادل چھا گئے۔ تمام سلطنت میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص فرار کا متمنی نظر آنے لگا۔ پراگندہ خیالات متحدہ طور سے بوتل پر جا ٹھہرے۔

اور انہوں نے بوتل کو پیدا کر لیا۔ جس سرعت سے زار نے بندش کا فرمان جاری کیا تھا اسی سرعت سے روس دوبارہ دود کا میں ڈوب گیا۔ شراب خانہ ساز یعنی دیسی شراب اور اس کی ناجائز فروخت کا دور آیا۔ کسانوں نے غلے کی جگہ آلو بوئے، میلے کچیلے، ہر صاف ناصاف طریقے سے ان کا خمیر اٹھایا اور شراب قطرہ بہ قطرہ ٹپکنے لگی۔ جو علاقے جرمن حملہ آوروں کی زد میں پڑتے تھے وہاں کے کسانوں نے غلے کے ذخیروں کو شراب میں تبدیل کر دیا اور بڑی آسانی سے روپیہ اکٹھا کر لائے۔ اس دیسی شراب کو تیار ہوتے دیر لگتی تھی۔ لیکن شہریوں اور سپاہیوں میں آنکھ جھپکتے میں کھپ جاتی تھی۔ جو کچھ امریکہ میں شراب خانہ سازی کے دور میں ہوا تھا۔ وہ روس والوں کی اونی سرگرمیوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ زار کی سلطنت چند مہینوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناجائز شراب میں تیر رہی تھی۔

یہ شراب کافی حد تک زہرناک تھی اور اکثر مہلک ثابت ہوتی تھی۔ لاکھوں روسیوں نے اپنے تلخ تجربے سے یہ سبق سیکھا کہ خالص شراب چند آدمیوں کے لئے مضر تھی مگر شراب خانہ ساز جو طبی نگرانی سے بے نیاز تھی۔ زود یا بدیر مضبوط سے مضبوط جسم کو بھی کھوکھلا کر دیگی اس قسم کی شراب میں زہریلا مادہ اس کے نشیلے جزو کی بجائے ان خارجی کیمیائی اجزا کی ملاوٹ سے پیدا ہوتا ہے جو غلیظ ترکیبات اور خمیر اٹھانے اور کشید کرنے کے ناصاف طریقوں کا خاصہ ہے۔

اس مکمل امتناع کا ایک اور خاص نتیجہ نکلا چونکہ دودھ کا کھلے بازار میں فروخت نہ کی جاسکتی تھی اس لئے چار کی دکانیں اور بدمعاشی کے اڈے خلاف قانون کلال خانوں میں بدل گئے شراب کی خفیہ فروخت کے پس پردہ ہر قسم کی بدکاری پھلنے پھولنے لگی۔ حالانکہ شراب کی ناجائز فروخت، خرید یا استعمال کے لئے سنگین اور خوفناک سزائیں مقرر تھیں لیکن سنگدل سے سنگدل پولیس افسر بھی ان سزاؤں کو بروئے کار لانے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

یوں شراب کے مکمل امتناع کی یہ انوکھی سکیم جو سنگینوں کے بل پر نافذ ہوئی اپنے المناک انجام کو پہنچی۔

روس کے ایک پروٹسٹنٹ پادری، تقدس مآب پودخونوف جو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے کل روس یونین کے صدر تھے ایک مرتبہ امریکہ آئے تو انہوں نے مذکورہ بالا صورت حال کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

قانون امتناع شراب کے نفاذ سے پہلے اگر ہر درمیانے گھرانے میں ایک شخص شرابی تھا تو بندش کے زمانے میں ہر گھر بہ یک وقت کشید گاہ اور شراب خانہ بن گیا۔ ہر کہیں عورتوں اور مرد کھلے بندوں قانون کو توڑ کر دودھ کا تیار کرتے تھے، لوگ پی کر سوتے تھے۔ ناشتے پر پیتے تھے۔ نشے کی حالت میں کام پر جاتے تھے۔ بیہوشی کے عالم میں کلیسا جاتے تھے اور مائیں اپنے بچوں کو کھانے کے ساتھ شراب بھی دیتی تھیں۔

# دنیا بھر میں سستی شراب

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کے دیہات میں شراب کی کھپت خاص طور سے بڑھ گئی قوم کی صحت پر عام شراب نوشی کے مضر اثرات تو پہلے سے نمایاں تھے، لیکن اب گھر کی بنی ہوئی زہریلی شراب کی خطرناک مصیبت بھی وارد ہوگئی اور بے شمار کسان گھرانوں نے سارے کے سارے غلے کو دودکا کی بھٹی کی نذر کرنا شروع کر دیا تو قحط اور بھی شدت اختیار کر گیا۔

ان حالات میں سوویت حکومت صرف ایک اقدام کر سکتی تھی اور وہ یہ کہ آلوؤں سے شراب بنانے کی قانونی اجازت واپس دیتی، چنانچہ عارضی طور پر قانون امتناع کو منسوخ کر دیا گیا اور بڑی بڑی کشید گاہوں کو پھر سے تعمیر کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ یہ اقدام بالکل ہنگامی تھا جسے صحت عامہ کی بہتری کے لیے بروئے کار لانا پڑا تاکہ زہرناک دیسی شراب منڈی سے غائب ہو جائے اور غلے کا قحط کم ہو۔

لینن، اسٹالین اور دوسرے اشتراکی رہنماؤں نے ان تمام قانونی اقدامات کا بذات خود جائزہ لیا جو ان حالات میں ممکن العمل تھے، خوش قسمتی سے سوویت حکومت کو انجمن امتناع کے

فائلوں میں شراب نوری کے متعلق بے شمار حقائق، تحقیقات اور جائزے پہلے سے تیار مل گئے۔ ان فائلوں کو فوراً سائنس دانوں اور ماہرین سیاست کی ان کمیٹیوں کے حوالے کر دیا گیا جو وزارت صحت عامہ کا ہاتھ بٹا رہی تھیں اور ان سے تعمیری تجویز کی فوری اپیل کی گئی۔

شراب نوشی کے انسداد سے متعلق بے شمار متضاد خیالات اور آرا میں سے صرف ۵ بڑے نظریے چنے گئے، چونکہ ہمارے ہاں ان میں سے ہر ایک کے بے شمار حامی ملتے ہیں اس لئے ان کا مختصر سا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) امتناع :-

زار روس نے یہ طریقہ اتنی خوبی سے آزمایا تھا کہ سوویت حکومت اس کی ہمسری نہ کر سکتی تھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ طریقہ اس تجربے سے بھی زیادہ بری طرح ناکام رہا تھا جو ان دنوں امریکہ میں کیا جا رہا تھا، شراب کی قانونی ممانعت کا طریقہ بالکل بیکار ہے۔ اس کے علاوہ اسے اشتراکی اخلاق سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ اشتراکی اخلاق جبر کے بجائے ترغیب کے حامی تھے۔

(۲) تعلیم :-

اس سلسلے میں سوویت حکومت نے شہزادہ اسکندر کی تعلیمی مہم کا مطالعہ کیا۔ جس کا کوئی امید افزا نتیجہ نہ نکلا تھا۔ ایسی تعلیم شرابی کے لئے ہوے سے کم نہ تھی۔ کیونکہ اس میں شرابی سے ذاتی قربانی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ شرابی کو یہ کہہ دینا کہ اس کی صحت اچھی ہو جائیگی اور اسے ذاتی سکون ملے گا، بالکل الٹی منطق تھی، کیونکہ لوگ ذاتی تسکین ہی کے لئے تو پیتے ہیں۔ سبب خواہ کچھ بھی ہو، تاریخ ثابت کر چکی تھی کہ محض تعلیم کے ذریعے قوم سے نشہ بازی چھڑائی نہیں جا سکتی۔

(۳) مذہب :-

آج ہمارے سامنے پوشیدہ شرابیوں کی اصلاح کی تنظیم کی صورت میں مذہبی تجربہ موجود ہے

مسئلہ شراب کو حل کرنے کی یہ کوشش بھی امید افزا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریقہ بعض نفسانی بیماریوں میں مفید ثابت ہوتا ہے لیکن سوویت حکومت اس کی حمایت نہ کر سکی۔ کیونکہ تمام کلیسا ان دیہاتی پادریوں کی طرح بدنام تھا جو بری طرح شراب کے عادی تھے۔

(۴) نفسیات:۔

نفسیاتی طریق علاج کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ساری دنیا میں بھی اتنے ماہرین امراض نفس موجود نہ تھے کہ اکیلے ماسکو کے شرابیوں کے لئے کافی ہوتے۔ عملی نقطہ نظر سے نفسیاتی طریق اور مذہب میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ اس کا دائرہ عمل چند لوگوں تک محدود ہے۔ لیکن یہاں سوال قوم کا تھا۔ اگرچہ اس کے موکل دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے تمام قوم کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس کا اطلاق لاکھوں افراد پر کس طرح کیا جائے۔ علاوہ ازیں اکثر اس کے ماہرین کی عقل سلیم یہ نہ مانتی تھی کہ روس کے لاکھوں باشندے ذہنی امراض میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ شراب نوشی کا سبب جسمانی اور ذہنی خلل کے علاوہ کچھ اور ہے۔

(۵) سرکاری کنٹرول:۔

اس سلسلے میں بھی حکومت کے پاس پہلے سے بے شمار تجربے موجود تھے جنہیں وسیع پیمانے پر آزمایا گیا تھا۔ ان کے مطالعے سے یہی پتہ چلا کہ روس کے مختلف شہنشاہوں نے شراب کی فروخت پر کنٹرول کے جو متعدد طریقے استعمال کئے تھے، ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ شراب اور زیادہ کثرت سے پی جانے لگی۔ حتیٰ کہ اس کی کھپت فی کس ۲½ گیلن سالانہ جا پہنچی لہٰذا سوویت ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ سرکاری کنٹرول کا طریقہ بھی ناکارہ ہے۔ اس سے شراب نوشی کی کثرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے کہ یہ نتیجہ کناڈا میں کس طرح سچ ثابت ہوا۔ شراب پر

کئی سال تک کامیاب اور شاندار صوبائی کنٹرول کے باوجود آج مستعمرہ کناڈا میں شراب کی کھپت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ جنگ کے زمانے کی سخت راشن بندی سے پہلے کناڈا دی قوم کو کثرت سے پینے والوں کی قوم نہ مانا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں کناڈا والوں نے ایک کروڑ دو لاکھ گیلن شراب پی جس میں تیز شراب کے علاوہ بیر اور انگور کی شراب بھی شامل ہے۔ گویا وہاں شراب کی کھپت اس قدر بڑھ جائے گی کہ نارشاہی روس کی مثال زندہ ہو جائے گی۔

خیر: کورہ بالا تجربے کے بعد سوویت حکومت نے جو بنیادی نتیجہ اخذ کیا۔ اس کے جا اظہار کے لئے شاید عیسائی عورتوں کی انجمن امتناع کی بانی اور دائم مرگ اس کی صدر، فرانسس دلارد کے مشہور مگر ایک عرصے سے بدنام مقولے سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے وہ الفاظ یہ ہیں اکثر لوگ اس لئے مفلوک الحال نہیں کہ وہ پیتے ہیں، بلکہ اس لئے پیتے ہیں کہ وہ مفلوک الحال ہیں یہ ہے شراب کی اصل حقیقت۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ مذکورہ انجمن کی اراکین نے نیک نیتی اور خلوص کے باوجود اس زبردست اور اہم حقیقت کو سالہا سال سے بھلا رکھا ہے۔ فرانسس دلارد نے نفسیاتی، مذہبی، تعلیمی اور سرکاری کنٹرول کے پھیلائے ہوئے انتشار کو کوڑے کرکٹ کی طرح اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور وہ مسئلہ شراب کی تہ تک جا پہنچی، یہ مسئلہ صرف معاشی اور معاشی ہے۔ لوگ اس لئے پیتے ہیں کہ وہ مایوس اور پریشان ہیں۔ ان کی زندگی بربادی، محرومی اور بے اطمینانی کی زندگی ہے۔ جب تک اکثریت کے لئے ایک ایسا سازگار ماحول پیدا نہ کر دیا جائے کہ اس میں شراب ایک ضرورت نہ رہے اس وقت وعظ، تلقین، تعلیم اور جبری امتناع سبھی بے کار ہیں اور ٹھیک اسی طرح بیکار ہیں۔ جس طرح جنسی اخلاق کا سدھار اس وقت تک ناممکن ہے جب تک معاشی طاقتیں مرد و عورت ہر دو کو عصمت کی خرید اور فروخت پر مجبور کرتے ہیں۔

زار روس کی رعایا شراب کی طرف اس لئے مائل ہوئی کہ ان کا افلاس ایک ناقابل تردید حقیقت تھی۔ لہٰذا سوویت یونین کے ماہرین کو ایک ہمہ گیر قومی فلاح و بہبود کے پروگرام ہی میں نجات کی صورت نظر آئی۔ یہ تھا پہلا بنیادی نتیجہ۔

دوسرا بنیادی نتیجہ جو اشتراکی ماہرین نے اخذ کیا، یہ ہے کہ کوئی فرد اگر ماحول سے متاثر ہو کر پیتا ہے تو قوم کو ترغیب دلانے والی چیز وہ بے شمار سرکاری آمدنی ہے جو شراب کی فروخت پر ٹیکسوں کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔

لہٰذا عملی اقدامات؟

طلاق اور اسقاطِ حمل کے انسدادی اقدام کی طرح سوویت حکومت نے شراب نوشی کے تدارک کے لئے جو پہلا قدم اٹھایا، وہ بھی الٹا نظر آیا ۱۹۲۶ء میں سوویت حکومت نے ایک سنسنی خیز اعلان کیا۔

سوویت حکومت نے شراب کی ناجائز فروخت سے منافع کمانے والے لوگوں کا کاروبار ختم کرنے کے ساتھ ہی شراب پر سے تمام قسم کے ٹیکس ہٹا دینے کا فیصلہ کیا اور یہ کام بڑی برق رفتاری سے ہوا۔ زار کی طرح مسلح سپاہیوں کی مدد سے نہیں، بلکہ نہایت عام اور سادہ طریقے سے یعنی شراب پر سے تمام ٹیکس اڑا کر اور ووڈکا کی پرچون کی قیمتوں کو فی کوارٹ (چوتھائی گیلن) پینسٹھ سنٹ (ایک ڈالر میں سو سنٹ ہوتے ہیں) تک گرا کر۔

ظاہر ہے۔ شراب نوش حضرات حیرت و مسرت سے بھونچکا رہ گئے۔ اس فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی روس کے اخباروں میں زار کی تجارت شراب کے متعلق پورے اعداد و شمار شائع کئے گئے اور بتایا گیا کہ لوگوں نے سابقہ حکومت کو شراب کے ٹیکسوں کی صورت میں بے شمار روپیہ ادا کیا، اشتراکی منتظمین کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس افشائے راز کا نتیجہ کیا ہوگا

اس سے شرابی اور صوفی دونوں بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی نئی حکومت دودکا پر ٹیکس لگا کر منافع کمانا نہیں چاہتی اور یہ چون سے جو تھوڑا بہت منافع حاصل ہوگا۔ اسے انسداد شراب نوشی پر خرچ کرنے کے لئے صحت عامہ اور تعلیم کے محکموں کے سپرد کر دیا جائیگا۔

عوام کی حیرت اور دلچسپی کی کوئی حد نہ تھی۔ شراب کی قیمت میں انتہائی کمی کے اعلان کا دن روس میں غیر سرکاری تہوار یا میلے کا دن تھا۔

حکومت نے جو نئی قسم کی مصفےٰ اعلیٰ اور سستی دودکا میا کی وہ منوں منہ فروخت ہوئی اور ناجائز طور پر شراب تیار اور فروخت کرنے والے لوگ اسی دن سے دیوالئے ہو گئے۔

ادھر مے نوش برادری میں مسرت کی پہلی لہر دھیمی ہوئی، ادھر سوویت حکومت نے نئے قوانین کا اعلان کر دیا۔ ان کی رو سے آئندہ تمام کارخانوں کے قریب مزدوروں اور سرکاری ملازموں کی تنخواہ کے دنوں اور تہواروں کے موقعوں پر شراب بیچنے کی ممانعت کر دی گئی اور پولیس کو کمسن شرابیوں اور ایسے لوگوں کو سخت سزائیں دینے کا اختیار دے دیا گیا جو نشے میں بے ہوش پائے جائیں۔

اس کے بعد روس کے طول و عرض میں ایک نئی قسم کی پروپیگنڈائی مہم چلائی گئی۔ یہ مہم سائنٹیفک تھی۔ اصولاً یہ انسداد شراب انجمن کی مہم سے قدرے مختلف تھی۔ کیونکہ اب شراب کے خلاف پروپیگنڈا کرتے وقت شرابی کی ذات پر شراب کے برے اثرات کا ذکر تک نہ کیا جاتا تھا۔ جہاں تک شراب کے "علمی حقائق" کا تعلق ہے انہیں نظر انداز بھی نہ کیا جاتا تھا اور ان کو بڑھا چڑھا کر بھی نہیں بتایا جاتا تھا۔

سوویت یونین کے ماہرین فعلیات (علم وظائف اعضاء) نے بتایا کہ شراب ایک عام نشہ آور دوا سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سکون آور ہے آور بعض اوقات مفید بھی، کیونکہ

یہ وقتی طور پر عضوی فعالیت کو موقوف کر دیتی ہے اور دماغ اور مرکزی نظام عصبی کو متاثر کرتی ہے، اسے اعتدال سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ تو صرف شرابی کی قوت کارکردگی میں مزاحم ہوتی ہے۔ اس کی مستقل عادت سے خون میں آکسیجن کے امساک کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ شراب اعضا کے حیات آفرین نظام میں خطرناک اختلاف بھی پیدا کر سکتی ہے شراب اور چند دماغی بیماریوں میں خاص تعلق ہے۔ یہ کئی ذہنی امراض کا باعث ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کثرت شراب نوشی اکثر لوگوں کو دائمی تکان، حادثات اور بیماریوں کے خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ قصہ کوتاہ روسی عوام کو شراب کے بارے میں جو فیصلہ سنایا گیا اس میں واضح طور سے بیان کیا گیا کہ شراب ایک ضرورت نہیں، اس کا جسم اور دماغ پر مفید اثر نہیں پڑتا۔ اگرچہ یہ مختلف افراد پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے، لیکن فائدہ کسی کو بھی نہیں پہنچاتی۔

جس طریقے سے یہ حقائق عوام کے ذہن نشین کرائے گئے وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس سلسلے میں سینما اور تھیٹر سے بہت زیادہ کام لیا گیا۔ ڈراموں اور فلموں میں روسی عوام کی روزمرہ کی سرگرمیوں کے ذریعے شراب کے متعلق ایسی چیزیں بتائی گئیں، جن کا براہ راست تعلق روس کو ایک طاقتور، صنعت کار اور زراعت پیشہ قوم بنانے کے منصوبے سے تھا۔ بچوں جوانوں، مردوں اور عورتوں کو چست ڈرامائی انداز میں بتایا گیا کہ شراب نوشی مستقبل کے معماروں یعنی انجنوں کے ڈرائیوروں، ٹرکوں، ٹریکٹروں، فصل کاٹنے کی مشینوں اور کارخانوں کی قیمتی مشینوں کو چلانے والے مردوں اور عورتوں نئے بجلی گھروں کے خاکے اور منصوبے بنانے والے انجینیروں، یونیورسٹی کے طالب علموں اور کوئلہ کھودنے والے کارکنوں پر کس بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

کہانیوں میں شرابی پر نکتہ چینی ہرگز نہ کی جاتی تھی اور یہ نہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے۔ بلکہ دکھایا یہ جاتا تھا کہ یہ شخص کتنا نادان ہے۔ یہ اتنا سادہ ہے کہ اسے ابھی یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ وہ نئے سماج کی تعمیر میں حصہ لینے لگے تو اس کی زندگی کتنی پر لطف اور مسرت بخش ہو جائے کسی سے ہرگز نہ کہا جاتا تھا کہ مت پیو، کہانی میں شرابی کے کردار کو ایک گنہگار فرد کی طرح نہیں پیش کیا جاتا تھا بلکہ اسے ایک مضحکہ خیز، آداب مجلس سے بے خبر شخص کی حیثیت سے دکھایا جاتا تھا۔

ظاہر ہے اس طریقے سے پکے شرابی متاثر نہ ہو سکتے تھے ان کے لیے سودیت منصوبے میں ایک دوسری چیز موجود تھی۔ انھیں خطرناک مجرم تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ وہ ساری قوم کے فلاح و بہبود اور ترقی کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ضرور تھے خاص طور سے جس وقت دودکا پینٹھ سنٹ فی کوارٹ جیسی سستی قیمت پر دستیاب ہو رہی ہو تو ان کے ذہن قومی فلاح و بہبود کے خیالات کو کس طرح قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے؟

ایسے لوگوں کے لئے ترک شراب کے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ ان طریقوں سے ملتے جلتے۔ جن سے عصمت فروشی میں کام لیا گیا تھا۔ جن علاقوں میں شراب خوری ایک نازک مسئلے کی صورت اختیار کر گئی تھی وہاں امتناع شراب کے سائنسی ادارے کھولے گئے۔ دودکا کی امتناعی مہم کے کسی کارکن کو کوئی بے ہوش شرابی ملتا تو وہ اسے قریب کے امتناعی مرکز میں لے جاتا۔ وہاں سب سے پہلے اسے نہلایا جاتا پھر ایک ڈاکٹر اس کا طبی معائنہ کرتا۔ اس کے بعد اسے بستر استراحت پر لٹا دیا جاتا اور اسے ایک دو دن شراب سے محروم رکھا جاتا۔

اس کے بعد اس کا نام، گھر کا پتہ اور دفتر یا کارخانے کا نام لکھ لیا جاتا اور اسے چھٹی دیدی جاتی۔ اس کے دفتر یا کارخانے کے ٹریڈ یونین کو اس کے متعلق پوری رپورٹ بھیجی

جاتی۔ ہر دفتر اور کارخانے میں ایک خاص کمیٹی مقرر تھی وہ رپورٹ ملتے ہی ایک لمبا چوڑا اشتہار تیار کر لیتی۔ اس میں متعلقہ شخص کی تصویر یا کارٹون ہوتا جس کے نیچے اس کا نام لکھا ہوتا۔ علاوہ ازیں اس کی بوتل سے شراب پینے کی کیفیت سے لے کر بعد کی تمام حالت کا نقشہ کھینچا ہوتا تھا۔

یہ سب کچھ اس شخص کے دوبارہ کام پر واپس آنے سے پہلے مکمل ہو جاتا۔ وہ کام پر واپس آتا تو اس اشتہار سے اس کا شایان شان خیر مقدم کیا جاتا۔ لہٰذا وہ دفتر یا کارخانے میں بدنام ہو جاتا اگر وہ شخص دو یا تین بار یہی حرکت کرتا تو اسے لوگوں میں اور بھی زیادہ رسوا کیا جاتا۔

جن لوگوں کو بار بار گھر کر امتناعی مرکزوں میں لے جایا جاتا ان کے خلاف ان کی یونین اور دوسرے عوامی ادارے سخت انضباطی کارروائی کرتے۔

یہ طریقہ شرابیوں میں بے شمار امتناعی کتابچے تقسیم کرنے سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوا۔ شرابی کے لئے دیوالیہ پن، آوارہ گردی، فاقوں اور گھریلو جھگڑوں سے اتنے زیادہ ڈراؤنے نہ تھے لیکن اسے دوستوں میں شرمندہ کرنے اور قوم کی ترقی میں روڑا اٹکانے والے شخص کی حیثیت سے بدنام کرنے کا یہ طریقہ قوم کے لئے اصلاح اخلاق کا ایک کارگر ذریعہ بن گیا۔

چند سالوں میں ہی اس طریقے سے روس میں شراب نوشی تقریباً ختم ہو گئی اور جنون کی حد تک پینے والوں کی تھوڑی سی تعداد باقی رہ گئی۔ یہ لوگ کل شرابیوں کا ایک فیصد تھے ان لوگوں کو باقاعدہ شفاخانوں میں بھیجا گیا۔ یہ خاص شفاخانے پورے سازوسامان سے آراستہ تھے اور ان میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کا علاج کیا جاتا تھا۔ اکثر لوگ تو اتنے قلیل عرصے میں صحت یاب ہو گئے۔ گویا وہ امتناعی مرکزوں کا تفریحی دورہ کرنے گئے تھے۔ جس دن انہیں شفاخانوں سے رہا کیا جاتا، اس سے اگلے دن ان کی صحت یابی کی خبر نمایاں کر کے چھاپی جاتی۔

لیکن سوویت یونین کے امتناعی پروگرام کی بعض شقیں ایسی بھی ہیں جو بادی النظر میں الٹی

معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ابتداء میں حکومت نے ریستورانوں اور ہوٹلوں میں شراب کی کھپت بڑھانے کی بہت زیادہ کوشش کی۔ یہ فیصلے ایسے ماہرین امراض نفسیہ کے مشورے سے کیا گیا تھا، جو شراب نوشی کے محرکات اور مواقع کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

کھانے کے ساتھ شراب کی اجازت کا اقدام بظاہر قدامت پسندانہ اور اصلاحی مقصد کے خلاف تھا۔ لیکن یہ اقدام اس لئے کیا گیا کہ ہوٹلوں میں کھانے کے ساتھ پی لینا، شراب خانوں اور ایسے ہی دیگر مقامات پر جہاں صرف شراب ہی ملتی ہے۔ پینے سے یا نہار منہ اور خالی پیٹ پینے سے کم مضر ہے، علاوہ ازیں شراب پر حکومت کے طویل المیعاد کنٹرول کا تجربہ ثابت کر چکا تھا کہ بغیر کھائے شراب پینا انتہائی افلاس کی علامت ہے۔ اس سے شرابی کی تمام تر توجہ شراب پر مرکوز ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کثرت نوشی اور عادت کی پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے سامنے یہ سوال آ جاتا ہے کہ کھانا کھائیں یا شراب پئیں اور اکثر اوقات نگاہ انتخاب شراب ہی پر پڑتی ہے اور کھانے کو ملتوی کر دیا جاتا ہے۔

ماحول اس سے بھی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ سویڈن قانون سے صرف خوبصورت، خوشنما انتظام اور باسلیقہ فیملی ریستورانوں میں شراب مہیا کی جا سکتی تھی۔ ایسے مقامات پر جا کر پینے والوں کے کردار اور سیرت میں نمایاں اور خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ کم پیتے تھے۔ کیونکہ انہیں کھانا بھی کھانا ہوتا تھا اور عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کی موجودگی میں زیادہ بھی نہ پی سکتے تھے ورنہ ہدف تضحیک بننے کا خطرہ تھا۔

ایسے مقامات پر عارضی طور پر شراب نوشی کی کھلی چھٹی دے کر سویڈن حکومت نے نافہم لوگوں کی توقع کے خلاف نتیجہ اخذ کیا۔ اس سے شراب کی کھپت بڑھنے کی بجائے بیحد گھٹ گئی لیکن ہمارے ہاں کیا صورت حال ہے؟ بلدیہ شکاگو کے نکتہ علاج امراض نفس کے

ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی بی روشان نے امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے جریدہ کے ایشوع بابت مارچ ۱۹۴۵ء میں تحریر کیا کہ "ہماری قوم کے آگے شراب کے مسائل موجودہ شدت اور خطرناک انداز سے کبھی نہ اٹھے تھے"۔ اس نے تسلیم کیا کہ حالت اس قدر نازک ہے کہ قانون امتناع کی طرف دوبارہ رجوع کرنا پڑے گا

ڈاکٹر روشان نے ایک نئی ترکیب ایجاد کی، یعنی اس نے ایک نئی ہستی کے منصہ شہود میں آجانے کا انکشاف کیا اور اس نئی شخصیت کو اس نے "دروازے کی چٹائی" کا شاندار خطاب دیا اس نے کہا کہ سمندر پار سے واپس آنے والے اکثر سپاہی اپنی بیویوں کی صورت میں "ایسی دروازے کی چٹائیوں" سے دوچار ہوں گے، جنہوں نے "شراب نوشی" کی حسین زندگی کا دروازہ کے لئے اپنی آمورش پر پانی کی طرح روپیہ بہایا ہوگا۔

"یہ دروازے کی چٹائی اب شراب خوری کے نقشے کا ایک مستقل جزو ہے یہ شخصیت پہ بازی کی کند تلوار اور گدیلے کی طرح دوہری حیثیت سے شراب خور مرد کے سر پہ مسلط ہے"۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ شراب خور مرد بوڑھی ماں، کنواری بہن یا مجبور بیوی کی صورت میں اپنے آپ کو بے شمار دروازے کی چٹائیوں" میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اور شراب نوش عورت اپنے دوسرے ہم جنس سے خاوند یا پھر تنہائی سے تنگ آکر اپنے "چہیتے عاشق، یا ناکام شادی کے بعد اپنے دل پسند دلبر کی صورت میں متعدد "دروازے کے بوریوں" سے دوچار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر روشان نے شرابی عورتوں اور مردوں کی تعداد کے درمیان نسبت نکالی اور ثابت کیا کہ حال ہی میں یہ نسبت، نسبت معکوس کی شکل میں بدل گئی ہے۔ اس نے یہ انکشاف کر کے تمام ماہرین طب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ ۱۹۳۱ء میں چار یا پانچ مردوں کے مقابلے میں صرف ایک عورت شراب نوش تھی اور ۱۹۴۳ء میں دو مردوں کے مقابلے میں ایک عورت۔

امراض نفس کے اس ماہر نے "خفیہ شرابیوں" کی ایک بہت بڑی تعداد کا انکشاف کیا انہیں شراب کی کھپت میں بے پناہ اضافے کا ایک سبب قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ اب یہ معاملہ عوام سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے جزوی حل کی توقع بھی عوام ہی سے وابستہ کرنی چاہیئے اس نے متنبہ کیا کہ "خفیہ شرابیوں" کی انجمن اصلاح کو چاہیئے کہ وہ اتفاقیہ ارادی کے رجحان کو دبانے کے ساتھ ہی جو کوئے ازم (coue ism) ہی کی ایک قسم ہے، اپنی کوتاہیوں اور کامیابیوں پر کڑی نظر رکھے۔

ڈاکٹر روڈمان کے خیال میں شراب خوری ایک سماجی بیماری ہے اور اکیلے ڈاکٹر اس کا تدارک نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں وہ ییل یونیورسٹی کی تحقیقاتی کونسل کی بہت زیادہ تعریف کرتا ہے لیکن اس تحقیقاتی کونسل نے بھی تو آج تک کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں دکھایا۔ شراب کے معاملے میں امریکی ماہرین کا باہمی اختلاف رائے حیران کن ہے۔ مثال کے طور پر ہارورڈ میڈیکل کالج کے مشہور معالج امراض نفس اور محقق ڈاکٹر ابراہام میرسن نے ۱۹۴۴ء میں امریکہ کی ترقیات سائنس کی انجمن کو بتایا کہ مردوں کے مقابلے میں سات گنا زیادہ عورتیں شراب کی عادی ہیں۔ اس طرح اس نے ڈاکٹر روڈمان کے اندازے کو غلط ثابت کر دیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ابھی تک ایسے اعداد و شمار جمع ہی نہیں کئے گئے۔

ڈاکٹر میرسن کا خیال ہے کہ کثرت شراب نوشی بذات خود کوئی مسئلہ ہی نہیں، دراصل شراب اس وقت ایک حل طلب مسئلہ بنتی ہے جب لوگ محض نشے کی غرض سے پینے لگیں اور جب تک پی نہ لیں، کل نہ پائیں۔ بالخصوص اس وقت جبکہ سے نوش سیری کی حد تک پی کر بھی ایک اور جام کا مطالبہ کرے۔ البتہ ان کے نزدیک حد سے زیادہ پینے کے معنی شراب خوری کی پختہ عادت کی شاہی سڑک پر چل نکلنے کے ہیں۔

یہ ماہر نفسیات چار قسم کے شرابی گنواتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں بھی وہ ڈاکٹر روٹمان کے "دروازے کی چٹخنی یا بوریئے" والے نظریے کی تردید کرتا ہے۔ خیر وہ چار قسم کے شرابی کونسے ہیں؟

(۱) وہ مجہول شخص جو دو جام پیئے بغیر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔

(۲) جو شخص ہنسی مذاق میں جان بوجھ کر بے انتہا پیتا چلا جاتا ہے۔

(۳) دماغی اعتبار سے غیر متوازن شخص جس کی شراب نوشی کی عادت ایک مرض کی علامت ہے

(۴) ایسا شخص جو محض شوق میں شراب کا عادی ہو جاتا ہے وہ زندگی بھر مسرت اور لذت کی خاطر پیتا ہے اور شراب کے سہارے زندہ رہتا ہے۔

یہاں دروازے کی چٹخنی یا بوریئے" والے خاندان کا نام تک نہیں اور نہ کسی ایسے مسئلے کا ذکر ہے، جسے ڈاکٹر روٹمان شراب خوری کا دائمی "مظہر" کہتا ہے۔

نظریوں میں اختلاف تسلیم، لیکن جب دو ماہر ایک دوسرے کے شماریاتی حقائق کو سرے سے جھٹلائیں۔ تو ہم ان کے نظریوں کو علمی تحقیق کے ہم پلہ کیسے سمجھ سکتے ہیں؟

وہ ایک بات پر متفق ہیں۔ ڈاکٹر مایرسن کے قول کے مطابق "یہاں بھی دماغی حفظان صحت کے تمام پروگراموں کی طرح سماج کی بدعنوانیوں، غلیظ اور گھنی آبادی کی سماجی خرابیوں اور بے روزگاری سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مختصراً یہ کہ شراب خوری کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے اور اس پر قابو پانے سے پہلے معاشرے کی نفسانی بیماریوں کے علم پر ایمانداری سے عبور حاصل کرنا ہوگا۔" اور ڈاکٹر روٹمان صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "شرابخوری ایک عوامی مسئلہ ہے"

آج کل علم حقائق کی بجائے ترقی پسندانہ گپ کا رجحان عام ہے اور اصل صورت حال کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اس قسم کی سطحی دلیلوں کا مقصد حقیقت سے گریز کے سوا کچھ

نہیں، جہاں تک مسئلہ شراب کی تحقیق کا تعلق ہے۔ اس برعظیم کے اکثر مقبول عام رسالے شراب نوشی کی نازک صورت حال کو چھپانے کے لئے محققین کے حوالے دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ان رسالوں میں شراب کشید کرنے والوں کے انتہائی خفیہ زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں۔ اسی قدر وہ شراب کے مسئلے کو سطحی انداز سے پیش کرتے ہیں۔

لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ حفظان الکحل کی قومی کمیٹی کے ناظم ڈائرکٹر ڈاکٹر آرادی سلیگر اور میری لینڈ کے ہارلم لوج پینے ٹوریم کی ناظمہ ڈکٹور یہ کرمفورڈ نے اپنے حالیہ بیانات میں حقائق سے گریز کرنے کی کوشش نہیں کی، انہوں نے امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل کے ۶ راکتوبر ۱۹۴۵ء کے ایشوع میں صاف صاف کہہ دیا کہ "امریکہ میں شراب نوشی ایک خطرناک قومی مسئلہ بن گئی ہے"

ان سائنسدانوں کو یقین ہے کہ گزشتہ ۲۵ برس میں کثرت شراب نوشی کا رجحان اس لئے پیدا ہوا ہے کہ ہمارے موجودہ کلچر نے انسانی جذبات پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالا ہے۔ انہوں نے جرائم پر شراب کے اثرات سے متعلق بحث کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ سماجی جرائم کا اقدام ایسے لوگ کرتے ہیں۔ جن کی شخصیتیں کمزور اور نامکمل ہوتی ہیں، جو جذباتی اور متلون المزاج ہوتے ہیں، جو ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے، یا جو ذہنی انتشار اور مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات شراب نوش حضرات بھی سماجی جرائم کے مرتکب پائے گئے ہیں اور ان کی عادت شراب نوشی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول کے مطابق ٹھیک طرح نہیں ڈھال سکتے اور اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔

ان کے خیال میں جرائم کا سبب شراب نہیں چونکہ اعتدال سے زیادہ پی لینے سے قوت فیصلہ اور ضبط نفس عارضی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے نشے کی حالت میں مجرمانہ حرکات

کے سرزد ہونے کا امکان ہے۔

وہ عادی شراب نوشوں کو ایک الگ طبقہ قرار دیتے ہیں اور انہیں مندرجہ ذیل چھ اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) جو لوگ جسمانی کمزوری کے سبب زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے ناقابل ہیں اور شراب نوشی کے علاوہ دوسری بدعادتوں میں مبتلا ہیں ایسے شخص انجام کار اخلاقاً بہت زیادہ پست اور سماج میں رہنے کے ناقابل بن جاتے ہیں انہیں تاعمر دماغی بیماریوں کے ہسپتال میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) وہ لوگ جو جذباتی اور عقلی اعتبار سے ناقص ہیں اور نفسانی انتشار اور ذہنی اختلال میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ شراب پی کر زندگی کی تلخیوں سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) وہ شخص جو زندگی کے ناخوشگوار حالات سے دوچار ہونے سے گھبراتے ہیں اور پیتے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا انہیں پسند نہیں ہوتا یا وہ اسے برداشت کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔

(۴) ایسے افراد جو اپنی ذاتی خامیوں، کسی کمزوری کے شعور، جنسی عدم مطابقت اور اسی قسم کی دوسری کمزوریوں کے احساس کو دبانے کے لئے پیتے ہیں۔

(۵) وہ لوگ جو جسمانی اور روحانی کرب اور تکلیف کو فراموش کرنے کے لئے پیتے ہیں۔

(۶) ایسے افراد جو عادت، وقت اور جسمانی تغیرات کے علاوہ زندگی کے بڑھتے ہوئے رنج و آلام کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے عام مجلسوں میں پیتے پیتے شراب کے متقل عادی ہو جاتے ہیں۔

اس بیان اور ڈاکٹر ہامیرسن کے بیان میں مشابہت واضح ہے۔ لیکن دونوں میں اختلاف بھی شدید ہے۔ جہاں تک شراب کی تحریک دلانے والے اسباب کا تعلق ہے۔ سیگرا در کر نیفورڈ اس شخصیت کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے جسے "ڈاکٹر روتھمان" دروازے کی چٹائی یا بوریا" کہتا ہے" بلکہ وہ مندرجہ ذیل محرکات گنواتے ہیں

"خود فراموشی کے رجحانات یعنی کسی ناخوشگوار اور دشمنی حالت کو برداشت نہ کرنے کی عادت کوئی عملی اقدام کئے بغیر ذاتی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش۔ اعتدال سے زیادہ اکساہٹ اور حیاتی مسرت کی آرزو، فرائض اور ذمہ داریوں سے جی چرانے کی عادت، جس سے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ خود اعتمادی، خود نمائی، راحت اور سکون جیسے لازمی محسوسات جن کو بعض لوگ شراب پی کر دور کرنا چاہتے ہیں"

یہ ماہر اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ مے نوشی ایک توارثی چیز ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں۔ لیکن ماہرین امراض نفس مانتے ہیں کہ بعض افراد کے آباواجداد مسلسل شراب پیتے آئے ہوں۔ تو ان کی قوت مزاحمت کمزور ہو جاتی ہے اور وہ آسانی سے شراب کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔

یہ سب مقولے اور حقائق کافی دلچسپ ہیں۔ لیکن سیگرا در کر نیفورڈ کا بیان اپنے نتائج کے باعث بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ وہ عام ماہرین کی طرح شراب خوری کے معاشرے پر اثرات کا سطحی جائزہ لینے کی بجائے اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ سماجی اعتبار سے شرابی کو مریض تصور کرنا چاہیئے اور تعلیم کے ذریعے اسے نئے سرے سے رہنے سہنے، سوچنے، جوش اور اکساہٹ کے عمل اور ردعمل، مایوسی، انتشار کے متعلق نئی عادتیں پیدا کرنے کے قابل بنانا چاہیئے۔

وہ کسی شرابی عورت یا مرد کے وجود محض کو شرابی مسئلہ نہیں مانتے بلکہ وہ سماجی پیمانے پر عملی اقدام کی اپیل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

"ہمیں چاہیئے، کہ ہم اپنے سماجی ماحول کی تبدیلی یا اصلاح کے پروگرام میں وسیع النظری اقدامات کو شامل کریں تاکہ وہ ذہنی کھینچاؤ اور پریشانی میں اضافے کے بجائے صحت مند برادرانہ زندگی کے ذریعے قدرے سکون اور تحفظ کا موجب ہو۔"

ہوسکتا ہے کہ یہ بیان ترکیب بندی کے اعتبار سے قدرے گریز خواہ ہو۔ لیکن یہ ان لاتعداد بیانات سے زیادہ گراں قدر ہے۔ جو پچھلے دنوں شراب نوشی کے اسباب کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ اس میں شراب نوشی اور سماجی بدکاری کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق رہی بنیادی سوال اٹھایا گیا ہے، جس کا جواب عرصہ ہوا سوویت یونین دے چکا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ نئی زندگی کا بھرپور سماجی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ہی خود سماج میں کس طرح تبدیلی لائی جائے کہ تمام افراد کو خاطر خواہ تحفظ اور سکون نصیب ہو؟

امریکہ میں شراب کی کھپت دن رات تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ محکمہ تجارت نے ۱۹۴۴ء کے بارے میں اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ ان کے مطابق متوسط درجے کے شخص نے اس سال کے دوران میں چون ڈالر شراب پر خرچ کئے۔ منشیات سے قومی آمدنی کے بل کی قدر سات ارب ڈالر تھی۔ جو تمام قومی آمدنی کا پانچ فیصد ہے۔ لیکن محکمہ والوں نے متنبہ کیا کہ قومی آمدنی میں اضافے سے براہ راست شراب کی کھپت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۳ء میں شراب پر ٹیکس بڑھا دیئے گئے تھے اور اس طرح جو شراب بکی، اس کی مالی قدر تینتالیس فی صد زیادہ تھی۔ اور اس فاضل آمدنی کا نصف ٹیکسوں کے ذریعے وصول ہوا۔ غرضیکہ امریکہ میں ایک سال کے عرصے میں شراب کی کھپت

تقریباً بیس فی صد بڑھ گئی۔

جنگ کے سالوں کے متعلق سوویت یونین کے اعداد و شمار ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت زیادہ کم ہوں گے، کیونکہ وہاں فوجی اقدامات کے سبب بہت سی کشید گاہیں تباہ ہو گئی تھیں، لیکن شراب کی پیداوار اور کھپت میں کمی کا یہ ایک اتفاقی سبب ہے۔ اسے ملک یا قوم کا وصف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا مقابلے کے لئے جنگ سے پہلے کے سالوں کے اعداد و شمار موجود ہیں۔

۱۹۳۶ء تک تمام سوویت یونین میں شراب کی کھپت گھٹ کر فی کس تقریباً $\frac{۴}{۵}$ گیلن سالانہ رہ گئی تھی۔ اس کا مقابلہ امتناعی مہم کی ناکامی کے دوسرے سال سے کیجئے جبکہ فی کس $\frac{۲}{۵}$ گیلن کی اوسط تھی۔ گویا اوسط کمی تقریباً پچاس فی صد یا فی کس $\frac{۳}{۵}$ گیلن سالانہ کے قریب ہے۔

شاید آپ اس سے متاثر نہ ہوئے ہوں، سوویت یونین کی آبادی پر غور کیجئے، آج سے دس برس پہلے وہاں اٹھارہ کروڑ نفوس آباد تھے، لہٰذا سوویت یونین کی امتناعی سرگرمیاں اس قدر کامیاب رہیں کہ مہم کے ابتدائی دس سال تمام قوم میں شراب کی کھپت دس کروڑ گیلن سالانہ کے حساب سے اور کم ہو گئی

یہ ایک بے مثال واقعہ ہے۔

لیکن سوویت یونین کی امتناعی مہم کی کامیابی کو عصمت فروشی اور جنسی بیماری کی انسدادی مہم کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ شراب نوشی کا مسئلہ نزاکت کے اعتبار سے جنسی بیماری اور عصمت فروشی سے کم اہم ہے۔ دراصل سوویت یونین کے طبی ماہرین میں آج کل شراب کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا

ہے ۔ سرخ فوجوں کے بعض ڈاکٹر میدان جنگ میں کام کرنے والی نرسوں کو جو ریڈ کراس سوسائٹی کی رکن ہیں دواؤں میں دودھ کا سپلائی کرتے ہیں اور خاص حالات میں ڈاکٹر پی اے پینی کوف جیسی ہستیاں شراب کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتی ہیں ڈاکٹر موصوف کے اس مشہور نسخے میں دواؤنس دودھ کا بھی شامل ہے جو معدے کے زخموں کے لئے ہے۔

آج کل روس میں شراب نوشی کے متعلق کوئی مہم نہیں چل رہی اور خود ہمارے ہاں کے ماہرین محسوس کرتے ہیں کہ حقیقی مسئلہ الکحل بازی کو ختم کرنا ہے نہ کہ شراب نوشی کی ہر صورت کو (کیونکہ بین الاقوامی تقاریب میں رسمی طور پر پینا اور بعض دواؤں میں شراب کا ملانا ناگزیر ہے)

الکحل بازی یا محض نشے کی خاطر عام شراب نوشی سوویت یونین میں ناپید ہو چکی ہے۔ ان کا اتنا عی جہاد کامیاب ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اب بہت کم پیتے ہیں۔ یعنی ایک سال میں دس کروڑ گیلن کم ۔

# بچوں کے تحفظ کی عدالتیں

تو قتل نہیں کرے گا۔ تو چوری نہیں کرے گا۔

یہ حکم ان احکام خداوندی میں سے ایک ہے جو قدیم زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے، جرائم کے انسداد کی جدوجہد ان سے بھی پرانی ہے صدیوں تک اس جدوجہد کا نتیجہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ نکلا۔ جدید زمانے میں سائنس نے ترقی کی اور تمام اسرار قدرت کی باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوا تو اس کے ساتھ ہی جرائم کی تحقیقات بھی شروع ہوئی ۱۹۰۶ء میں بلجیم کے ایک محقق، اے کوئیٹے لٹ نے شماریات جرائم پر تاریخ میں سب سے پہلا تحقیقی مقالہ لکھا اس کا نام "انسان اور اس کی صلاحیتوں کا ارتقا تھا"۔ یہ برسلز سے نکلنے والے ایک جریدہ صحت "ہیگیئے ڈی فزیک سوشیل" میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں انہوں نے لکھا۔

سماج کے شکم میں ہر جرم کا ہیولیٰ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ جس کا ظہور بعد میں ہو کر

رہتا ہے۔ خود سماج ایسے حالات پیدا کرتا ہے، جن میں جرائم پروان چڑھتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جرائم کے لئے سماج ہی زمین تیار کرتا ہے، مجرم تو محض ایک آلہ ہے یہی وجہ ہے، کہ ہر معاشرے کی تنظیم اور جرائم پیشہ لوگوں کا وجود دونوں لازم وملزم رہے ہیں"

اس محقق نے اپنے بیان کو انقلابی کہا اور اعلان کیا۔

"ہوسکتا ہے کہ میرا بیان بادی النظر میں یاس انگیز معلوم ہو لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں امید کی جھلک موجود ہے۔ کیونکہ اس میں اشارۃً کہہ دیا گیا ہے کہ سماج کے اداروں افراد کی عادتوں، تعلیم اور طرز زندگی پر اثر انداز ہونے والی ہر شئے کی تبدیلی سے انسانی فطرت کی اصلاح ہوسکتی ہے"

لیکن یہ محقق اور اس کے پیرو ماہرین علم جرائم ایسی قابل عمل تجاویز پیش کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ جن سے انسان کی فطرت کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔

فرانسس دلار صاحب کے مسئلہ شراب کے متعلق تاریخی تحقیق کی طرح کوئیٹے لٹ کے اس فیصلے کو بھی سن کر نظر انداز کر دیا گیا جس میں سماج کو جرائم کا جنم داتا کہا گیا ہے۔ آج تک علم جرائم اور قانون کے ماہرین کی زیادہ تر توجہ بدکاری کے اسباب کی تلاش کی بجائے سزا کی جستجو پر مرکوز رہی ہے

سائنس تقریباً سو سال سے ثابت کر چکی ہے کہ جرائم کی ذمہ داری فرد کی بجائے سماج پر عائد ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس اثنا میں ہمارے قانون کا رخ الٹی طرف رہا ہے اور فرد کو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ قانون دان حضرات کا ایمان چلا آتا ہے کہ صرف سزا ہی وہ جادو کا ڈنڈا ہے جس سے مجرم کو دوبارہ قانون شکنی نہ کرنے کا سبق سکھایا جاسکتا ہے۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ سزا بالکل بیکار چیز ہے۔ خود ہمارے قانون سازوں نے اس کا عملاً اعتراف کرتے ہوئے اکثر جرائم کی سزاؤں کو کافی نرم کر دیا ہے۔ آج کل ہم اس دور سے بہت

آگے نکل آئے ہیں۔ جب کسی مرد یا عورت کو خرگوش چوری کرنے کی پاداش میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یا غیر اخلاقی افعال پر کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ہم اس نظریئے پر جمے ہوئے ہیں۔ کہ محرکاتِ جرائم بیشک سماجی ہیں، لیکن مجرم کو قرار واقعی سزا دینے سے جرائم کو ختم نہیں تو کم تر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر جرائم کی رفتار دن بدن تیز ہو رہی ہے اور بعض نئی قسم کے جرائم جنم لے رہے ہیں۔

نازیوں نے تو اس نقطۂ نظر کو انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ جرمنی کی وزارتِ عدل و انصاف کے رکن مسٹر فولیفلر نے مبلغی علم جرائم کا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"سزا اس قدر سنگین ہونی چاہیئے کہ کوئی آدمی دوبارہ جیل کا مزا چکھنے کی جرأت نہ کرے۔"

یہ تو اس دور کی طرف مراجعت ہوئی۔ جس میں "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" کا وحشیانہ اصول کارفرما تھا۔ آج کل مہذب لوگ اس سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ لیکن آپ کسی پولیس کورٹ میں چند دن جایئے۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہمارے قانون اب تک سزا اور انتقام کے اصول پر مبنی ہیں۔ ہم نے حضرت یسوع مسیح کی اس ہدایت کو بالکل بھلا دیا ہے ——— "امتحان نہ لو، تاکہ تمہارا بھی امتحان نہ ہو۔"

ہمارے ہاں علم جرائم کے بہت سے "سائنٹیفک" مکاتب خیال ہیں اور وہ کافی حد تک انسان دوست ہیں۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے۔ ہمارے علمائے جرائم بالکل کورے ہیں گذشتہ پچاس برس میں مجرمین کے ذہنی امراض کے علاج کے متعلق کئی مقالے ہمارے سامنے آئے ہیں، بعض حضرات نے قانون شکنی کے سماجی اسباب کو محض زبانی تسلیم کیا ہے۔ ان کا عجوزہ طریق کار سراسر انفرادیت پسندانہ ہے اور وہ تحلیل نفسی یا غدد کرین غدود بے نالی کے بعض غدود جو اپنے سیال کو براہِ راست خون میں داخل کرتے ہیں پر طبی عمل یا جدید ترین اصلاحی

قید خانوں کو واحد حل تصور کرتے ہیں۔ علم جرائم کے طبی ماہرین جرائم پیشہ لوگوں کی صحت کی بحالی پر تو زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کے مرض کے سبب کو نظر انداز کر جاتے ہیں، یہ طریقہ ویسا ہی غیر سائنسی ہے۔ جیسے کسی طوائف کو آتشک سے شفا پانے کے بعد دوبارہ بازار میں بٹھا دیا جائے، زار شاہی حکومت نے جرائم کے انسداد کے لئے ویسا ہی طریق کار اختیار کیا۔ جیسا کہ بدمعاشی اور شراب نوشی کے خلاف جدوجہد میں بیان کیا گیا ہے روسی عدالتیں عام طور سے جرائم پیشہ لوگوں کے لئے سائبیریا کی مشقت گاہیں اور قرون وسطیٰ سی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں قید تنہائی دیتی تھیں اور ایسی ہی دوسری ایذائیں تجویز کرتی تھیں، حالانکہ روس کا ہر جج، وکیل، جیل کا نگران اور پولیس کا سپاہی اس نظریئے کو غلط ثابت کرتا تھا۔ سزاؤں کے ذریعے جرائم کا انسداد ہو سکتا ہے شاہی حکمران جواباً اور بھی سنگین سزائیں دیتے تھے۔

انقلاب سے بیس سال پہلے خطاکار بچوں پر خاص طور سے ظلم ہوتا تھا۔ اس عرصے میں دس سے سترہ سال کی عمر کے گمراہ بچوں کی تعداد پہلے سے دگنی ہو گئی۔ اور زار شاہی روس میں ہر طرف آوارہ مزاج، چور، شرابی، بیمار، اور بدمعاش بچوں کی فوجیں گھومتی نظر آنے لگیں، مسلح ڈاکوؤں اور قتل کے واردات میں دہشت ناک اضافہ ہو گیا۔

انقلاب کے بعد عام ہنگامی صورت حال کی وجہ سے ۱۹۲۲ تک جرائم کے خلاف کوئی باقاعدہ اور منظم مہم نہ چلائی جا سکی۔ لیکن اسی سال یعنی ۱۹۲۲ میں سوویت حکومت نے پہلا ضابطہ فوجداری شائع کیا۔ ان قوانین کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ جرائم اور سماج کے سائنسی ادراک پر مبنی تھے۔ سوویت یونین کے سرکاری وکیل (پروکیورر یٹر) اے وشنسکی نے نئے قانونی نقطۂ نظر کی یوں تشریح کی ہے۔

عام افلاس بے روزگاروں کی لاتعداد فوج، متفرق یافتہ طبقوں کی بدعنوانیاں چھوٹے

سوداگروں کا زیادہ سے زیادہ نفع کی امید پر سامان خرید نے کے لئے جنونی مقابلہ تجارتی دستاویزات (یعنی اسٹاک اکوائد ھا دُھند فروخت کرانے والے دلال، ناجائز اثر و رسوخ کے بل پر چلنے والے لاکھوں مجرمانہ کاروبار، فن اور جعلسازی یا ) یہ ہیں جرائم کی پیداوار کی زرخیز زمین جن کی ذمہ داری سماجی تعلقات کے اس نظام پر ہوتی ہے، جس میں ذاتی ملکیت کا عمل ہے۔ اور جس کی خاطر ہزاروں بدکاریاں اور ناجائز حرکات بلا خوف سزا انجام پاتی ہیں۔

سوویت یونین کا ضابطہ فوجداری اس لحاظ سے ان تمام ضابطوں سے نرالا تھا۔ کہ رومن قانون سازوں کے وقت سے لیکر آج تک اس قسم کا ضابطہ قانون وجود میں نہ آیا تھا، جو نئی قسم کے سماجی تعلقات پر مبنی ہو، اس نئے نظام میں فرد کے ذاتی مال و اسباب کے علاوہ باقی تمام شخصی جائداد کا کوئی خاص احترام نہیں کیا گیا۔ ضروری مال و اسباب کے علاوہ باقی کے ذخیروں کو حقیقتاً خلاف اخلاق تصور کیا گیا تھا۔ اس ضابطے کا مقصد چور، خائن اور جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دینا نہ تھا۔ بلکہ انہیں یہ سمجھانا تھا۔ کہ اب ملک میں ایسے حقوق یافتہ طبقے باقی نہیں رہے۔ جو بلا خوف پاداش قانونی جرائم کا ارتکاب کر سکیں۔ سوویت یونین میں صحتمندانہ تعمیرات رونما ہو رہے تھے، ذاتی خود غرضانہ اور مالی منافعوں کی ہوسناک لڑائی کا رخ قومی خوشحالی کی جدوجہد کی طرف موڑا جا رہا تھا۔ اور جرائم کے خیابان میں بل چل رہا تھا۔

۱۹۲۳ء میں سوویت عدالتوں میں جتنے مقدمات جرائم فیصل ہوئے۔ ان کا اشاریہ سو فرض کیا جائے تو یہ ۱۹۲۶ء میں تر لیسٹھ اور ۱۹۲۹ء میں صرف ساٹھ تھا۔ چھ سال کے عرصے میں دس میں سے چار جرائم ختم ہو گئے تھے۔

اس کے علاوہ سوویت یونین کے ماہرین علم جرائم اپنی جدوجہد کے آغاز کو ۱۹۳۰ء

سے شمار کرتے ہیں، جبکہ زراعت اور صنعت کی برق رفتار اجتماعی ترقی کے پیش نظر سوویت یونین کے ضابطہ فوجداری میں نمایاں تبدیلیاں کی گئیں، کئی سال سے قومی جائداد کی چوری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اور اس قسم کے چوروں کے خلاف مقدموں کی تعداد تمام مقدموں کی تعداد کے نصف سے بھی زائد تھی۔ جرائم پیشہ لوگوں کی اخلاقی تعلیم اور معاشی بحالی کے منصوبے کی بدولت پانچ سال کے عرصے میں جرائم کی تعداد میں ساٹھ فی صد اور اس کے ساتھ ہی ہر قسم کے جرائم کی مجموعی تعداد میں ایک تہائی کمی واقع ہوگئی۔

یہ کامیابی کیسے ہوئی؟

بعینہٖ ان طریقوں سے جو شراب نوشی اور بدکاری کے انسداد کی جدوجہد میں بروئے کار لائے گئے۔ لہٰذا ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، سوویت یونین میں جرائم پیشہ لوگوں کی اصلاح کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے، ان کے متعلق دوسرے ملکوں کے بہت سے اہل قلم حضرات تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ سوویت یونین کے سرکاری وکیل، مسٹر وشنسکی نے ان کا جامع خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"جن جرائم پیشہ لوگوں کے سانحہ سرمایہ دار ملکوں میں آوارہ گردوں اور اچھوتوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ سوویت یونین میں انہیں ملک کی اقتصادی ترقی میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی جاتی ہے اور وہ سوشلسٹ سماج کے سرگرم معمار بن جاتے ہیں۔ بحیرہ ابیض اور بحیرہ بالٹک کو ملانے والی نہر اور دریائے وانگا سے ماسکو جانے والی نہر کی کھدائی اور تعمیر سے سینکڑوں جرائم پیشہ لوگوں کو عملی تعلیم ملی۔ جنہیں ان نہروں کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس تجربے کے بعد زندگی کے متعلق ان کا نقطہ نظر ہی بدل گیا۔ اور ان میں ایمان دارانہ روزی کمانے کا شوق پیدا ہوا۔

سوویت یونین کی انسداد جرائم کی مہم کا نقطۂ عروج وہ واقعہ ہے، جو دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے رونما ہوا ماسکو کے قریب جرائم پیشہ لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے کئی سال سے ایک ادارہ مصروف کار تھا۔ جو بولشیفو کالونی کے نام سے مشہور ہے، یہ مرکز کئی لحاظ سے ان فیکٹریوں سے مشابہ تھا۔ جو پیشہ ور عورتوں کی اصلاح کے لئے قائم کی گئی تھیں، اس ادارے کو ہزاروں سیاحوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی سرگرمیاں رفتہ رفتہ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں اور اس کالونی کی معاشی اور تہذیبی زندگی اس قدر خوش گوار اور دل کش بن گئی کہ ۱۹۳۹ء میں ایسے گریجویٹوں کی تعداد جو شادی کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے ہیں، ان نوواردوں کو ملا کر بھی بڑھ گئی، جنہیں عدالتیں سزا کے طور پر وہاں بھیج رہی ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر بولشیفو کالونی میں اصلاحی پروگرام کو ترک کر دیا گیا۔ لہٰذا یہ بستی ایک اصلاحی ادارے کی حیثیت سے ختم ہوگئی۔ اور اسے نئے سرے سے معزز شہریوں کی آزاد بستی کی حیثیت سے آباد کیا گیا۔ جن لوگوں نے امریکی نظام اصلاح پر وارڈن لاویس کی مشہور تصنیف "سنگ سنگ میں بیس ہزار سال" پڑھی ہے ان کے لئے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جرائم کے انسداد کے متعلق ہماری ان تھک جد و جہد اور سوویت یونین کی عملی کامیابی میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ جہاں بولشیفو کالونی تھوڑے عرصے میں قید خانے سے آزاد برادری میں تبدیل ہوگئی۔

سوویت یونین میں اب بھی کئی قید خانے موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ماضی کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ جرائم کے مقدمات کی سماعت کرنے والی عدالتوں میں ہر سال کم سے کم تر مقدمے آتے ہیں۔ ہمارے لئے شاید سوویت یونین کی انسداد جرائم کی جد و جہد کا سب سے زیادہ موثر کن پہلو وہاں کے نوجوانوں کی سیرت میں انقلابی تبدیلی ہے عملی تجربے کے پندرہ

سال بعد ۱۹۳۵ میں روسی بچوں کی جرائم کاریوں میں معتدبہ تغیر رونما ہوا اور بچوں کی اصلاح کے عملی تجربے کے اٹھارہ مہینوں کے درمیان ہی ان کے جرائم میں بائیس فیصدی کمی واقع ہوگئی اور ہماری حکومت ہمیں ابھی سے متنبہ کر رہی ہے کہ ہمیں جنگ کے بعد خطا کار بچوں کی تعداد میں اور بھی اضافے کا سامنا کرنے پڑے گا آج بھی یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے جس سے لاکھوں گھرانوں کی مسرت اور مستقبل خطرے میں ہے بیشمار اسکیمیں اور نظریے پیش کئے جا رہے ہیں لیکن ہمارے بچوں کے نام نہاد و مصلحین میں جو اختلاف اور انتشار پایا جاتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ حوصلہ فرسا ہے جو انسداد بدکاری اور شراب نوشی کے مجاہدوں کی صفوں میں دیکھا گیا۔

سویت یونین نے بچوں کی اصلاح کے لئے جس تکنیک سے کام لیا اسے منظر عام پر لانے کی ہر کوشش کو روکا گیا ہے نئے سویت قانون میں گمراہ بچوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا گروہ بلا امتیاز جرائم بارہ سال تک کی عمر کے بچوں پر مشتمل ہے دوسرا گروہ بارہ سے سولہ سال تک کی عمر کے ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جو ادنیٰ قسم کی قانون شکنیوں کے مرتکب ہوتے ہیں تیسرے حصے میں بارہ سے سولہ سال کی عمر کے وہ نوجوان شامل ہیں جو سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور سولہ سال سے زیادہ عمر کے جرائم کار نوجوانوں کو بالغوں کی طرح باقاعدہ عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

قانون کی رو سے پہلے دو گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو گرفتار کر کے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا خواہ انہوں نے اس جرم کا اقدام کیا بھی ہو جس میں وہ پکڑے گئے ہوں وہ غالباً فوجداری کے موجب بیگناہ اور معصوم ہیں ان کے خلاف [illegible] فوجداری ان کے والدین، معتمین بالغ لوگوں، سکولوں یا ہمسایوں یا خود سماج پر عاید کی جاتی ہے۔

لیکن یہاں ہمارے کان ایک ناقابل فہم شور سے پک گئے ہیں ہم ججوں، پولیس والوں اور پادریوں کو یہ چلاتے سن سن کر تھک گئے ہیں کہ والدین گھر، سکول اور کلیسا اپنے فرائض کی سرانجام

دہی میں کوتاہی کر رہے ہیں اور وہی بچوں کی تقصیروں کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن سوویت یونین میں انہیں حقیقتاً ذمہ دار ٹھہرایا گیا، ان کے خلاف مقدمے چلائے گئے اور جرم ثابت ہونے پر بھاری جرمانہ کیا گیا۔ بعض خطاکار بچوں کے خلاف سوویت یونین کے عام شہری نالش کرتے ہیں۔ لیکن اکثریت ایسے بچوں کی ہے جنہیں ملیشیا، قومی رضاکار یا پولیس عدالت میں پیش کرتی ہے۔ ملیشیا یا پولیس کے کارکنوں کو حکم ہے کہ وہ نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کو بازاروں، عام عمارتوں یا جگہوں پر بالخصوص سکول کے اوقات میں آوارہ گردی کرتے دیکھیں، یا جب کبھی ان کے متعلق کوئی شبہ پیدا ہو تو انہیں روکیں، بچوں کی یہ سخت نگرانی محض انہیں گمراہ ہونے سے بچانے کے لئے کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بچہ جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پایا جائے وہ سکول اور گھر سے اپنی غیر حاضری کی کوئی وجہ بیان نہ کر سکے۔ یا معلوم ہو جائے کہ اس کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہو رہی تو ملیشیا والے اسے حوالات لے جاتے ہیں۔

یہ حوالات ہمارے ہاں کے حوالات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گھروں پر مشتمل ہوتے ہیں، جن میں عموماً دو یا تین کمرے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں خصوصی تربیت یافتہ معلم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس کی امداد کے لئے چند رضاکار بھی ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ پولیس یا ملیشیا والا لڑکے یا لڑکی کے بارے میں مفصل رپورٹ درج کراتا ہے۔ اور اسے وہاں چھوڑ کر چلا جاتا ہے لیکن گرفتاری کا تکلف روا نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ قانون کے رو سے بچوں کو تھانوں میں لے جانا یا بالغ مجرمین کے ساتھ رکھنا منع ہے۔

مذکورہ بالا معلم بچے کے والدین یا وارث اور سکول کو فوراً اطلاع دیتا ہے۔ ان کے آنے تک بچے کو کھیل، مطالعے اور آرام کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ اس اثنا میں معلم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اصل نقص کہاں ہے۔ اور وارثوں کے آنے تک یقین کرتا ہے کہ بچہ

اتفاقاً گمراہ ہوگیا ہے۔ یا وہ کسی خاص مشکل میں گرفتار ہے، پہلی صورت میں والدین اور وارثین کو متنبہ کیا جاتا ہے۔ اور خاص ہدایات دینے کے بعد بچے کو لے جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ والدین بچے کی نگرانی اور دیکھ بھال کی طرف سے غافل ہیں یا بچہ کسی گھریلو مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔ تو باقاعدہ تحقیقات کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ والدین کے خلاف فردِ جرم بھی مرتب کر لی جائے، ادنیٰ قسم کی بیشتر قانون شکنیوں کو اسی طرح دور کیا جاتا ہے۔ اور کسی قسم کی عدالتی کارروائی نہیں کی جاتی۔

اگر قانون کی رو سے پہلے دو گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے خلاف نالش نہیں کی جا سکتی، تو کوئی میرا پکڑے چراتی پکڑی جائے، یا کوئی تنکا سی وزیر کی کھڑکی میں پتھر اٹھا پھینکے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے، ایسے بد اخلاق بچوں کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن انہیں عدالت میں تنہا نہیں لے جایا جا سکتا۔ ان کے ساتھ ان کے والدین وارثین یا کسی دوسرے بالغ شخص کو بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے۔

بچوں کے خلاف ایسے مقدموں کی سماعت جس قسم کی عدالتیں کرتی ہیں، ان کی مثال سوویت یونین سے باہر کہیں نہیں ملتی، یہ وہ مشہور عدالتیں ہیں جنہیں "ملاقاتی رفیقانہ عدالتیں" کہتے ہیں، اور یہ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوئیں، ان عدالتوں سے زیادہ ہمارے عدالتی نظام کی متاثر کن ضد کا تصور تک محال ہے، یہ عدالتیں سوویت یونین میں ہر کہیں قائم ہیں، ہر رفیقانہ عدالت میں کم از کم دس اور زیادہ سے زیادہ پچیس جج (یا پنچ) ہوتے ہیں، یہ جج عام شہری ہوتے ہیں جنہیں متعلقہ علاقے کے باشندے صنعتی ادارے یا اجتماعی فارم کے تمام کارکن ایک سال کے لئے چنتے ہیں، ججوں کے یہ گروہ (یا پنچایتیں) ہمارے ہاں کی جیوریوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں،

——— انہیں عام تنازعوں، ادنیٰ مقدماتِ فوجداری، بدکاریوں، چھوٹی چوریوں اور بچوں کے خلاف سنگین جرائم کے علاوہ مقدموں کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ رفیقانہ عدالتیں ملک کے تمام باشندوں کا اخلاقی معیار بلند کرنے، لوگوں میں سماجی ذمہ داریوں کے اشتراکی اصولوں کی روح پھونکنے اور پسماندہ افراد کے مجلسی اور تہذیبی ارتقا میں ممد ثابت ہوتی ہیں ان کے وظائف کی مکمل روداد جان۔ این جیزرڈ کی تصنیف "سوویت قانون رہائش گاہ" میں دیکھی جاسکتی ہے سوویت یونین (پنجائتی حکومتوں کے دیس) کے اس اچھوتے عدالتی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام جج متعلقہ ماحول اور لوگوں سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ ان عدالتوں میں مقدمات کی سماعت عام طور سے بے تکلف مباحثے کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ عدالتیں عموماً حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں اور سب لوگ بحث میں حصہ لے سکتے ہیں۔ عدالت کا اولین فرض کسی بچے کی بدچلنی کا موجب یا اس کی بے رہروی کے ذمہ دار شخص کو دریافت کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اہم کام ایسا فیصلہ صادر کرنا اور ایسی سزا تجویز کرنا ہوتا ہے کہ جرم کی تکرار کا امکان باقی نہ رہے

معمول یہ ہے کہ رفیقانہ عدالت بچوں کے لئے خاطر خواہ تفریحی سہولتیں بہم نہ پہنچانے، دوستانہ امداد کے بغیر کسی خاندان کے غیر محفوظ صورت حال میں پھنس جانے، کسی نااہل معلم کو سکول میں باقی رکھنے یا اسی قسم کی دوسری غفلت کی پاداش میں خود اپنے آپ کو، یعنی علاقے کے تمام باشندوں کو مجرم ٹھہراتی ہے۔ بہر حال عدالت کا فیصلہ التزاماً کوئی ایسی تجویز ہوتا ہے، جس سے بچے اور اس کے ماحول کی اصلاح ہو جائے

اس طریقے سے خطاکار اور ملزم بچوں کی بھاری اکثریت پر قابو پا لیا جاتا ہے سولہ سال سے زائد عمر کے تمام نوجوانوں اور بارہ سے سولہ سال کی عمر کے ایسے بچوں کو

جن کے خلاف بڑی چوریوں، خطرناک شرارتوں اور قاتلانہ حملوں کا الزام ہو، انہیں عدالت فوجداری میں پیش کر کے ان پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کی عدالتوں کا کام محض سخت سے سخت سزا تجویز کرنا ہے۔ اس لئے ہم بچوں کی جس قسم کی عدالتوں کا تصور کر سکتے ہیں سوویت یونین میں کوئی عدالت نہیں کیونکہ وہاں نابالغ مجرمین کے خلاف مقدمے کی سماعت یا تو رفیقانہ عدالتیں کرتی ہیں، یا ان کے جرائم کو سنگین تصور کیا جاتا ہے اور ان کے مقدمے فوجداری عدالتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ لائحہ عمل پندرہ سال کے تجربے کا نچوڑ ہے۔ لہٰذا ہمارے ملکوں کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا موجب ہے سوویت یونین میں خطاکار بچوں کے خلاف قانونی کارروائی کا مسلمہ طریقہ یہ ہے کہ وہاں بچوں کو بلحاظ جرائم دو گروہوں میں منقسم کر دیا گیا ہے

(۱) اگر ملزم بہت ہی کم سن ہو یا اس کے خلاف ادنیٰ شرارت کا الزام ہو، تو ملزم لڑکے یا لڑکی کو گرفتار نہیں کیا جاتا اور اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔

(۲) ملزم بچہ عمر میں بڑا ہو اور اس نے کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہو تو اس کے خلاف باقاعدہ عدالت میں سخت مگر منصفانہ کارروائی کی جاتی ہے۔

تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ قانون شکن بچوں کے دو گروہ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ کوئی ایک عدالت بیک وقت ان سے اچھی طرح نمٹ نہیں سکتی۔ ہمارے پیشرو عظیم کے بعض باعمل قومی رضاکار بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی تک رفیقانہ عدالتوں سی کوئی چیز وجود میں نہیں آئی، وجہ یہ ہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، بچوں کی عدالت ہے، اس کا صدر منصف مقدمے کی رہنمائی خواہ کتنی ہی بے رسمی سے کرے، عدالت کا زیادہ تر وقت بچے کی سکول

سے غیر حاضری، آوارہ گردی اور ادنیٰ قسم کی قانون شکنیوں کی غیر ضروری تفصیلات ہی میں ضائع ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں کم سن بچوں کے لئے عدالت میں پیش ہونا ایک دلچسپ ڈرامائی تجربہ ہے اور بسا اوقات اس احساس کا نفسیاتی اثر تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ سولہ سال سے زیادہ عمر کے نوجوان اور بارہ برس سے زیادہ عمر کے وہ بچے جو سنگین جرائم کے اقدام کے قابل ہیں، ایک ایسی عدالت میں پیش ہوتے وقت جو کم سن بچوں کے ادنیٰ مقدموں کا فیصلہ بھی کرے۔ اپنے جرائم کو حد سے زیادہ معمولی خیال کرنے لگتے ہیں۔

روس میں جب کسی لڑکے یا لڑکی کو اعلیٰ فوجداری عدالت کے حوالے کرنا مقصود ہو تو محکمہ وکالت سرکار خصوصی تحقیقات کرتا ہے۔ اگر مقدمے کو اعلیٰ عدالت کے سپرد کرنا ہو، تو ایک مفصل فرد جرم تیار کی جاتی ہے۔ اس فرد جرم میں نہ صرف مبینہ الزام کے مکمل حالات بلکہ ملزم کی شخصیت کی بھی مکمل تشریح شامل ہوتی ہے۔ جسے عموماً ایک ماہر امراض نفس تیار کرتا ہے اور حتی الامکان جرم کا محرک بھی بتاتا ہے۔

بچوں کے خلاف مقدمات جرائم کی سماعت کے اشتراکی طریقے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے دوسرے ملکوں اور سوویت یونین کے دستور قانون کے باہمی فرق کو جاننا ضروری ہے اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم سوویت یونین کے سرکار وکیل کے فرائض منصبی کا مطالعہ کریں۔

سوویت یونین کے دستور اساسی کے نویں باب میں درج

ہے۔

"یہ دیکھنا کہ تمام عوامی وزارتیں اور ان کے ماتحت اداروں کے علاوہ تمام سرکاری ملازم اور شہری قوانین کی سختی سے تعمیل کرتے ہیں، سوویت یونین کے اعلیٰ وکیل سرکار کا فریضہ ہے۔"

تمام سوویت یونین کے لئے ایک اعلیٰ سرکاری وکیل مقرر کیا جاتا ہے اور اس کے ماتحت ہر جمہوریت اور خود مختار علاقے اور خطے کا ایک ایک سرکاری وکیل ہوتا ہے۔ . . . . . جنہیں اعلیٰ سرکاری وکیل پانچ سال کے لئے مقرر کرتا ہے۔ سوویت یونین کے اعلیٰ سرکاری وکیل کو سوویت یونین سب سے اعلیٰ ادارہ حکومت "سوویت یونین کی سب سے اونچی پنچایت سات سال کے لئے مقرر کرتی ہے۔

سوویت یونین کا سرکاری وکیل امریکہ کے وکیل ضلع کناڈا کے سرکاری وکیل سے ملتا جلتا ہے۔ سوویت یونین میں نہ صرف وفاقی جمہوریتوں اور خود مختار علاقوں بلکہ ہر شہر اور ہر ضلع میں ایک مقامی سرکاری وکیل ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے عدلیہ کے برعکس سوویت یونین کا محکمہ وکالت سرکار ایک واحد ادارے کی طرح کام کرتا ہے اور وہاں پر چھوٹے بڑے سرکاری وکیل کے فرائض تقریباً ایک سے ہیں۔

فرنیز سوویٹ یونین کے ہر چھوٹے بڑے سرکاری وکیل کا فرض منصبی یہ ہے۔ کہ وہ قانون کی یکساں اور آفاقی تشریح کرے اور دیکھے کہ اس تشریح پر ہو بہو عمل ہو۔ اس کا یہ کام خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ملک کے باشندوں سے تعمیل کرانے تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام سرکاری اداروں اور خود عدلیہ سے بھی تعمیل قانون کراتا ہے

لغوی معنوں میں سوویت یونین کا سرکاری وکیل دراصل محافظ قانون ہے۔ ہر ایک سوویت سرکاری وکیل اپنے حلقے کے تمام سرکاری افسروں، حتیٰ کہ خود ججوں سے بھی بالاتر ہوتا ہے اور وہ محض عدلیہ کا مددگار نہیں ہوتا۔ یہ تفوق بہت اہم ہے۔ جب سے قانون کا عمل ہوا ہے اسی وقت سے اس کی اصلاح و ترمیم کے لئے مسلسل تحریک بھی جاری ہے اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ریاستوں، ان کی پولیس، ان کے مستغیثوں اور ان کے تمام امدادی اداروں کا رویہ ظالمانہ رہا ہے۔ جسے ایک عام شہری کے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "قانون عوام کا شکار کرتا ہے۔ قانون لوگوں کا دشمن ہے" حقیقی انصاف کے نام سے تمام قانونی اور عدلی اصلاح و ترمیم کی تحریک کا مقصد ہمیشہ سے اسی خامی کو دور کرنا رہا ہے۔ سوویت یونین میں قانونی اور عدلی اصلاح نہ صرف تسلی بخش بلکہ بے حد موثر تھی۔

سوویت وکیل سرکار کے دو اہم فریضے ہیں۔ پہلا یہی قانون کی تعمیل، قانون شکنی کا سدباب اور قانون توڑنے والوں کو سزا دینا۔ دوسرا فریضہ مفاد عامہ کا تحفظ ہے۔ دوسرے فریضے میں ان لوگوں کی صفائی کی ذمہ داری بھی شامل ہے جو قانون شکنی میں ماخوذ ہوں، اس کے علاوہ اس فریضے میں نفاذ قانون اور عدل کے اداروں کی سخت نگرانی بھی شامل ہے۔

لہٰذا سوویت یونین کے سرکاری وکیل کے اختیارات بے حد وسیع ہیں اور اسے اپنے اختیارات کو جس غیر جانبداری سے استعمال کرنا پڑتا ہے کسی دوسرے ملک کے سرکاری وکیل کے لئے ممکن نہیں۔ ہم بجا طور پر سوال کر سکتے ہیں کہ ایسی غیر جانبداری حقیقی ہے یا محض نظری؟

سوویت یونین کے ضابطہ فوجداری کو وضع ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا ہے کہ سرکاری وکیل صحیح معنوں میں عوام کا محافظ ثابت ہو۔ مثلاً روس کی سوشلسٹ جمہوریتوں کے دفاتی آئین کے مطابق ابتدائی تفتیش کرنے والے افسر کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف ان حالات کی تحقیق اور تعین

کرے جن کی بنا پر کسی شہری کو مجرم یا بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان حالات کا بھی جائزہ لے، جن کے سبب اس کے جرم کو سنگین یا معمولی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقدمے کی ابتدائی تفتیش کرنے والا شخص خود سرکاری وکیل ہوتا ہے یا اس کا کوئی ماتحت افسر، فرد جرم میں ان تمام شہادتوں کا درج ہونا ضروری ہے جو ملزم کے حق میں ہوں یا خلاف، سوویت یونین کے ضابطہ فوجداری کا اہم اصول یہ ہے کہ سرکاری وکیل اس وقت تک کوئی مقدمہ نہیں جیت سکتا، جب تک تمام شہادتوں سے ارتکاب جرم ثابت نہ ہو۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۰۶ کے مطابق اگر منتخبت کو یقین ہو جائے کہ مقدمے کی سماعت کے دوران میں جن حقائق کا انکشاف ہوا ہے۔ ان سے فرد جرم کو تقویت نہیں پہنچتی تو اسے مقدمہ واپس لینے کا اختیار ہے۔"

مزید برآں سرکاری وکیل کا فرض ہے کہ مقدمے کے بعد عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کرے ہمارے ہاں سرکاری وکیل اس بنا پر اپیل کر سکتا ہے کہ سزا جرم کے مقابلے میں کم ہے سوویت یونین میں بھی یہی دستور ہے۔ لیکن وہاں سرکاری وکیل کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ سزا کو جرم کے مقابلے پر زیادہ سنگین پائے تو عدالت عالیہ سے اپیل کرے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ مقدمے کی سماعت میں ایسی قانونی اور عدلی خامیاں رہ گئی ہوں جو مجرم کے مفاد کے خلاف جاتی ہوں۔

دوسرے لفظوں میں سوویت وکیل سرکار مدعی بھی ہے اور مدعا علیہ بھی۔ وہ عدالتوں سے اونچا نہ ہوتے ہوئے بھی ایک حد تک تمام عدالتی کارروائی کی نگرانی کرتا ہے۔ قوانین مذکور کی دوسری دفعہ کے مطابق "سرکاری وکیل کو نالش کرنے کا اختیار ہے اور اسے ریاست یا عوام کے مفادات کے تقاضے کے پیش نظر مقدمے میں مداخلت کا حق حاصل ہے۔ خواہ مقدمہ کسی بھی مرحلے میں ہو۔"

یہ تمام نظام وکالت ایک مرکز کے ماتحت ہے۔ گویا یہ نظام ایک ایسا دفاتی مرکز

ہے۔ جسے تمام جمہوریتوں، خود مختار علاقوں اور خطوں کے قانونی اور عدلی نظام پر کلی اختیارات حاصل ہے۔ اس نظام کا مقصد تعمیل قانون میں ہمہ گیری اور یکسانیت پیدا کرنا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس نظام کو لینن نے سوویت حکومت کے ابتدائی ایام ہی میں قائم کر دیا تھا۔ لینن نے اپنے ایک خط میں استالین کو لکھا "سرکاری رکیل کا واحد حق اور فرض یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ مقامی اختلافات اور موثرات کے باوجود تمام ری پبلک (سوویت یونین) میں قانون کی صحیح معنوں میں ہمہ گیر تشریح و تعمیل ہو۔"

ہمارا اپنا تجربہ شاہد ہے کہ ایسے اصولوں کی پیروی سے بے شمار خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن سوویت یونین کا نظام عدل ان اصولوں کی سختی سے حمایت کرتا ہے اور وہ بالکل نئے قانونی اصولوں پر مبنی ہے۔ سوویت عدالتوں کا بڑا کام سنگین ضابطہ قانون کی پیروی نہیں۔ بلکہ محنت کش طبقے میں نظم و ضبط، بالخصوص رضاکارانہ نظم و ضبط پیدا کرنا ہے کیونکہ یہ عدالتیں اسی طبقے کے اختیارات حکمرانی کی نمائندہ ہیں۔ انہیں سوویت نظام کے ہمہ گیر مدرکات کے مطابق منظم کیا گیا ہے اور یہ دوسرے ملکوں کی عدالتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ جمہوری ہیں۔

کوئی سوویت عدالت نسل، قومیت یا جائیداد کے تفوق کو تسلیم نہیں کرتی۔ ججوں کا آزادانہ انتخاب ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف عوام کے چنے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ عوام میں سے ہوتے ہیں۔ یہی کچھ ان کی قانونی تربیت ہے اور اکثر سوویت یونین کے جج ابتدا میں وکالت پیشہ نہ تھے بلکہ وہ شہروں یا دیہات کے محنت کش مرد یا عورتیں تھیں۔ عدالتی تقرر کے اس نئے طریقے کا فائدہ ہر خاص و عام پر واضح ہے۔ کیونکہ سوویت یونین کا نظام عدل بالکل اسی طرح جمہوری ہے جس طرح ہمارے ہاں کی ٹاؤن بلدیہ یا میونسپل کمیٹی۔ ہمارے ہاں کے کونسلروں اور سکول بورڈ کے ٹرسٹیوں کی طرح سوویت۔ جج عوام کے لئے ہیں۔

جب سے جدید ریاست نے جنم لیا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک سوویت یونین کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں اس اصول پر عمل نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس اصول سے مراد قانون کی میکانکی اصلاح و ترمیم نہیں۔ بلکہ اس کا تقاضا ہے کہ تمام قانونی اور عدلی ڈھانچہ لوگوں کے مفاد کے عین مطابق ہو، ورنہ عوامی جج یا تو قانونی تضاد کے سبب کام ہی نہیں کر سکیں گے یا ان قوانین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں جو عوام کے کسی ادنیٰ گروہ کے خلاف ہوں جو بنیادی حقوق کو تسلیم ہی نہ کریں یا جو کسی طرح بھی خصوصی توجہ حیات کو روا رکھیں وہ بہت جلد قانون کی تعمیل کرانے والی مشینری کو توڑ دیتے ہیں۔ یہ نکتہ ان نام نہاد مصلحین پر انقلاب فرانس کے وقت ہی سے روشن ہو گیا تھا۔ جو اس کلاسیکی عیاری سے کام لینا چاہتے تھے کہ قانون امیر اور غریب دونوں کو روٹی کی چوری سے روکتا ہے۔ لیکن عوامی ججوں کے لئے مشکل ہے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف مقدمے لیں جو اس لئے روٹی چرائیں کہ وہ بھوکے تھے۔

سوویت یونین میں نہ صرف عوامی جج اور عوامی عدالتیں بھی نہایت کامیابی سے کام کر رہی ہیں بلکہ گزشتہ ۲۵ برس کے عرصے میں اکثر و بیشتر قوانین کی تعمیل انہی نے کرائی ہے اعلیٰ عدالتیں چند ایسے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے مخصوص ہیں جو ریاست کے تحفظ سے متعلق ہوں۔ ان کا خاص کام عوامی عدالتوں کی اپیلوں کو سننا ہے۔ "سوویت دستور روایت" میں جسے سوویت اکادمی نے علوم کے شعبہ قانون نے شائع کیا ہے، ججوں کی آزادی کی یوں تشریح کی گئی ہے۔

"سوویت جج خود مختار ہیں، کیونکہ سوویت عدالت صرف ایسے قانون کی پابند ہے جو لوگوں کو مدنظر ہو اور وہ خاص مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں ہر قسم کے اثر و رسوخ سے آزاد ہو۔ تمام جج اپنے یا فیصلہ کرتے ہیں صرف قانون کے تقاضوں یا اپنی داخلی رایوں کے پابند ہیں۔ جن پر تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد پہنچیں۔ ان معنوں میں سوویت عدالت، عوامی عدالت

(یعنی پنچایت) حقیقتاً" آزاد عدالت ہے"۔

سوویت آئین کی دفعہ نمبر ۱۱۱ کے مطابق "تمام عدالتی کارروائی وفاقی جمہوریت، خودمختار جمہوریت یا خودمختار علاقے کے لوگوں کی مادری زبان میں کی جاتی ہے جو لوگ متعلقہ زبان نہ جانتے ہوں، انہیں ایک ترجمان کے ذریعے مقدمے کے تمام مواد سے پوری طرح آگاہ ہونے اور عدالت میں اپنی مادری زبان استعمال کرنے کا حق حاصل ہے"۔

چند مستثنیات کے علاوہ تمام مقدمے کھلی عدالت میں سنے جاتے ہیں، مستثنیات میں ایسے مقدمے ہیں جن میں عدالت کے لئے کسی شخص کی خانگی زندگی کے رازوں کا تفصیلی جائزہ لینا ناگزیر ہو یا جن سے فوجی یا ڈپلومیسی کے اسرار وابستہ ہوں۔

آخری بات یہ ہے کہ ججوں کو چننے والے لوگ جب چاہیں انہیں واپس بلا سکتے ہیں۔

سوویت یونین میں نابالغ مجرمین کے مقدمات کی سماعت کے طریقے کی دو امتیازی خصوصیات ایسی ہیں، جن سے ہماری عدالتیں آشنا تک نہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مقدمے کی سماعت تین جج کرتے ہیں۔ ان میں صرف ایک جج قانون دان ہوتا ہے اور دوسرے دونوں عام شہری ہوتے ہیں۔ جنہیں کمسن مجرمین کے معاملات کا پورا تجربہ ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ باقاعدہ عدالت میں پیش ہونے والے ہر بچے کے لئے ایک وکیل صفائی کا مفت بندوبست کرے۔ اس حفاظتی اقدام کا مقصد تمام بچوں کا زیادہ سے زیادہ قانونی تحفظ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ہاں کے تمام تجربہ کار وکیل اور قانون دان حضرات اس طریقے کی پرزور حمایت کریں گے، کیونکہ اس سے بچوں کی عدالتوں کے خلاف اس بڑے اعتراض کا ازالہ ہو جائے گا کہ عدالت کی رائے اور غیر جانبداری پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے سے خطرناک ناانصافی کا امکان ہے۔

سوویت عدالتوں میں مقدمے کی سماعت کا طریقہ بالکل سیدھا سادا ہے۔ ہماری عدالتوں کے معمول کے برعکس وہاں قانونی اصطلاحات اور پرانی مثالوں کے حوالوں سے حتی الوسع گریز کیا جاتا ہے اور تینوں جج مل کر روزمرہ کی زبان میں حکم تیار کرتے ہیں۔ ہر شخص کو اپیل کا حق حاصل ہے اور اپیل پر کچھ خرچ نہیں آتا کیونکہ وکلائے صفائی کی فیس سمیت تمام اخراجات حکومت خود برداشت کرتی ہے۔

تاہم سوویت یونین میں بچوں کے مقدمات کی سماعت کے طریقے کی مکمل وضاحت کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ وہاں ملزم کو مجرم یا معصوم ثابت کرنے پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ ان حالات و محرکات کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن کے تحت کسی جرم کا اقدام ہوا ہو۔ لہٰذا ہمارے معمول کے برعکس وہاں بچوں کے مقدمات جرائم میں بہت زیادہ شہادتیں لی جاتی ہیں۔ مزید برآں عدالت کا فرض ہے کہ جرم کا خاص سبب دریافت کرے اس طرح سے جو فیصلے صادر کئے جاتے ہیں وہ ہمارے لئے واقعی حیران کن ہیں مثال کے طور پر سوویت جج اکثر گواہوں یا جرائم کار بچے کے ایسے پڑوسیوں پر برس پڑتے ہیں جو شہادت دیں کہ بچے کے والدین بہت بداخلاق یا شراب کے عادی ہیں یا بچہ کافی مدت سے آوارہ گردی کے لئے مشہور ہے، کیوں کہ ان کی غفلت یہ ہے کہ انہوں نے بچے کے خطرناک مجرم بن جانے سے پہلے رفیقانہ عدالت کو اطلاع نہ دی مقصد یہ ہے کہ جرم کی تکرار نہ ہو۔ بچہ بھی اس جرم کا دوبارہ مرتکب نہ ہو اور یہ حرکت اجتماعی پیمانے پر بھی دہرائی نہ جائے، اس طریقے پر کسی مقام یا علاقے کے بچوں میں جرائم کے جڑ پکڑنے سے پہلے ہی انہیں ختم کر دیا جاتا ہے، عدالت خود داری میں شاذ و نادر ہی کسی بچے کا مقدمہ پیش ہوتا ہے اور جب کبھی ایسا اتفاق ہو تو عام اجتماعات اور مجالس میں اس پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ اخبارات میں اس پر تنقید و تبصرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح متعلقہ علاقے کی

برادری کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کے ساتھ عدالتی مشینری کی پڑتال بھی ہو جاتی ہے۔

آج کل سوویت یونین میں جرائم پیشگاں کا مسئلہ فضول نظریہ بازی سے نکل چکا ہے اور اسے سائنسی طریقے سے حل کیا جا رہا ہے۔ اقدام اتنے عام فہم اور عملی ہیں کہ جس شخص کو اس مسئلے سے تھوڑا بہت بھی مس ہے وہ ان طریقوں کی قدر و منزلت سے فوراً آگاہ ہو سکتا ہے۔

ہم اپنے برعظیم امریکہ میں گمراہ بچوں کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ امریکہ ایک مدت سے جدید قید خانوں، اصلاحی جیل خانوں اور بچوں کے حوالات والی قوم کی حیثیت سے مشہور ہے۔ یہ بلند نظریہ زیادہ تر چند مقامی نمائش گاہوں کو مشتہر کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں بالٹی مور کی ضلع کچہری کے ایک جج رچرڈ ڈبلیو کس نے "پروبیشن" نامی جریدے میں مندرجہ ذیل حقائق تحریر کئے

(۱) میں نے ایک نہایت غلیظ قید خانہ دیکھا جس میں اسی قیدی ایک ساتھ بند تھے۔ ان میں ۲۰ بچے تھے، جن کے لئے مردوں سے الگ کوئی انتظام نہ تھا۔

(۲) ایک شہر کے قید خانے میں یتیم بچے بھی بند تھے، کیونکہ وہاں لاوارث بچوں کی پرورش کا کوئی بندوبست نہیں۔ بچوں کی عدالت کا تو ذکر ہی کیا۔

(۳) عورتوں کا ایک قید خانہ اتنا غلیظ تھا کہ میرے کپڑے بدبو میں بس گئے۔ نوجوان لڑکیوں کے لئے الگ کمرے نہ تھے۔ خاص طور سے دوالیسی طالبات کے لئے کوئی الگ انتظام نہ کیا گیا جو دو لڑکوں کے ساتھ چوری کی کار میں آوارہ گردی کرتی ہوئی پکڑی گئی تھیں۔ اس جیل کی تمام لڑکیاں پست اخلاق افراد میں گھری ہوئی تھیں۔ وہ طوائفوں کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں اور انہی کے ساتھ سوتی تھیں۔

(۴) قیدی بچوں کا خاص کھانا پھلیاں اور دن میں دو بار کالی چائے تھی۔ انہیں پینے کو دودھ نہ ملتا تھا۔ ان کے لئے نہانے دھونے کے لئے گرم پانی کا بندوبست نہ تھا۔ یہ لڑکیاں

اس موضوع پر ایک بصیرت افروز مقالہ لکھا ہے جو رسالہ "سوشل ہائجین" کے فروری ۱۹۴۴ء کے ایشو میں شائع ہوا اور امریکی محکمہ صحت عامہ نے پوری طرح اس کی نشر و اشاعت کی اس مقالے میں بڑی حد تک نظریوں کے گورکھ دھندوں میں پڑنے کی بجائے براہ راست حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اسے محکمہ صحت عامہ اور انجمن حفظان صحت کی مشترکہ امداد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی اشاعت سے پہلے بڑی بڑی کانفرنسوں اور سرکاری عمال نے اس مسئلے پر بہت غور و خوض کیا تھا۔ خود ڈاکٹر پائنکلو نے صحیح حقائق جمع کرنے کے لئے بارہ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا، اس مقالے میں ڈاکٹر پائنکلو فرماتے ہیں "مجھے اس مسئلے کی تحقیقات کے دوران میں اپنی ذاتی ملاقاتوں یا خط و کتابت میں ایک بھی ہیلتھ آفیسر، ڈاکٹر، ماہر تعلیم یا وزیر ایسا نہیں ملا جس نے اس خیال کی حمایت نہ کی ہو کہ سکول اور گھر میں جنسی مسائل کی صحیح تعلیم، بچوں کی شخصیت اور سماج کی تعمیر کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتی ہے۔ ایسی تعلیم حاصل کرنے والے بچے آئندہ زندگی میں اپنے کردار کو قابو میں رکھنا سیکھ جاتے ہیں۔" البتہ اس مسئلے پر اختلاف تھا کہ "عمومی جنسی تعلیم، جنسی بیماریوں کی روک تھام کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے" لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ "جہاں تک بچے کے انفرادی تحفظ کا تعلق ہے۔ اس میں یہ احساس پیدا کر دینا کہ جنسی بیماریاں چھوت کی بیماریاں ہیں۔ بہت بڑا تعلیمی حربہ ہے۔"

انہوں نے ڈاکٹر پیرن کی رپورٹ کا حوالہ دیا اور کہا "ہمارے لئے ازحد ضروری ہے کہ ہم ان تمام ذرائع سے جو کلیسا، سکول، سرکاری اداروں یا رضاکارانہ تنظیموں کی استطاعت میں ہیں۔ اپنے نوجوانوں کو شریفانہ زندگی کی زیادہ سے زیادہ تعلیم دیں، میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ جنسی اخلاق کا استحکام و تنزل جنسی بیماری کے متعلق اچھے یا برے نظریے پر منحصر ہے۔ آتشک کی روک تھام کے لئے خوف کافی نہیں، ہمیں اپنے لڑکوں اور

لڑکیوں کو بہترین جنسی تعلیم دینی چاہیے۔ ہمیں ایسے سماجی اور معاشی حالات بھی پیدا کرنے چاہئیں جن کے تحت سہارا نوجوان بلحقہ صحت مندانہ اور معتدل زندگی بسر کر سکے۔"

امریکہ کی پندرہ ریاستوں کے کام کی پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی ریاست میں بھی آج تک قومی صحت اور جنس کی تعلیم کے امکانات کا جائزہ تک نہیں لیا گیا۔ ڈاکٹر بائیلو نے اپنے محدود حقائق کے پیش نظر متنبہ کیا کہ "اگر ریاستوں کے تعلیمی محکمے اسی طرح جنسی بیماریوں کے علاوہ باقی امور صحت کی طرف مائل رہے اور جنسی بیماری کی انسدادی جدوجہد کو حسب معمول محکمہ صحت پر ہی چھوڑتے رہے تو یہ آگے چل کر فاش غلطی ثابت ہوگی۔"

مزید برآں "پڑھنے والوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ کے بہت سے تمامی ادارے اور باختیار لوگ تعلیم صحت کے بعض امور خاص طور سے جنسی یا مذہبی امور کی تعلیم کے سخت مخالف ہیں۔ اگر کسی مقام پر جنسی بیماری کی تعلیم کے خلاف تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ البتہ سخت نقصان کا احتمال ضرور ہے۔"

چند سال پیشتر ایک استاد مسئلہ ارتقاء پر بحث چھیڑ بیٹھے تھے۔ ان کے خلاف نالش کر دی گئی، جس سے نہایت ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر بائیلو فرماتے ہیں "عین ممکن ہے کہ چند والدین اور استاد جنسی بیماری کی تعلیم کی مخالفت کریں۔ اس لئے فی الحال ہر ریاست میں ٹینی زی کی طرح جنسی مسائل کی ابتدائی تعلیم پر ہی اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔"

اس بات پر بار بار زور دیا جاتا ہے کہ جنسی بیماری کی تعلیم کو نام نہاد "جنسی تعلیم" اور عام تعلیم صحت سے الگ رکھنے کی ضرورت ہے۔ حیرانی کی بات ہے، جب ایسا پروگرام ٹینی زی میں استعمال ہو سکتا ہے تو اسے قومی پیمانے پر کیوں نہیں شروع کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر بائجلو نے اپنی رپورٹ میں فرمایا ہے کہ "سماجی حفظان صحت کے اکثر رہنماؤں میں عرصے سے یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جنسی بیماری کے انسدادی منصوبوں میں جنسی تعلیم کے تمام امور کو برابر کی اہمیت دینا چاہیے، لیکن گزشتہ دس سال میں یہ خیال بدل گیا ہے اور جنسی تعلیم کی ضرورت کے حق میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی بنیاد جسمانی، دماغی اور سماجی صحت کے ان اصولوں پر ہے، جن سے جنسی بیماری کا کوئی تعلق نہیں۔

"اگر اس خیال کو قبول عام حاصل ہو گیا کہ جنسی تعلیم کا صحیح پروگرام نہ جنسی بیماری سے شروع ہوتا ہے نہ اس کے گرد گھومتا ہے، تو یہ جنسی بیماری کو تعلیم، صحت اور جنسی تعلیم کو انسانی رشتوں کی تعلیم کا حصہ قرار دے کر ان کی تعلیم دینے میں بہت کارثابت ہوگا۔"

دوسرے لفظوں میں یہ امر ضروری ہے کہ جنسی بیماری کی تعلیم عام امورِ صحت کے ساتھ ساتھ دی جائے اگر آتشک اور سوزاک کو تپ دق اور گلے کے امراض کے ساتھ زیر بحث لایا جائے تو اس کی وہ لوگ بھی مخالفت نہیں کریں گے جو بچوں اور بالغوں کو جنسی تعلیم دینے کے حامی نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ حفظان صحت کے باعمل ماہرین بھی اس نقطہ نظر کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ تعلیمی مقاصد کے پیش نظر جنسی بیماری کو عام جنسی مسائل سے الگ رکھنے پر اصرار کرنا عصمت پسند لوگوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہرگز نہیں۔ دراصل جنسی بیماری کو اخلاق عصمت فروشی، جرائم اطفال وغیرہ سے الگ نہ رکھنا ہی بہتر ہے۔

یہ معاملہ سبھی طبقوں کے لئے ایک سی اہمیت رکھتا ہے۔ جنسی بیماریوں کا ذکر مذکورہ طریقے سے کیا جائے اور محض جنسی موضوعات کا ذکر نہ کیا جائے تو ان بیماریوں کی تعلیمی اہم پر کوئی طبقہ یا گروہ برا نہیں مانے گا۔

بہرحال جنسی اعتبار سے بدراہ بچوں کو جنسی حقائق کی تعلیم دینے کی فوری ضرورت ہے

آج کل بچوں کی عدالتیں، ماہرین نفسیات، افسران فلاح و بہبود اور استاد بدکار بچوں کی اصلاح کے لئے کسی منظم طریق پر کاربند نہیں ہیں۔ خاص طور پر سے لڑکیوں میں دیگر جرائم کی نسبت جنسی غلط کاری کی بدعت عام ہے۔ نیویارک سٹیٹ کی عورتوں کے کلبوں کے دفاق کی طرف سے امریکہ بھر کے بچوں کی جرائم کاری کی رفتار کا جائزہ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آجکل زمانہ قبل از جنگ کے مقابلے میں تین سو فیصد (یعنی سہ گنا) زیادہ کمسن نوجوانوں کی گرفتاریاں عمل میں آ رہی ہیں۔ حالانکہ پولیس کے پاس بڑے اور سنگین جرائم کی اس قدر بھرمار ہے کہ وہ ادنیٰ جرائم کو نظر انداز کرنے پر مجبور رہے۔

# دعوتِ فکر

لوگ "گناہ" کیوں کرتے ہیں؟

یعنی لوگ ایسا چلن کیوں اختیار کرتے ہیں۔ جو خود ان کے لئے، ان کے قریبی رشتہ داروں تمام سماج کے لئے افسوسناک جسمانی اور روحانی ایذا کا موجب ہوتا ہے؟

یا اور بھی واضح لفظوں میں عورت اور مرد زنا کیوں کرتے ہیں؟ ہم جنسی اختلاط کے اکا دکا یا اتفاقی واقعے کی بات نہیں کر رہے، بلکہ ہماری مراد ان ناجائز جنسی تعلقات سے ہے جو اسقدر عام ہیں کہ ان کی زندہ مثال دہلی ایک مہینے میں پانچ کروڑ حفاظتی آلات" کا استعمال ہے۔

لہٰذا ان معنوں میں لوگ "گناہ" کیوں کرتے ہیں؟

اس سوال کا جواب ہمارے ذہن میں اس بے ہنگم قوالی کی طرح ابھرتا ہے جس میں ایک گویے کا سر دوسرے سے ملتا ہوا نہ ہو۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ناجائز جنسی اختلاط کی وجہ یہ ہے کہ عورت اور مرد اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنتے تو کیا ہم اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ

دھرے بیٹھے رہیں۔ جب تک ضمیر کی مدہم آواز کو زوردار بنانے کے لئے سائنس کوئی آلہ لاؤڈ سپیکر ایجاد نہیں کر لیتی؟

لیکن مصیبت یہ ہے کہ دوسرا گروہ فوراً صدائے احتجاج بلند کرتا ہے کہ یہ تو قادرِ مطلق کی توہین ہوئی۔ کیونکہ وہی بتا سکتا ہے کہ ثواب کیا ہے اور گناہ کیا، لیکن افسوس کہ جاگیردارانہ نظام میں روحانی پیشوا عام لوگوں کو یقین دلایا کرتے تھے کہ لاتعداد عورتوں کا طوائفیں بن جانا علامت خیر اور شریف عورتوں کا عصمت کرنا دلیل شر ہے (یاد رہے کہ امریکہ اس وقت سرمایہ داری کے آخری دور یعنی امپیریل ازم یا سامراجیت میں ہے (مترجم) تو کیا خدا کے اخلاقی قانون بھی اس وقت بدل جاتے ہیں جبکہ انسان اپنے سماجی نظام کو بدل دیتا ہے؟

اس سوال پر بعض فلسفی جھٹ پٹ بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو کفر ہے اور متنبہ کرنے لگتے ہیں کہ ہم ایسے لوگوں کی غلط تعلیمات کو خدا سے منسوب نہ کریں۔ جو اپنے آپ کو اس کے اوتار کہتے تھے، غرضیکہ اسی قسم کی دلیلوں سے بے شمار صفحے کالے کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ میں عالم لوگ نہایت سنجیدگی سے بحث کیا کرتے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے کھڑے ہو سکتے ہیں اور آج کل ہمارے فلسفی اور بعض سائنسدان بھی یہ سوال پوچھنے کے بڑے شوقین ہیں کہ "لوگ گناہ کیوں کرتے ہیں؟" ہو سکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مناظرے بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے ہوں شاید ان مناظروں کی بدولت بعض لوگوں نے ہوا بازی کے کچھ بنیادی مسائل پر غور و خوض کرنا شروع کر دیا ہو۔ کہ سوئی پر کسی فرشتے کو اپنا اڑن کھٹولا اتارنے اور اڑانے میں کیا مشکلیں پیش آتی ہیں یا فضا میں اڑتے اور اترتے وقت چکر کاٹنا کیوں مفید ہے۔" یا اسی قسم کے دوسرے "بنیادی" مسئلوں پر غور و خوض شروع ہو گیا ہو۔

لیکن ہمارے سامنے تو آج کل جنسی اختلاط یا زنا اور جنسی بیماری اور آتشک۔ جیسے

خشک معاملے ہیں۔

آج ہر پادری، ڈاکٹر، وکیل، بالخصوص ہر عیال دار شخص کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے واقعات کے رجحان سے واقفیت پیدا کرے۔

موجودہ زمانے میں ہمارے ملکوں کے بے شمار لوگوں کی دماغی بیماریوں کا موجب شراب ہے۔ لیکن اس کے تدارک کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جاتا، وجہ یہ ہے کہ شراب نوشی ایک خطرناک وبا کی طرح اس قدر عام ہے کہ ہماری حکومتیں اس کی بدولت بے شمار منافع کماتی ہیں۔

امریکہ پر ابھی جنگ کا کوئی خاص دباؤ نہیں پڑا تھا۔ کہ یہاں پر پانچ بچوں کے بعد دو بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی اسقاط حمل کے عمل جراحی کی نذر ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر شہادت دیں گے کہ آج کل ہمارے ہاں نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ اس سنگین جرم، اس قتل عام کی کثرت کا تصور بھی محال ہے۔ آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہیں اور ادھر کوئی صاحب حمل گرانے کے عمل جراحی میں مصروف ہیں۔ وحشی نازی بھی یورپی بچوں کو اتنی تعداد میں ذبح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، جتنے کہ آج کل ہمارے ملکوں میں ہر سال چند طریقے سے ضائع کئے جا رہے ہیں۔

مزید برآں محکمہ شماریات حیات یعنی امریکہ کے محکمہ مردم شماری کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر ہالبرٹ ایل ڈون نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ امریکہ میں پیدا ہونے والے بارہ بچوں میں ایک بچہ ولد الحرام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سکول کے پہلے درجے میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار ایسے بچے داخل ہوتے ہیں جو اپنے باپوں کے نام نہیں بتا سکتے، ان میں سے قانوناً کسی کا کوئی باپ نہیں اور ان کا کوئی گھر نہیں۔ ان بچوں کو عمر بھر ندامت اور شرمندگی

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان بے گناہ معصوم بچوں کی فوج میں روز افزوں اضافے کا المیہ اتنا دردناک ہے کہ ڈاکٹر دُون ان بدنصیب بچوں کی پیدائش کے اندراجات کو سماج کی نگاہوں سے قانوناً خفیہ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، انہیں کوئی توقع نہیں کہ امریکی قوم بے باپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں کمی کر سکتی ہے۔

ہمارے ہاں اس قدر طلاقیں ہو رہی ہیں کہ لاکھوں عورتیں اور مرد کسی دوسرے عورت کے سابقہ خاوند یا کسی دوسرے مرد کی سابقہ بیوی سے شادی کئے ہوئے ہیں۔ بے شمار بچے زندہ ماؤں کی محبت سے محروم ہیں یا زندہ باپوں کی یہ بٹی ہوئی محبت ان کے لئے عذاب سے کم نہیں۔ حالانکہ کلیسا پہلے دن کی طرح آج بھی طلاق کا اسی سختی سے مخالف ہے۔ لیکن وہ طلاق کے واقعات کو کم کرنے سے قاصر رہا ہے۔ دوسری طرف قانون پیشہ حضرات قانون شادی کا احترام برقرار رکھنے کی غرض سے دن رات نرم اور آزاد قانونی طلاق کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

ادھر طبی تحقیقات جنسی اختلاط کو تمام جسمانی خطرات سے مبرا بنانے کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یعنی اس قسم کی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں۔ جن کے استعمال سے حمل ٹھہرنے یا بیماری لگنے کا خوف جاتا رہے گا۔ اور ان گنت ملاقاتیں کرنا ممکن ہو جائے گا۔

جنسی بیماری، شراب نوشی، اولاد حرام، اسقاط حمل، طلاق، جرائم، بچوں اور نوجوانوں کی خطاکاریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ایک ہیبت ناک اخلاقی بحران، ایک بدمعاشی کا بھوت ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہو رہا ہے۔

سیمنٹ کے فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں پر اٹھتی بیٹھتی اور سوتی تھیں۔ ان کے محافظوں میں کوئی عورت شامل نہ تھی۔

(۵) بچوں کی میعاد قید ایک سے تین مہینے تک تھی، انہیں کسی قسم کی عدالتی کارروائی کے بغیر جیل بھیج دیا گیا تھا، کیونکہ اس شہر میں بچوں کی عدالتیں نہ تھیں اور تعلقہ دار کو فی قیدی کے حساب سے روزانہ معاوضہ ملتا تھا۔

(۶) قصبوں اور بڑے شہروں کے قید خانوں کی یہی حالت تھی۔

امریکہ کی سب سے بڑی انسانی دولت اس کے تین کروڑ بچے ہیں۔ لیکن ان کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے؟ ان کی زبوں حالی کے متعلق جو کچھ عوام کو بتایا جاتا ہے وہ اس سے کہیں بُری صورت حال میں گرفتار ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں ٹین کی ایک خاتون جج اینا ایم کراس نے کہا کہ سرکاری عہدیدار بچوں کی جرائم کاری کے اعداد و شمار کو دانستہ کم تر دکھاتے ہیں۔ امریکہ میں نیویارک سٹیٹ کی عورتوں کے کلبوں کے وفاق کا تجزیہ کناڈا میں وہاں کی بارالیسوسی ایشن کے لئے مرتب شدہ میکر ڈر رپورٹ اور انگلستان میں دوران جنگ کی متعدد تحقیقات میں متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ بچوں میں جرائم اور بداخلاقی اس قدر عام ہے کہ صرف پولیس ہی کو اس کا صحیح علم ہے۔

لیکن محترمہ کراس کا کہنا ہے کہ "ہر ریاست کے دفاتر کی الماریاں گرد آلود تحقیقات سے اٹی پڑی ہیں۔"

میامی کی عدالت بچگاں کے جج والٹر بکھام کا قول ہے کہ انہوں نے گزشتہ سال کی نسبت ۵۰ فیصد زیادہ مقدمات جرائم کی سماعت کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان مقدمات کے دوران میں بعض ایسی مفلوک الحال پردیسی دوشیزاؤں کو دیکھا جو عصمت بیچ کر اپنا پیٹ پالنے پر مجبور تھیں اور عدالت انہیں گھر واپس جانے کے لئے ٹکٹ خرید دینے کی مجاز نہ تھی۔

امریکہ کے ایک فوجی افسر کرنل ہومر گریزن فرماتے ہیں کہ:-

"ہمارے ملک میں گزشتہ دو سال سے بچوں کے جرائم میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے"

انڈیانا پولس کے چیف جسٹس ذرا بلاغت سے فرماتے ہیں کہ:-

"میری پریشانیوں کا موجب صرف بچوں کی بڑھتی ہوئی جرائم کاریاں ہی نہیں بلکہ ان کے مقابلے میں ہمارا عجز بھی ہے"

عجز یا پریشانی جسٹس صاحب؟

اب ہم امریکہ کے صاحب اختیار حضرات کی رایوں اور نظریوں کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک ہائی سکول کے پرنسپل رالف سی سمتھ کو لیجئے جنہیں روٹری کلب نے اظہار خیال کے لئے مدعو کیا تھا۔ انہوں نے "رایا کہ" میں نے نوجوانوں میں پندرہ سال گزارے ہیں۔ اس اثنا میں مجھے ایک بھی لڑکی یا لڑکا ایسا نہیں ملا۔ جسے پیدائشی بدکردار کہا جا سکے"

لیکن میں نے بہت سے بچوں کو مصیبت میں مبتلا پایا۔ ان کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے ان کے گھروں، سکولوں، کلیساؤں، برادریوں یا ان سب کو ان کی مصیبتوں کا ذمہ دار پایا ہے"

قومی رضاکار اور پولیس اس حقیقت سے ایک مدت سے آشنا ہے۔ شراب خوری کے مسئلے کی طرح یہاں بھی ہمیں ایک سطحی قسم کا ترقی پسند نظریہ ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ "بچوں کی گمراہی کا ذمہ دار سماج ہے" تاہم جو لوگ مسٹر سمتھ کے زاویہ نگاہ کے حامی ہیں۔ وہ ایک خاص محدود حلقہ اثر سے باہر عملاً کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ سمتھ صاحب کے بیان میں ایک طویل سوال نامہ شامل ہے، جس کی رو سے روٹیرین حضرات اپنی برادریوں کی بے بسی اور ناکامی کے مفروضے قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ردعمل منفی اثرات کا حامل ہوگا۔ کیونکہ یہ سوال نامہ خود سماج کی ایک

سطحی اور بہانہ جو قسم کی مذمت ہے۔

آخر ہم اپنے گھروں، سکولوں، کلیساؤں اور برادریوں کا کیا کریں؟ بعض لوگ فوراً بچوں کی عدالتوں کی اصلاح کی تجویز پیش کریں گے اور ڈاکٹر لوگ بچوں کے معیار صحت کی طرف اشارہ کریں گے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ نفسیاتی رہنمائی کے ذریعے بچوں کی امداد کی جائے۔ مسٹر سمتھ پولیس عدالتی نظام، بے روزگاری اور بہت سے دوسرے عوامل کا ذکر کرنا بھول گئے۔ جنہیں وقتاً فوقتاً "بچوں کی جرائم کاری کا مرکز ٹھہرایا گیا ہے۔

انہی سامعین یعنی رد ٹری کلب کے اراکین کو ایک مرتبہ امریکہ کے تحقیقات جرائم کے وفاقی ادارے (ایف، بی، آئی) کے افسر اعلیٰ جے ایڈگر ہوور کے خیالات سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ان کے الفاظ سن کر حاضرین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ "امریکہ میں جرائم کی موجودہ صورت حال خاموش آتش فشاں کی تہ میں کھولتے ہوئے گندھک کے لاوے سے ملتی ہے"۔

۱۹۳۸ء میں امریکہ میں انگلستان کے مقابلے میں گیارہ گنا زیادہ لوگوں نے جرائم کا ارتکاب کیا ۱۹۴۳ء میں ۱۳ لاکھ سنگین جرائم کا ارتکاب ہوا، جن میں ہر تیسرے منٹ کے بعد ایک قتل کی واردات بھی شامل ہے۔ ایف، بی، آئی کے رجسٹروں میں چھ کروڑ امریکی جرائم پیشہ لوگوں کے نام درج تھے جنگ کے بعد سے کمسن لڑکیوں میں جرائم کی شرح ۳۰ فیصد (تقریباً ڈیوڑھی زیادہ) ہو گئی۔

مسٹر ہوور نے بچوں کے جرائم کے ذمہ دار اداروں یعنی گھروں، کلیساؤں، سکولوں وغیرہ کی فہرست پر سے جلدی جلدی گزر گئے اور اس فہرست میں بزنس و تجارت کا اضافہ کیا۔ انہوں نے مبہم سا اشارہ کیا کہ جو لوگ جرائم کی طرف مائل ہیں۔ ان پر تاجر پیشہ لوگوں کی خاص عنایت ہے۔ انہوں نے جو اعداد و شمار دیئے ہیں۔ وہ آخری اعشاریہ تک درست ہیں۔ لیکن ان کے تعمیری منصوبے مسٹر سمتھ کی تجویزوں کی طرح مبہم ہیں۔

بوسٹن کی عدالت بچگان کے جج جے ایف پرکنس نے جریدہ "کرسچن سائنس مانیٹر" کے ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ء کے شمارے میں ایک اور ہی نقطہ نظر پیش کیا، انہوں نے قوم کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے فرمایا۔

"بچے ازل سے جرم کرتے آئے ہیں اور ابد تک کرتے ہی رہیں گے"

پولیس کی ناقابل تردید تحریری شہادتوں کے سامنے اس قسم کی دلیلیں اتنی مضحکہ آمیز اور لچر ہیں کہ فاضل جج کے باقی ماندہ تبصرے کو ردی کی ٹوکری میں اٹھا پھینکنا مناسب ہے تاہم اس میں عقل سلیم کی تھوڑی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ فاضل جج نے امریکہ کی جنگی مساعی کی تعریف کی اور غیر منطقی طریقے سے نتیجہ نکالا کہ "جو تحریک اس قدر کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔ وہ فی الواقعہ ایک عجیب اور اعلیٰ شے ہے۔ اس کے بعد فاضل جج ہٹلر کی شاندار فوجی فتوحات کے بارے میں رائے زنی کر کے آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں وہ ان فتوحات کی پیدا کردہ تباہی، بدحالی اور نتیجۃً جرائم کی کثرت کا ذکر نہیں کرتے اور سیدھے اپنے مقالے کے مرکزی خیال تک جا پہنچتے ہیں کہ "ہم سماج کو بناتے ہیں یا سماج ہمیں"؟

اگرچہ اس سوال کے دونوں حصے درست ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزم ہیں۔ لیکن فاضل جج کا خیال ہے کہ سماج کو ہم ہی بناتے ہیں۔ جدید عمرانی نظریے کو نوٹ مرڈر کر وہ ایک نئی ترکیب "فلسفہ معافی" ایجاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم بدراہ بچوں کو حد سے زیادہ نرمی کے ساتھ معاف کرتے آئے ہیں اور انہیں بتاتے آئے ہیں کہ وہ بذات خود جرائم کے ذمہ دار نہیں بلکہ کلیسا، گھر اور سکول برابر کے مجرم ہیں۔ یہ ہے ان کا بنیادی دعویٰ، ظاہر ہے کہ وہ اپنی اصل نیت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ان کا زاویہ نگاہ ہمیں براہ راست قرونِ وسطیٰ کے انفرادی ذمہ داری کے اصول کی طرف لے جاتا ہے اور یہ ایک نظریہ ہے جسے ہر ایماندار سائنسدان غلط ٹھہرا چکا ہے۔

اگرچہ فاضل جج پرکنس اپنے نقطۂ نظر کو موثر بنانے میں قاصر رہے ہیں۔ تاہم ان کی بات تو توجہ طلب ہے، گمراہ بچے کو صرف یہ بتا دینے سے کہ اس کی بدحالی کا ذمہ دار سماج ہے۔ کچھ حاصل نہیں ہوتا، الٹا بدراہ بچے کے دماغ میں تباہ کن، احساس کہتری پیدا ہو جاتا ہے۔ فاضل جج کا مقولہ درست سہی، لیکن حیرانی کی بات ہے کہ وہ ایک کھلی حقیقت سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں جس سے ہزاروں رضاکار بخوبی آگاہ ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ جرائم کی ذمہ داری سماج پر تو ہے، لیکن سماج کو بدلنے کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا۔

جنگ کے دوران میں صحت اور تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے پیسپر کی ذیلی کمیٹی مقرر ہوئی تھی، اس کمیٹی نے ۱۹۴۴ء میں امریکی پارلیمان کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں نہایت سنجیدگی سے بچوں کے جرائم کا تجزیہ کیا گیا۔ اپنے تجزیے کے دوران میں اس کمیٹی نے ان لوگوں کی شہادتیں قلمبند کیں جو بچوں کی تربیت، تحفظ، تعلیم، تفریح، مذہب، قانون محنت، صنعت اور دوسرے اداروں کے ذمہ دار ارکان تھے۔ اس کمیٹی کی معلومات کا خلاصہ یہ ہے

(۱) سنسنی خیز خبروں سے قطع نظر صورت حال واقعی بہت نازک ہے۔

(۲) بچوں کے جرائم میں جنگ سے کچھ عرصہ پہلے ہی اضافہ شروع ہو گیا تھا اور جنگ کے دوران میں چند علاقوں کے سوا کہیں بھی کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

(۳) شماریات قابل اعتماد نہیں۔ کیونکہ اعداد و شمار جمع کرنے کے طریقے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

(۴) جرائم کے مختلف محرکات میں سے کسی ایک کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

(۵) جو مائیں جنگی اسامیوں پر متعین ہیں وہ جرائم میں اضافے کا باعث نہیں بنیں۔ محنت کش ماؤں کی مذمت کرنے والے بیانات غیر ذمہ دارانہ ہیں۔

پیپر کی ذیلی کمیٹی کو شیلڈون اور ایلینر گلیوک کی اہم تصنیف "ایک ہزار جرائم کار بچے" میں جرائم کے قابل اعتماد حقائق دستیاب ہوئے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) بچے عام طور سے نو سال سات ماہ کی اوسط عمر میں جرم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

(۲) جرائم کار بچوں کی تقریباً نصف تعداد صحیح الذہن ہوتی ہے۔ تیرہ فیصد کند ذہن اور سترہ فیصد تقریباً ناکارہ ہوتے ہیں۔

(۳) ۸۵ فیصد بچوں کا چلن سکولوں ہی میں قابل مواخذہ تھا۔

(۴) اتنے ہی بچے یعنی ۸۵ فیصد بچے شہر کے گنجان آباد اور غلیظ علاقوں میں رہتے ہیں۔

(۵) اتنے ہی یعنی ۸۵ فیصد بچوں کے خاندانوں کے بزرگ اراکین جرائم پیشہ تھے۔

(۶) ۷۶ فیصد جرائم کار بچوں کا تعلق افلاس زدہ گھرانوں سے ہے۔

یہ سائنسی حقائق تشریح طلب نہیں۔ بچوں کی جرائم کاری کا واحد سبب سماجی خرابیاں ہیں یہ خرابیاں پراسرار، فلسفیانہ یا انفرادی نہیں بلکہ عام فہم اجتماعی خرابیاں ہیں۔ مثلاً قلیل آمدنی، گنجان و غلیظ ماحول کے اثرات، غیر سائنسی طریقہ تعلیم، بچے کی جسمانی اور دماغی بہبود سے مجرمانہ غفلت وغیرہ۔

پیپر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا "تمام گواہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچوں کی جرائم کاری کی روک تھام کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم حفظ ماتقدم کے اصولوں پر کاربند ہوں۔ جو چیز بچے کے لئے مفید ہے وہی عام طور سے انسداد جرائم کے لئے بھی مفید ہے۔ کوئی بچہ محبت اور شفقت سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لئے ایک ایسا گھر ہونا چاہیے جہاں اس کی عمدہ دیکھ بھال اور خوراک و لباس کا مناسب بندوبست ہو اور جہاں اس میں ایسے خیالات و عادات اور اخلاق کی نشوونما ہو جو ایک اچھے شہری بننے کے لئے ضروری ہیں

محلوں میں طبی امداد و نگہداشت کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے، جس کا خرچ کسی خاندان کے مقدور سے باہر نہیں ہونا چاہیئے۔ محلے کے پاس ہی ایسے سکول ہونے چاہئیں، جن میں نئی دنیا کے تقاضوں کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت ہو سکے۔ مذہبی اور برادری کے اداروں اور نوجوانوں کی تنظیموں تک ہر بچے کی رسائی ہونی چاہیئے جہاں وہ دوسرے بچوں کے ساتھ عبادت یا کھیل کود اور تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے، اگر کوئی بچہ یا اس کا گھرانا ایسی مشکلات میں پھنس جائے جسے وہ اکیلا دور کرنے سے معذور ہو تو اس کی مدد کے لئے تجربہ کار ماہرین موجود ہوں۔ اسے ہم مختصراً امریکی بچوں کے بنیادی حقوق کا چارٹر کہہ سکتے ہیں"۔

آج تک ہماری نظر سے بچے کی سماجی حیثیت کے متعلق اس سے بہتر بیان نہیں گزرا۔ جرائم اطفال کے مسئلے کے متعلق اکثر جائزوں میں جو لفظی گورکھ دھندا پایا جاتا ہے۔ مذکورہ رپورٹ اس سے مبرا ہے، کیونکہ یہ رپورٹ ہمیں سیدھے سادے چند الفاظ میں اس اہم بنیادی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ "بچے بھی انسان ہیں وہ اس ماحول کی پیداوار ہیں جس میں وہ رہتے ہیں اور وہ ماحول خود سماج ہے"۔

چونکہ کمیٹی کے ارکان سے جن لوگوں نے ملاقات کی تھی ان میں سے ہر ایک نے پرزور درخواست کی تھی کہ بچوں کے جرائم کے مسئلے میں ان کی رہنمائی اور امداد کی جائے اس لئے اس کمیٹی نے تجویز پیش کی کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور بچوں کی ضروریات ..... کے لئے قومی پیمانے پر نشر و اشاعت اور تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔ تمام نجی، ریاستی، وفاقی اور مقامی اداروں میں اشتراک عمل پیدا کرنے کے لئے ایک مرکز قائم کیا جائے۔

دوسری جمہوریتوں میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ بچوں کے جرائم کے متعلق جو بین الاقوامی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ ان میں کناڈا کو بہت سراہا جاتا ہے کیونکہ وہاں

جرائم اطفال کے متعلق ایک قومی قانون نافذ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف ۵ ۴ فیصد کناڈی بچے اس قانون سے متاثر ہوتے ہیں۔ مستعرہ کناڈا میں نظر بندی کی سہولتوں میں حیرتناک ناہمواری پائی جاتی ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں ایک ہی جرم کی سزائیں تبسم آمیز سرزنش سے لے کر کسی اصلاح گاہ میں تین سال کی نظر بندی تک کا فرق ہو سکتا ہے۔ تمام جمہوریت پسند اقوام میں زنانہ پولیس، مشیروں اور حوالات کی عدم موجودگی کے ساتھ عقل سلیم کا بھی فقدان ہے۔ بچوں کی جرائم کاری کی تحقیق و تفتیش کرائی جاتی ہے اور پس، رضاکاروں کی تربیت اور ماہرین سے صلاح و مشورہ کا کام ایک پشت سے جاری ہے۔ اس کے باوجود بچوں کے جرائم میں کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔

ہمارے خطاکار بچوں کی اکثریت عدالت میں پیش ہوتے وقت صدر منصف کی رحم دلی یا مزاج پسندی کے علاوہ ہر قسم کی قانونی امداد اور تحفظ سے محروم ہے۔ مقدمے کی سماعت اور سزایابی کے بعد بچوں کے ساتھ جو کچھ گذرتی ہے وہ صرف قیاس کا معاملہ ہے۔

عوام کو تو سرے سے علم ہی نہیں کہ سزا بھگتنے والے بچوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اصل مجرموں یعنی بچوں کو جرائم پر اکسانے والے لوگوں کو شاید ہی کبھی سزا ہوئی ہو۔ بچوں کو جو سزا دی جاتی ہے یا اس کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی تسلی بخش جواز پیش نہیں کیا جاتا۔ جو بچے جنسی بے راہروی میں ماخوذ ہیں ان میں سے کسی کو جنسی حقائق کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

اس کتاب میں جتنے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں ان کے حل کے لئے جنسی بیماری اور جنسی تعلقات کی صحیح تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کمبوڈیا یونیورسٹی کے سابق پروفیسر حیاتیات ڈاکٹر مورکیس اے بالجلو نے

ہمارا نادیہ نگاہ سوویت یونین کے نقطۂ نظر سے اس قدر متضاد ہے کہ بے حد مایوسی ہوتی ہے۔ یہ پہلی تاریخی مثال ہے کہ سوویت روس میں عام اور بے شمار لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ گناہ کسی مافوق الفطرت ہستی یعنی شیطان یا اہرمن کی تحریک نہیں، بلکہ یہ ایک سماجی برائی ہے۔ جس کا ازالہ محض ٹھوس، عقلی اور سائنسی طریقوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ سوویت یونین کے باشندوں نے بدکاری اور بدمعاشی کی بدترین صورتوں پر سائنسی اصولوں کی مدد سے بے نظیر فتح حاصل کی ہے۔ روئے زمین پر صرف اہل روس ہی ایک ایسی قوم ہیں جن میں عصمت فروشی کا نام و نشان تک نہیں انہوں نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جسے ہمارے ہاں کے فلسفی، پادری اور ڈاکٹر ابھی تک ناممکن الحصول خیال کرتے ہیں۔

دنیا کے کسی اور ملک میں قید خانے اور اصلاح گاہیں بند نہیں ہو رہیں۔ صرف سوویت یونین ہی ایک ایسی سرزمین ہے۔ جہاں قید خانے کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں حمل ضائع کرنے کے عمل جراحی سے واقع ہونے والی اموات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ جہاں طلاق کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔ جہاں خاندان اور ازدواجی زندگی اس قدر قابل احترام ہے کہ بہترین ماؤں کو اعلیٰ سے اعلیٰ اعزاز دیئے جاتے ہیں اور جہاں دماغی اور جسمانی صحت کا معیار اس قدر بلند ہے کہ شراب طبی نادرات میں شامل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کی فروخت پر کوئی پابندی نہیں۔

اس فرق کو نمایاں کرنے سے ہمارا مقصد سوویت یونین کا پروپیگنڈا ہرگز نہیں یہ تو ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ ہمیں کم از کم اپنے آپ سے ایمانداری کے ساتھ سوال ضرور کرنا چاہیئے کہ یہ تفوق ہمیں اور ہمارے ملکوں کو کیا سبق سکھا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کے خیال میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اپنے ہاں کی بدکاری سے گھبرانا اور مایوس نہیں ہونا چاہیئے، اگر اہل روس کرامات کے بغیر ہی صرف عمل سائنس ہی کی مدد سے اور تمام نیک نیت لوگوں کو شرافت اور صحت کا معیار بلند کرنے کی ترغیب دے کر بدترین اخلاقی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو ہم کیوں نہیں ہو سکتے؟ کیا ہم اس قدر گر چکے ہیں کہ معاشرتی بوسیدگی کو خوش آمدید کہیں۔

بعض دوسرے لوگ سنجیدگی یا دبی زبان سے کہتے ہیں کہ اب ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ سویت یونین سے تہذیب اخلاق کا سبق سیکھیں۔ یہ زاویہ نگاہ زمانہ مابعد جنگ کے اتحاد و اشتراک سے تعلق رکھتا ہے اور ایسے سیاسی لیڈروں نے اس پر غور تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جنہوں نے گذشتہ بیس برس کے عرصے میں بے شمار تقریریں "بد اخلاق سرخوں" کی لعنت ملامت کے لئے وقف کی ہیں۔ اس تجزیہ کا ردِ عمل عام طور سے خفگی یا مسکراہٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ آخر "مادہ پرست روس" سے نیکی کا سبق سیکھنے کا خیال ہمارے لئے کس قدر قابل قبول ہو سکتا ہے؟

لیکن اس معاملے کو زیادہ دیر کے لئے محض خفگی سے ٹالا نہیں جا سکتا اور اکثر حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہمارے جمہوری نظام (سرمایہ دارانہ جمہوریت) پر ایک موٹا سا اخلاقی استفہامیہ ابھر آیا ہے۔ انگریزی جریدہ "کیتھولک ریکارڈ" کے ایڈیٹر اور مشہور کیتھولک مفکر کونٹنٹ میکائیل ڈی لابدومیر کے الفاظ قابلِ غور ہیں:۔

"وہ سوال کرتے ہیں "کہ موجودہ زمانے کے بے پایاں بحران کے مقابل آج عیسائیت کس قدر کی ہے؟" اور بڑی بے چینی سے جواب دیتے ہیں "کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح نئے سپنے دیکھنے چاہئیں اور نئی امیدیں جگانا چاہئیں۔" اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ "عیسائیت مطلوبہ جذبہ پیدا نہ کر سکی تو اشتراکیت

(کمیونزم) کا طوفان عوام کو بہا کر لے جائے گا۔ ماسکو کا مقناطیسی مینار روم یا کنٹربری کی برجیوں سے بہت زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہا ہے۔"

ایک حیران کن اعتراف! لیکن بدقسمتی سے کونٹ میکائیل یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ لوگ ہمارے اشتراکی اتحاد کی طرف اس قدر راز جو نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ شاید وہ ہمیں تائل کریں کہ اشتراکی روس میں کشش کے موجب صرف سیاسی اور معاشی محرکات ہیں۔ یعنی لوگ اس لئے روس سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہاں سے بے روزگاری دور ہو چکی ہے یا وہاں کی حکومت کی باگ ڈور محنت کش لوگوں یعنی مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ بالکل بجا کہ مزدور اور درمیانہ طبقے کے بے شمار لوگ جنہوں نے معاشی بحران کے دوران میں سخت مصیبتیں اٹھائیں۔ سوویت یونین سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں جنگ کے آغاز تک مسلسل خوشحالی کا دور دورہ تھا اور اب امن کی فتح کے بعد وہاں غیر محدود معاشی ترقی کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں اور وہاں کوئی طفیلی یا مسرف نہیں۔

آیئے ہم بھی ایک اشتراکی ادیب میکسم گورکی کے قول سے مستفیض ہوں کیونکہ اس میں مسرفوں سے متعلق اشتراکی نقطۂ نظر کو پوری صفائی اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "مسرف کا لفظ کوئی گالی نہیں، یہ اس شخص کی اصلی تعریف ہے جس کی زندگی ہمہ اسراف ہے۔ ہمارے سوشلسٹ سماج میں مسرف ایک ایسا جانور ہے جس میں پرانے نظام کے متعدی امراض، حسد اور لالچ اس طرح گھر کر چکے ہیں کہ علاج ممکن نہیں، اسراف پسند شخص کے اصل الاصول، اس کے ایمان اور اس کی روحانی زندگی کو دو سادہ لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "مجھے تو اپنا پیٹ بھرنا ہے" اس کے لئے یہ دنیا ایک ایسا مقام ہے جہاں صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے جیتے ہیں اور وہ اپنا پیٹ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ خوراک

اور زیادہ سے زیادہ لذیذ خوراک سے بھرنا چاہیئے۔ اس کی تمام تر قوتِ ارادی، اس کا دماغ اور اس کا ہر وصف، جسے وہ روحانی جذبہ کہتا ہے۔ صرف اسی حیوانی مقصد کی طرف مائل ہے"

یہ ہے ایک عظیم ادیب کی نشتر آمیز تنقید، ناشی ایجنٹوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے گورکی نے ایک اور واضح اور اہم بات کہی اور وہ یہ ہے :۔

"سرمایہ دار دنیا اور ہماری سوشلسٹ دنیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارا نظریہ اور معاشی عمل انسان کے ہاتھوں انسان کی لوٹ کھسوٹ کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔ اور لوگوں کو قدرت کی نعمتوں کے تصویبی، جائز استعمال کی تربیت دیتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری زندہ ہی انسانی لوٹ کھسوٹ پر ہے۔ اور یہ آدمی کو عموماً نفع اندوزی کی ہوس کی تسکین اور قوتِ زر کا جواز کا ادنیٰ آلہ سمجھتی ہے۔"

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا معاشرتی نظام، یعنی سرمایہ دارانہ جمہوریت سونے کی طاقت پر قائم ہے۔ جس چیز کو ہم آزاد کاروبار یا تجارت کہتے ہیں۔ یا ہمارا نظام منافع صرف اس آدمی کی قدر کرتا ہے جو اپنے ہم جنس، ہم پیشہ آدمی کے مقابلے میں دوسروں کو نقصان پہنچا کر ذاتی نفع حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں آگے نکل جائے۔ ہمارے نظام نے ماضی میں ان لوگوں کو بے حد فائدہ پہنچایا ہے جو قدرتاً یا ارادتاً نہایت شگدلی سے تجارتی مقابلے کے لئے مسلح رہے اور ایسے مردوں اور عورتوں کو جنہوں نے سب سے زیادہ محنت کی اور ہمارے معاشرے کی مادی اور تہذیبی اقدار پیدا کیں۔ ان کی بھاری اکثریت کو عموماً بہت ہی کم معاوضہ ملا، دوسری طرف مٹھی بھر لوگ جنگ اور ہولناک بحران میں بھی انتہائی عیاشی میں مصروف رہے۔

کونٹ میکائیل کو یہ جاننے کے لئے کہ ہمارے عوام سوویت یونین سے کیوں

ہمدردی رکھتے ہیں، صرف اس تضاد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اپنے آباؤ اجداد کی طرح ہمیں بھی بچپن سے یہی سکھایا گیا ہے کہ زندگی میں کامیابی کا معیار دولت کا ذخیرہ اور زندگی کو سونے کے دیوتا کی پرستش کے لئے وقف کر دینا ہے۔ ہمارے سماج میں مہربانی، خدمتِ خلق، جہادِ نفس، ایمانداری، ہم جنسوں سے محبت اور اسی قسم کے دوسرے نیک جذبے نایاب ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خوبیاں تمام تر انہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں جن سے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر طرح سے ناداریں

ہم ہر اتوار کو یسوع مسیح کا پیغام پڑھتے ہیں کہ "ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا ممکن ہے لیکن امیر آدمی کا خدا کی بادشاہت میں گزرنا ممکن نہیں"

شاید یہ نصیحت پرانے فیشن میں شامل ہو گئی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہفتہ بھر دولت کی قابلِ رشک پوجا ہوتی ہے اور خدا کی بادشاہت، اتوار کے دن بھی کسی امیر آدمی کے بارے میں متفکر نظر آتی ہے۔ ہمارے تمام صنعتی رہنما، اکثر سیاستدان اور بہت سے پادری خود یسوع مسیح کے فرمان کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور دولت سمیٹنے کی دوڑ دھوپ میں بے محابہ مصروف رہتے ہیں اور جو لوگ اس ہوسناک جدوجہد کے اخلاقی جواز پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کی سخت مذمت کی جاتی ہے۔

ہم نے سرمایہ داری نظام پر تمام قسم کی معاشی ناکامیوں، معاشی وباؤں، بحران، فاقے، غلاظت، آفرینی، بدپروری، بیماری، ناشیستہ اور جنگ کا الزام بار بار لگتے سنا ہے اور کچھ نہیں کیا۔ لیکن سوویت یونین کے لوگوں نے ایک پشت پہلے سرمایہ داری کو ختم کر دیا۔ کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ سرمایہ داری نہ صرف مادی مسائل پیدا کرتی ہے، بلکہ وہ بداخلاقی اور بدمعاشی کو بھی سماج میں

برداشت کرتی ہے۔ وہ بدکاری کا بیج بوتی ہے اور گناہ کے پودے کی پرورش کرتی ہے۔ اس حقیقت کا اطلاق دوسرے ملکوں پر ہو یا نہ ہو، لیکن سوویت یونین کے لوگوں نے بےنظیر کامیابی سے ثابت کر دیا کہ ہم نے اپنے سماج کو اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے خود اپنے کردار اور سیرت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر لی اور نئے سماجی نظام نے زندگی کے ایک نئے اخلاقی نظام کو جنم دیا۔

آج کل، زمانہ مابعد جنگ میں ہمارے ملکوں میں نئے شہر اور کارخانے تعمیر کرنے کے لئے فنی منصوبوں کی بڑی دھوم دھام سے تیاری ہو رہی ہے۔ ان تمام منصوبوں میں اور ان کے متعلق تمام قیمتی اشتہاروں میں لفظ اخلاق ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ اپنے طرز زندگی کے تحفظ و استحکام اور اس کی لامحدود ترقی کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن اخلاقیات کے متعلق یکسر خاموشی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم عصمت فروشی کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ اسے پلاسٹک کے محلوں میں بٹھا کر اس کی سج دھج میں چار چاند لگانا چاہتے ہیں۔ کیا ہم آسمانی شاہراہوں اور فضائی مستقروں کے ساتھ مافوق الفطرت مجرمین بھی پیدا کریں گے؟ کیا ہماری طبی تحقیقات کے عجوبے دواگھروں کے ان بنڈلوں کی سطح پر آجائیں گے؟ جنہیں ضبط تولید اور انسداد مرض کے لئے فروخت کیا جاتا ہے؟

تسلیم کہ ہم، شمالی امریکہ والوں نے سرمایہ دارانہ نظام سے فائدہ اٹھا کر تاریخ میں ایک انتہائی مال دار تہذیب کو تعمیر کیا ہے۔ ہم بڑے فخر سے دعوے کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس دنیا بھر میں سب

سے زیادہ کاریں، بلند ترین عمارتیں، برق رفتار ٹرینیں، براق روشنیاں، نفیس ترین ساز و سامان ہے۔ قصہ کوتاہ ہمارے ہاں کی ہر شے عظیم ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ بد اخلاق بچے، سب سے زیادہ حرام کے بچے، دنیا بھر میں سب سے زیادہ طلاقیں اور آتشک کے ہسپتال ہیں۔

لیکن یسوع مسیح فرماتے ہیں کہ "انسان تمام دنیا کو حاصل کرلے، مگر وہ اپنی روح کو ضائع کردے۔ تو اسے کونسا نفع ہوا؟"

زیر بحث مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ تو نہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ گزشتہ دنوں چند لوگوں نے بے اندازہ دولت جمع کرلی، اور دوسری لاکھوں انسان افلاس بیماری، بدکاری، بدمعاشی اور جرائم کے سبب تباہ ہوتے رہے۔ ہم تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ اس "عوامی دنیا" میں، جس کے لئے ہمارے نوجوانوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، معاملات کو نئے ڈھب سے ترتیب دیں۔ اور یہ خیال عام ہے کہ جس طرح "آزاد کاروبار" کو جنگ کے دوران میں جنگی مسائل کے لئے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح آئندہ پرامن تعمیر کے لئے سامان بہم پہنچانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ ہمارے ہاں اکثریت اس امر کی قائل ہے کہ تدریجی پابندی اور ترمیم کے ساتھ سرمایہ داری اب بھی کسی اور نظام حیات سے افضل ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہمارے نظام منافع کا استحکام یا زوال آئندہ چند سالوں میں اس امر پر ہے کہ یہ نظام تمام لوگوں کو کافی کام، خوراک و رہائش، لباس اور صحت کے ذرائع مہیا کرنے میں کامیاب رہتا ہے یا ناکام۔

معاشیات کا یہ کھلا چیلنج ہے اور تمام سنجیدہ لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے ہم نے اپنی جمہوریت کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی اہم ضرورت کو تو محسوس کیا ہے کہ اس میں ہر خواہش مند شخص، بالخصوص ہر عورت، لڑکی اور نوجوان لڑکے کی مستقل اور مکمل ملازمت کا انتظام ہو سکے۔ لیکن ہم نے اس اہم ضرورت کو اس نقطۂ نظر سے کبھی نہیں دیکھا کہ یہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی امید ہے۔

تمام مذہبی اور سیاسی معاملات سے قطع نظر، سوویت یونین نے تجربے سے ثابت کر دیا ہے کہ "جدید معاشرے میں لوگوں کی نجات یعنی منظم بدمعاشی، بدکاری، ناجائز جنسی اختلاط، اسقاط حمل، مکسی کے جرائم، کنبے کی تباہی اور شراب کی بدعادت سے لوگوں کی خلاصی، اسی وقت ممکن ہے۔ جب پیروزگاری اور افلاس کو دور کرنے کے ساتھ ہی بدکاری سے حصول منفعت کی لعنت کو بھی ختم کر دیا جائے۔"

لیکن ہمارے اکثر رہنماؤں کا طریق فکر سائنسی اور استدلالی نہیں ہے کٹر عصبیت پرست لیڈر تو یہ ثابت کرنے کے لئے بے شمار اس کی گھڑ لائیں گے کہ روس میں بدی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ ہمارے ہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ دلیل درست ہے تو اسے ہمارے لئے اور ہمارے معاشرے کے لئے نیک شگون نہیں ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ مقتدر حضرات کی خود فریبی اور جھوٹی تسلیوں کے باوجود لوگ خود یہ سوال اٹھانے والے ہیں کہ "گناہ کے متعلق ہمارا کیا منصوبہ ہے؟"

آپ صاحب اولاد ہیں۔ تو آپ اپنے من سے یہ سوال پہلے ہی

بوجھ چکے ہوں گے، اپنی پانچ سال کی معصوم بچی کو سوتے دیکھ کر آپ نے کبھی نہ کبھی یہ سوچا ہوگا کہ زندگی اسے چودہ سال کی عمر میں کیا سکھانے والی ہے تو آپ کلیجہ تھام کر رہ گئے ہوں گے۔ آپ کا نوکر لڑکا جو ابھی ابھی گھر واپس لوٹا ہے وہ اب اخلاق کے متعلق کیا سوچتا ہے کیا یہ ٹھیک نہیں کہ اب وہ اخلاق کو محض مذاق سمجھنے لگا ہے!

یہی حال دوسرے بے شمار بچوں کا ہے۔ اور اسی طرح ایک گھرانے کی پریشانیاں لاکھوں خاندانوں کی پریشانیاں ہیں۔ اب آپ اندازہ لگائیے تو معلوم ہوگا کہ گناہ کا تعلق ذات سے نہیں، بلکہ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے اور شاید ان مسئلوں میں سے سب سے بڑا مسئلہ ہے جن سے ہماری قوم دوچار ہونے والی ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے اہل روس کو بھی ہو بہو اسی قسم کے اخلاقی بحران کا سامنا تھا۔ لیکن روس کے نوجوان بداخلاقی کے خلاف ایک ایسا پرچم لے کر بازاروں میں نکل آئے جسے آج تک کسی نے تیار کرنے اور اٹھانے کی جرأت نہیں کی انہوں نے اس پرچم کے ذریعے اعلان کیا کہ "ہم سائنسی اصولوں کے مطابق نسلِ انسانی کی اصلاح کریں گے"! اشتراکی سائنسدانوں نے دعویٰ کیا کہ:-

(۱) سماج میں بدکاری اور شراب نوشی عام ہو تو گناہ ذاتی معاملہ نہیں رہتا بلکہ اس کی ذمہ داری عین اسی طرح قوم پر عاید ہوتی ہے جس طرح تپ محرقہ ہذیانی یا گلے وغیرہ کی وبائی بیماریوں کی۔

(۲) تاریخ ثابت کرتی ہے کہ لوگوں کو قوانین یا مذہب کے ذریعے نیک بننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) لوگ گناہ کیوں کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان حالات اور ماحول

ملتا ہے۔ جس میں عوام رہتے ہیں۔ یعنی سماج کے لئے لوگوں کے مضرت رساں رویے کے بڑے اسباب، افلاس اور بے روزگاری ہیں۔

(۴) جنسی بد اخلاقی صرف ایسے اقدامات کے ذریعے دور کی جا سکتی ہے جن سے دائمی محبت کی قوت کو آزاد کر دیا جائے۔ اور ایسی محبت صرف حقیقی شادی اور ازدواجی زندگی میں نصیب ہو سکتی ہیں۔

(۵) اخلاق مسلسل بدلتے آئے ہیں۔ انسان فطرتاً شر پسند نہیں۔ بدی کو اس وقت ختم کیا جا سکتا ہے جبکہ لیڈروں سمیت تمام قوم ذاتی مفاد کے لئے دوسرے لوگوں کو پاؤں تلے کچلنے کی بجائے کسی ارفع اور صالح مقصد میں ایمان رکھتے ہوئے زندگی کو سب کے لئے برابر کی خوشگوار بنانے کی جدوجہد کریں۔

اس سائنسی اصول کی بنا پر، جو یسوع مسیح کے تعلیمات سے حیران کن مشابہت رکھتا ہے۔ سوویت اخلاقیات کا محل تعمیر کیا گیا ہے ہمیں یقین ہے کہ آئندہ زمانے میں اشتراکی اخلاقیات کا شہرہ بڑی شد و مد سے سننے میں آئے گا۔ اور ہم خود اس کا ذکر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جو گمراہ اور بد نصیب لوگ سوویت یونین کے لوگوں سے نفرت اور حسد کرتے ہیں۔ ان کے لئے ہر ایسے شخص پر "سرخے" کا لیبل چپکانا مشکل ہونے والا ہے۔ جو اشتراکیت کی گناہ پر فتح سے متاثر ہوگا۔ آخر جنسی بد اخلاقی ایک غیر سیاسی مسئلہ ہے اور کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ یہ خیال کرے کہ روس والوں نے محض ہمیں چڑانے یا محض سرمایہ داری کو پریشان کرنے کے لئے لاتعداد عوام کی تہذیب اخلاق کی ہے۔ اب کسی قسم کا پروپیگنڈا بھی جھوٹے اخلاق کی تعلیم یا سچے اخلاق کی تکذیب میں زیادہ عرصے کے لئے کامیاب

نہیں ہو سکتا۔ کسی نظامِ اخلاق کا عروج و زوال اس بات پر ہے کہ اس سے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ ہمارا نظامِ اخلاق یا بے اخلاقی، لوگوں کو تاریک اور عمیق غار کے لب پر لے آیا ہے۔ وہ متزلزل ہے۔ لیکن سہارا دینے والی چیز ابھی تک ناپید ہے۔ سوویت یونین کے نئے نظامِ اخلاق نے لوگوں کی فطرتوں کو بدل دیا ہے۔

ہم ان حقائق سے گریز نہیں کر سکتے اور کریں بھی کیوں؟ جب کہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اگر تاریخ میں کبھی ایسے لوگوں اور قوموں کا پتہ ملتا ہے جنہوں نے بے اطمینانی کے عالم سے بیزار ہو کر شیطان کے ساتھ سودا بازی کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ تو یقیناً وہ لوگ ہم ہیں۔ اور وہ قومیں ہماری جمہوریتیں ہیں۔

گذشتہ پانچ برس سے ہم نے فاشیوں کے ساتھ صلح جوئی کا مجرمانہ اصول ترک کر دیا ہے اور اپنی جنگی طاقت کو اتنے وسیع پیمانے پر پھیلایا ہے کہ نام نہاد نقطہ چین تو اسے ہماری تباہی کا موجب ٹھہرانے لگے تھے۔ لیکن وہ طاقت یا جنگ ہمیں تباہ نہ کر سکی۔ بلکہ اس نے ہمیں بتا دیا کہ ہماری طاقت کا راز کیا ہے۔ اور ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم سینکڑوں سال کی جد و جہد سے حاصل کی ہوئی آزادی کے تحفظ کے لئے اپنے آباؤ اجداد کی طرح عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

ہم نے یہ کارنامہ اس وقت انجام دیا جب کہ نازی ہمیں حقِ زندگی سے بھی محروم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ آج ہماری جمہوریت کو اس کے اندرونی

فاسد مادے سے خطرہ ہے۔ گمراہ لوگ بد اخلاقی کے اصل حقائق کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ "چھتری والے مکتبۂ سیاست یعنی امریلاسکن" (مختلف الخیال سیاست دانوں کا آپس میں کوئی سمجھوتہ کر کے کمیونسٹوں کے خلاف متحد ہو جانے کا نظریہ۔ امریکی یونینسٹ) کے سیاست دانوں کی طرح بدی کے ساتھ سمجھوتہ بازی کی پالیسی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمیں ہٹلر کے مینونک والے مکارانہ اعلان کی طرح یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بد اخلاقی کو "اور زیادہ علاقے کی طلب نہیں۔"

لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ فریب ہے۔ خاندان، ازدواجی زندگی، بچوں کی ایک صالح نظریۂ حیات کے مطابق پرورش، یہ ہیں ہمارے چند ایک مقدس مقبوضات جنہیں شیطانی طاقتیں نرغے میں لینا چاہتی ہیں اور انہیں برباد کرنا چاہتی ہیں۔

سچائی کو چھپانے، فضول وعظ و تلقین یا گناہ گاری پر ماتم کرنے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ ہمارے معاشرے کو جس قسم کے گناہ کا خطرہ ہے۔ وہ درحقیقت تپ محرقہ۔ ہذیانی سے زیادہ پائیدار نہیں۔ یہ بدخوراکی کے مسئلے سے زیادہ بعید الفہم نہیں۔ اور اب یہ بیروزگاری اور صحتِ عامہ کے مسئلے کی طرح انفرادی ذمہ داری نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیالات عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ میرے لئے ان کی اطلاع اور اس کتاب کے خاتمے کے لئے اس سے بہتر الفاظ تلاش کرنا ناممکن ہے جو کافی مدت پہلے سینٹ پال نے اہلِ فلپائن سے کہے تھے۔

"بھائیو! آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ باتیں خواہ کسی قسم کی ہوں، اگر

وہ سچی ہوں، ایماندارانہ ہوں، منصفانہ ہوں، بے لاگ ہوں، پیاری ہوں، دل فریب ہوں۔ اگر ان میں ذرا بھی اچھائی معلوم ہو اور اگر ان کی تھوڑی سی بھی تعریف ہو تو ان پر غور ضرور کیجئے۔"

# مُصنّف

"سن اینڈ سائنس" (گناہ اور سائنس) کے مصنف مسٹر ڈائی سن کارٹر ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا اور انگلستان میں بہت زیادہ مشہور ہیں، آپ کی تصانیف میں "سی آف ڈسٹنی" (تقدیر کا سمندر)، "نائٹ آف فلیم" (شعلے کی رات)، "ٹالنس لائف" (حیاتِ استالین)، "مین، مشینز اینڈ مائیکروبس" (انسان، مشینیں اور جراثیم) کے علاوہ "اِف یُو وانٹ ٹو انونیٹ" (اگر آپ کچھ ایجاد کرنا چاہتے ہیں)، جیسی مشہور و معروف کتاب بھی شامل ہے جسے "بک آف دی منتھ کلب" (ماہ حال کی بہترین کتاب) کا انتخاب کرنے والی انجمن نے موجدین کے لیے معیاری درسی کتاب قرار دیا ہے۔

سائنسی ترقیات کے موضوع پر مصنف کے مقالے مختلف قومی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور وہاں سے انگریزی دان دُنیا میں منتخب مضامین کے مخزنوں میں دوبارہ نقل کیے جاتے ہیں، آپ نے کناڈوی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن

سے نشر ہونے والے سلسلہ مضامین "سائنس ان دی نیوز" (سائنس کی خبریں) اور "شین ڈائری" (روسی روزنامچہ) بھی لکھتی ہیں۔ آپ لیکچرر کی حیثیت سے بھی بہت زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی سب سے زیادہ مقبول عام تصنیف "رشیاس سیکرٹ ویپن" (روس کا خفیہ ہتھیار) رہے جسے بے نظیر شہرت حاصل ہوئی، بڑے بڑے مدیروں نے اسے سراہا اور یہ کتاب مختلف روزناموں میں چھاپی گئی۔ اس کا سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

مصنفہ نے اپنی کسی ابتدائی تصنیف میں اشارہ کیا تھا کہ وہ بوقت فرصت گناہ کے مسئلے پر سائنسی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالیں گے۔ لہٰذا موجودہ کتاب قارئین کے پرزور اصرار اور تقاضے پر لکھی گئی۔